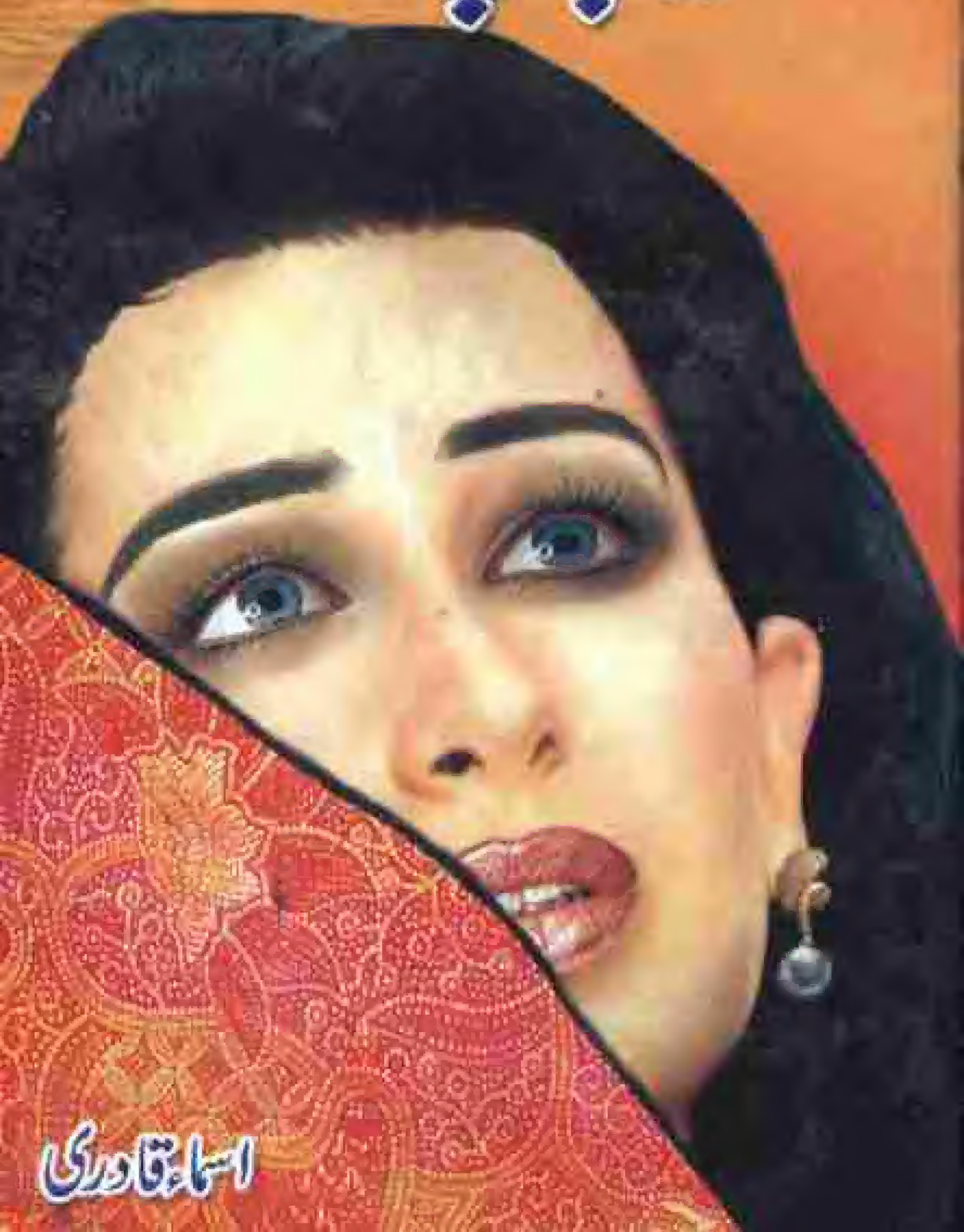
# منڈیر پر چاند



# ترتیب





# منڈیر پر چاند

''برخوردار کہیں آپ بانکے میاں کے بیٹے تو نہیں۔'' موٹے شیشوں والی عینک کے پیچھے سے اپنی طرف مسلسل آدھے گھنٹے سے نظر جمائے بیٹھے بزرگوار کی ''گھوریوں'' کا نتیجہ اس جملے کی صورت برآمد ہوتے دیکھ کر وہ بے ساختہ کراہ اٹھا۔

کسی خوش کن واقعے کے ظہور پذیر ہو جانے کی امید میں وہ خود پر ضبط کیے بڑی دیر سے آدھا درجن بزرگوں کی اس ''تفتیشی کمیٹی'' کے جوابات نہایت سعادت مندی اور معقولیت سے دے رہا تھا۔ لیکن اب لگتا تھا کہ اس کا یہ ''سولہواں بر دکھوا'' بھی سابقہ پندرہ کی طرح ناکامی سے دوچار ہوگا۔

پھنسی پھنسی آواز میں ''جی'' کہتے جیسے اس نے اپنے کسی سنگین ترین جرم کا اعتراف کیا تھا۔

دوسری طرف بزرگوار جن سے اس کا تعارف لڑکی کے ماموں کی حیثیت سے کروایا گیا تھا یوں شکل بنا کر بیٹھ گئے تھے جیسے کونین کی گولی چبالی ہو۔

ان کے چہرے کے بگڑے زاویوں کا جائزہ لیتے اس نے ایک نظر اپنی ''والدہ نمبرون'' پر ڈالی جو مجازی خدا کا نام سنتے ہی کھل اٹھی تھیں۔

''اچھا تو بھائی صاحب آپ جانتے ہیں رفیع کے مرحوم ابا جان کو۔'' خوشی کی ایک لہر سی ان کے لہجے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں !" ان کی شریعت پر عمل کرنے کی شہرت تو پورے رانی نگر میں پھیلی ہوئی تھی' میں بھلا کیسے محروم رہ سکتا تھا۔"

"اچھا تو آپ وہیں کے رہنے والے ہیں۔" ان کی باتوں سے نتیجہ اخذ کرتی والدہ ماجدہ ایسی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کر رہی تھیں جیسے برسوں بعد کوئی بچھڑی سہیلی اچانک ہی مل گئی ہو۔

"اللہ جنت نصیب کرے مرحوم کو بڑی ہی نیک طبیعت کے مالک تھے' اللہ رسول کے احکامات پر عمل کرتے زندگی میں کبھی نہ ہچکچاتے۔" بانکے میاں کے عقیدتمندوں میں ان کا نمبر سب سے اول تھا اور وہ اپنی اس عقیدتمندی کے اظہار کا موقع کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھیں۔

"صاحبزادے اتنے آئیڈیل والد کے بیٹے ہیں' مستقبل میں یقیناً والد حضور کے نقش قدم پر چلنے ہی کا سوچ بیٹھے ہونگے۔" اب کبھی اپنے نہ ہونے والے ماموں سسر کے طنزیہ انداز پر وہ بے ساختہ چلا اٹھا۔

"نہیں نہیں انکل ! میں تو شریعت سے کوسوں دور بھاگتا ہوں' میرا تو دور دور تک واسطہ نہیں ہے اس چیز سے۔ میں تو پچھلے کئی ہفتوں سے جمعے کی نماز تک ادا کرنے نہیں گیا' ابا جان کی برابری کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

لڑکی کے ماموں کے سوا باقی کے پانچ حضرات اسکی اس اچانک کا یا پلٹ پر ہونق رہ گئے سفید براق داڑھی اور ماتھے پر سجدے کا گہرا نشان رکھنے والے لڑکی کے تایا کے چہرے پر تو ناگواری کے آثار صاف پڑھے جا سکتے تھے۔ اتنی دیر سے سلیقے سے سوالوں کا جواب دیتے نوجوان کی منہ سے اتنی بیہودہ گفتگو سننے کی انہیں کوئی امید نہیں تھی۔

البتہ لڑکے اندر آئے اس تغیر کی وجہ جاننے کے لیے انہوں نے اپنا رخ انتظار حسین کی طرف موڑ لیا یہ ان ہی کی زبان کھلنے کا کرشمہ تھا کہ اچھا بھلا لڑکا بوکھلایا ہوا نظر آتا تھا۔



"کیا بتاؤں بھائی صاحب' شہرت ہے پورے رانی نگر میں ان کے گھرانے کی' خیر سے چار بیویاں بھگتا کر بانکے میاں دنیا سے کوچ کرے ہیں' پہلی بیوی تو شادی کے ابتدائی ایک ڈیڑھ سال میں ہی مرگئی تھی' باقی تین اب تک زندہ ہیں اور ایک ہی گھر میں رہتی ہیں۔" ان کے استفسار پر ایک خشمگیں نگاہ رفیع الزماں پر ڈالتے وہ رام کہانی سنا رہے تھے۔

"ایک نہ دو پوری تین تین ساسوں کے درمیان اپنی نازک سی بیٹی کو جھونک دوں، ایسا تو میں مرکر بھی نہیں کرسکتی۔" اتنی دیر سے خیر سگالی کا اظہار اور بہناپا جوڑنے کی کوشش کرتی لڑکی کی والدہ ہاجرہ بیگم کے پاس سے یوں بدک کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں جیسے ان بے چاری نے انہیں ڈنگ مار دیا ہو۔

"ہاں تو ہم کون سا مرے جا رہے ہیں تمہاری چھپکلی سی بیٹی کے پیچھے' سنبھال کر رکھو اپنے پاس' گھر کے لال بیگ' کیڑے مکوڑے صاف کرنے کے کام آئے گی' غضب خدا کا لوگوں میں ذرا جو ایمان باقی رہا ہو' بیٹھ جاتے ہیں کیڑے نکالنے بھلا بتاؤ شرع میں کیسی شرم۔" بکتی جھکتی والدہ کو بڑی مشکل سے گھسیٹ گھساٹ کر وہ باہر لانے میں کامیاب ہوا تھا ورنہ وہاں موجود چھ عدد بزرگوں کے ہاتھ جس طرح اپنی اپنی چھڑیوں پر سختی سے جمے تھے' اسے دیکھتے ہوئے مزید کچھ دیر وہاں رکنا اور والدہ محترمہ کو ان کی وضاحت وبلاغت کے پھول جھڑانے کی اجازت دینا' اسکی اپنی خیریت کو مشکوک بنا سکتا تھا۔

☆☆☆

"لو بھلا بتاؤ وہ موا انتظار حسین کیسے پہنچ گیا' وہاں رنگ میں بھنگ ڈالنے کو۔" ناک پر انگلی جمائے بوا صدمے کے عالم میں تھیں۔ بڑی مشکل سے دو دوڑ دھوپ کر کے انہوں نے رفیع الزماں کے لیے یہ رشتہ ڈھونڈا تھا۔ اس بار وہ پوری طرح پر امید تھیں کہ حسب وعدہ بڑی بیگم سے انگوٹھی' منجھلی سے گلے کا لاکٹ اور چھوٹی سے ٹاپس وصول کر نے میں کامیاب ہو جائیں گی۔ لیکن وائے قسمت اچانک ہی سات' آٹھ گلیاں آگے

رہنے والے لڑکی کے ماموں انتظار حسین' عین وقت پر رنگ میں بھنگ ڈالنے وہاں پہنچ گئے اور نہ صرف پہنچے بلکہ رفیع الزماں کو بانکے میاں کے بیٹے کے حیثیت سے شناخت بھی کرلیا اور یہی شناخت تو رفیع الزماں کی شادی کی راہ میں سب سے بڑا روڑا تھی بانکے میاں کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے لوگوں کو فوراً ہی رفیع الزماں کی ایک عدد مرحومہ اور تین عدد جیتی جاگتی والدائیں یاد آجاتی تھیں۔ مرحومہ کی تو خیر تھی لیکن یہ جو تین عدد زندہ تھیں، ان کے ہاتھوں آئے روز ایسے ایسے کار ہائے نمایاں انجام پاتے تھے کہ دور دور تک علاقے میں بانکے میاں کے نام کے ڈنکے بج رہے تھے اور بے چارے مرحوم ومغفور ہونے کے باوجود آج تک لوگوں کی یاد داشتوں میں زندہ جاوید تھے۔ خصوصاً جوان لڑکیوں کی امائیں تو بدکتی تھیں اس گھرانے کے تذکرے سے، رفیع الزماں کو رشتہ دینا تو دور کی بات وہاں تو تعارف ہوتے ہی لوگ کانوں کو ہاتھ لگا کر انکار کردیا کرتے تھے۔ ظاہر سی بات ہے لوگ اپنی بیٹیوں کو صرف "ساس" سے نمٹنے کی ٹریننگ دیتے تھے "ساسوں کی فوج" سے تو نہیں۔

"مٹی ڈالو بوا ان لوگوں پر' مجھے تو پہلے ہی ایک آنکھ نہ بھا رہے تھے وہ لوگ' تمہارے ہی اصرار پر راضی ہوگئی تھی۔" کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق ہاجرہ بیگم ان لوگوں میں ہی کیڑے نکال رہی تھی۔

"کتنی جان جوکھم میں ڈال کر میں نے یہ رشتہ ڈھونڈا تھا رفیع الزماں کے لیے پچاسیوں تو جھوٹ گھڑے تھے تمہارے گھرانے کی تعریف میں اور تم کتنے مزے سے کہہ رہی ہو مٹی ڈالو۔" بوا کا دکھ کسی طور دور نہیں ہو رہا تھا۔

"اے بوا غم کیوں کر رہی ہو، عمر تو نہیں نکل گئی رفیع الزماں کی تم ڈھونڈنے نکلو بہتیرے رشتے مل جائینگے۔" یہ منجھلی بیگم زبیدہ تھیں جو نئے سرے سے بوا کی ہمت بندھا رہی تھیں۔

"ہاں ہاں، بوا، ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں چھوٹی آپا، آخر کمی کیا ہے ہمارے رفیع میں، ایک ڈھونڈو، دس لڑکیاں مل جائینگی" چھوٹی بیگم عابدہ نے بھی زبیدہ کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"میں نے کب کہا بی بی، کہ رفیع میاں میں کوئی کمی ہے، ان کے پاس تو زیادتی ہے وہ بھی تین تین اماؤں کی۔" بوا نے بھی آخر جل کر طعنہ دے مارا۔

☆☆☆

بانکے میاں اچھے خاصے شریف النفس انسان تھے پر قدرت نے ہی ان کے نصیب میں ہلچل اور گہما گہمی لکھ دی تھی تو وہ کیا کر سکتے تھے۔ سب نارمل لوگوں کی طرح ان کی اماں نے انکی شادی عالیہ سے بڑے دھوم دھام سے کی تھی پر عالیہ عمر بہت مختصر لکھوا کرلائی تھیں پہلے بیٹے رفیع الزماں کی پیدائش کے وقت ملک عدم سدھار گئیں بانکے میاں جن کا اصل نام بدرالزمان تھا بچے کو انکی دادی کے حوالے کرتے بیوی کی موت کا غم سینے میں چھپائے غم روزگار میں الجھ گئے۔ وہ بڑے ہنرمند انسان تھے۔ لوگوں کے ایئر کنڈیشنر، ٹی وی، فریج، وی سی آر ٹھیک کرنے ہوں، یا گھروں میں الیکٹرک کے تاروں کی وائرنگ اور نلکوں کی فٹنگ وہ ہر کام یکساں مہارت سے انجام دینے کی صلاحیت رکھتے تھے یہی سبب تھا کہ مین بازار میں ان کی ایک اچھی خاصی بڑی الیکٹرک کی دکان تھی جو خوب چلتی تھی یوں گھر میں روپے پیسے کی فراوانی تھی۔

ان کی زندگی میں انقلابات کی ابتداء تب ہوئی جب وہ ایک بنگلے میں A-C کی تنصیب کے لیے پہنچے، ڈیفنس میں واقع اس بنگلے کی بیل بجانے پر اندر سے کوئی ذی نفس تو برآمد نہ ہوا البتہ کسی لڑکی کی گھٹی گھٹی چیخیں اور مدد کے لیے پکارنے کی آواز ضرور ان کے کانوں تک پہنچ گئیں، انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ گیٹ پھاند اندر جا کودے ایک کمرے میں کسی لڑکے کی دست درازی سے محفوظ رہنے کی کوشش کرتی پچھلی گلی میں رہنے والی خالہ بتول کی بیٹی ہاجرہ کو دیکھ کر ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں اُدھر وہ لڑکا بھی اس اچانک افتاد پر بوکھلا گیا تھا۔ جبھی ان کے ہاجرہ کو اس کی چادر اڑھانے سے لے کر وہاں سے لیکر نکلنے تک کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔

بڑی عام سی کہانی تھی ہاجرا اور اس لڑکے کی۔ سلائی کٹنگ سیکھنے ایک سینٹر جانے

والی ہاجرا کی خوبصورتی اس لڑکے کو اور لڑکے کی لمبی گاڑی ہاجرا کو بھا گئی یوں راہ چلتے ایک شخص کی باتوں اور جھوٹی محبت پر اعتبار کر کے وہ اس کے ساتھ تنہا اسکے بنگلے جا پہنچی جہاں اس نے چہرے پر چڑھائے نقاب کو اتارنے میں ذرا دیر نہ لگائی اس حادثے کے بعد ہاجرا جو پہلے ناک پر مکھی بیٹھنے دینے کی روادار نہیں تھی بدر الزماں کے عشق میں گوڈے گوڈے ڈوب گئی اسکی اماں کی خدمت اور بیٹے کو خود سے ہلانے کے نسخے ایسے تیر بہ ہدف تھے کہ ایک دن اماں کے اصرار پر بدرالزماں اس سے دوسری شادی کرنے کے لیے اماں کے آگے ہاں کر بیٹھے طبعاً شریف آدمی تھے۔لہٰذا کبھی پلٹ کر ماضی کا طعنہ نہ دیا یوں ہاجرا کی ان سے عقیدت مندی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

تیسری شادی اپنی نوعیت کے اعتبار سے کافی حادثاتی تھی۔وہ اماں کو ان کی بہن سے ملانے گلبرگہ (بھارت کا ایک شہر) گئے تھے۔خالہ کے گھر ان کی بیٹی زبیدہ کی شادی کا سلسلہ چل رہا تھا عین بارات والے دن لڑکے والوں نے بھاری جہیز کی لسٹ خالہ کے ہاتھ میں تھما دی، غریب خالہ اور انکے شوہر کے لیے ان کی فرمائشوں کو اپنی جان دے کر بھی پورا کرنا ممکن نہ تھا سو بارات واپس لوٹ گئی اماں سے معصوم زبیدہ کے لٹے ارمان اور بہن بہنوئی کی ابتر حالت نہ دیکھی گئی اور بدرالزماں کو بہن کی خدمت میں پیش کر دیا ان کے شادی شدہ ہونے سے واقف ہونے باوجود وہ لوگ اپنی عزت کی سلامتی کے لیے راضی ہو گئے بدرالزماں کو بھی حالات کی نزاکت کے پیش نظر ہتھیار ڈالنے پڑے یوں ایمرجنسی پاسپورٹ اور ویزہ بنا کر زبیدہ کو پاکستان ساتھ لایا گیا ہاجرا جو ان دنوں امید سے ہونے کی وجہ سے ساس اور میاں کے ساتھ نہیں گئیں تھیں سوکن کو دیکھ کر بہت بوکھلائیں لیکن جب حالات جانے تو بدرالزماں کی عظمت پر سو سلام بھیجتی سوکن کو قبول کر لیا۔

آخری اور چھوٹی بیگم عابدہ بدرالزماں کے اکلوتے چچا خلیق الزماں مرحوم کی بیٹی تھیں جنہیں ان کے سسرال والوں نے بانجھ ہونے کے جرم میں طلاق دلوا کر گھر سے نکال دیا تھا کوئی دوسرا عزیز رشتے دار نہ ہونے کی وجہ سے اسے اپنی تائی کے پاس آنا



پڑا۔تائی ابتدا میں تو ان کے لیے ادھر اُدھر رشتے تلاش کرتی رہیں کہ جوان عورت کو تنہا چھوڑنے کی قائل نہیں تھیں، لیکن جب رنگ برنگ بڈھے کھوسٹ، شرابی، جواری لوگوں سے واسطہ پڑا تو کانوں کو ہاتھ لگا لیا آخری حل کے طور پر بدرالزماں ہی ہاتھ لگے سو ایک بار پھر انہیں سہرا باندھ دیا گیا۔

پے در پے ان شادیوں نے بدرالزماں کو اور کچھ دیا ہو یا نہ دیا ہو، "بانکے میاں" کا ٹائٹل ضرور دیا محلے کے لڑکے انکے گلی میں داخل ہوتے ہی "بانکے سجن گھر آئے" جیسے گیت گا کر ان کا سواگت کرتے۔وہ بے چارے ان منچلوں کے منہ لگنا بیکار جان کر سر جھکائے خاموشی سے گزر جاتے۔

گزرتے وقت نے ہاجرا کو دو اور زبیدہ کو ایک بیٹی عطا کی۔یوں رفیع الزماں اکلوتے تھے اور اکلوتے ہی رہے ویسے انکی تینوں والدائیں اپنی نوعیت کے اعتبار سے دنیا کی انوکھی ترین سوتیلی مائیں تھیں، جنہوں نے کبھی اسے پھولوں کی چھڑی تک سے نہ مارا ہر ایک دوسری سے بڑھ کر پیار لٹانے اور لاڈ اٹھانے والی تھی ذرا جو وہ کوئی فرمائش کرتا تینوں پوری کرنے کے لیے دوڑ لگاتیں دادی اس کا سبب اپنی سخت نگرانی کو سمجھتیں لیکن ان کے انتقال کے بعد وقت نے ثابت کیا کہ اس ساری جاں نثاری میں کہیں کوئی ڈرامہ بازی نہیں تھیں والداؤں کی طرح بہنیں بھی اپنے اکلوتے بھیا کی عاشق تھیں، ہر وقت اس کے اردگرد پروانوں طرح منڈلاتیں۔پر ان منڈلاتی تتلیوں کو بہت کم کم عمر میں ہی دیس نکالا دے دیا گیا بانکے میاں شاید ہاجرا والے حادثے کو بھولے نہیں تھے سو جلد بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہو کر مطمئن ہو گئے۔بیٹا تو تھا ہی ان کا بہت اچھی طبیعت اور سمجھ بوجھ کا مالک، صبح ایک ٹیکنیکل کالج سے الیکٹرونکس کا ڈپلومہ کر رہا تھا، شام کو اپنا وقت دوکان پر باپ کے زیر تربیت گزارتا تعلیم اور ورثے میں ملنے والی باپ کی ہنر مندی نے اسے دو آتشہ بنا دیا تھا اس کے ہی دیئے ہوئے نت نئے آئیڈیاز پر کام کرتے بانکے میاں کا کاروبار پہلے سے بھی کئی گنا اچھا چل رہا تھا۔ہر طرف سے مطمئن بانکے میاں نے جلد ہی کاروبار حیات سمیٹ لیا اور راہی ملک عدم ہو گئے۔

ان کی تینوں بیگمات، جوان کی زندگی میں اپنا زیادہ تر وقت ایک دوسرے سے لڑنے میں گزارتی تھیں ان کی موت پر ایک دوسرے کی ہمدرد وغم گسار ثابت ہوئیں۔ ویسے بھی وہ تینوں خواتین نہایت حیرت انگیز تھیں دن بھر ایک دوسرے سے چونچیں لڑاتی رہتیں لیکن جو ذرا کوئی دوسرا ان میں سے کسی ایک کو چھیڑنے کی گستاخی کر بیٹھتا، متحد ہو کر چیل کی مانند اس پر جھپٹتیں۔ چھیڑنے والا بامشکل اپنی ہڈی بوٹی بچا کر بھاگتا۔

بانکے میاں کے انتقال کے بعد گھر کی ویرانی اور خاموشی کو دیکھتے ہوئے انہوں نے بیٹیوں کے مشورے پر رفیع الزماں کی شادی کا ارادہ باندھا تھا لیکن جو کام ان کے خیال میں نہایت آسان تھا اصل میں جوئے شیر لانے کے برابر ثابت ہوا۔ کوئی بھی شخص بانکے میاں کی چار شادیوں کے ریکارڈ اور تین تین آفت کی پرکالہ ساسوں کی موجودگی میں اپنی بیٹی رفیع الزماں کو دینے کے لیے راضی نہیں تھا۔

☆☆☆

"کیا ہوا اماں اس رشتے کا جو پچھلے ہفتے بوا نے لگایا تھا" یہ ہاجرہ کی بڑی بیٹی ثمن آرا تھی جو اپنے چھوٹے بیٹے کو تھپک تھپک کر سلاتی صحن میں کھیلتے اپنے بڑے بیٹے پر نظر جمائے بیٹھی تھی۔

"ہونا کیا ہے لڑکی کا ماما یہیں رانی نگر کا رہنے والا نکلا عین وقت پر رفیع کو پہچان گیا، پھر تو سمجھو آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں ان لوگوں نے۔"

"یہ تو بڑا بُرا ہوا اماں' بھیا کو تو بہت دکھ پہنچا ہوگا۔" ثمن تاسف سے بولی۔

"ارے مجھے خود بڑا دکھ ہے' اچھی خاصی بات چل نکلی تھی' پوری امید تھی کہ اس بار ہاں ہو جائے گی' میں نے تو بوا کو دینے کے لیے اپنی چاندی کی انگوٹھی پر سونے کا پانی بھی چڑھوا لیا تھا۔" ہاجرا بیگم کے لہجے میں حقیقی رنگ تھا۔

"چاندی کی انگوٹھی پر سونے کا پانی! لیکن اماں آپ نے تو بوا سے سونے کی انگوٹھی کا وعدہ کیا تھا۔" ثمن حیران تھی۔

"ارے وعدہ کیا تھا تو کیا سچ مچ اس لالچی بڑھیا کو سونے کی انگوٹھی تھما دوں گی





میری کوئی سونے کی کانیں ہیں جو لوگوں میں سونا بانٹتی پھروں۔ ویسے بھی اس بوا کو کیا پہچان سونے کی جب تک پالش اترتی ہمارا کام پکا ہو جاتا، ویسے کہیں تم یہ خیال اپنی منجھلی اور چھوٹی امی کے کانوں میں نہ انڈیل دینا، بڑی چلتر ہیں فوراً میری نقل اتارنے بیٹھ جائیں گی" اپنی پالیسی کا تذکرہ کرتے آخر میں اسے تنبیہہ کرنا ضروری تھی۔

"ہائے اگر بیچ میں یہ روڑا نہ آتا تو ہم بیٹھے بھیا کی شادی کی تیاری کی باتیں کر رہے ہوتے۔" ثمن کو واقعی بہت دکھ تھا پچھلے دو سال سے ان لوگوں کو اس سلسلے میں مسلسل ناکامی کا سامنا تھا وہ تینوں بہنیں بھائی کی شادی کا ارمان دل میں بسائے ہر بار نئے سرے سے امید باندھتیں لیکن ہر بار ہی مایوس ہونا پڑتا۔ اب تو رفیع بھی اس ذکر سے چڑنے لگا تھا پر اس بار بوا کے بہت امید دلانے اور والداؤں کے حفظ ماتقدم کے تحت کی جانے والی تدبیروں کے پیش نظر لڑکی والوں کے ہاں جانے کی حامی بھر لی تھی بوا کی رائے پر ان لوگوں سے بانکے میاں کی چار شادیوں کو چھپایا گیا تھا اور صرف ہاجرا کی ملاقات رفیع کی والدہ کی حیثیت سے ان لوگوں سے کروائی گئی تھی اس بات پر بھی تینوں سوکنوں میں گھنٹوں تو تو میں میں ہوئی تھی کہ کون والدہ کا رول ادا کرنے لڑکی والوں کے ہاں جائے گی ہر ایک کے خیال میں اس کا حق رفیع پر سب سے زیادہ تھا لیکن آخر کار سینئر ہونے کے ناطے فتح ہاجرا کو نصیب ہوئی، لیکن اتنی کوششوں کے بعد بھی نتیجہ وہی "ڈھاک کے تین پات" رہا تھا۔

"رفیع کا دل تو بہت برا ہوا ہے، کہہ رہا تھا لڑکے باہر مذاق اڑاتے ہیں کہ تیرے ابا نے تو چار چار شادیاں کیں اور تو ابھی تک ایک بھی کرنے میں کامیاب نہیں ہوا۔"

"ہاں تو ہوگا ہی، آخر بے چارے کب تک ......" دھڑام سے کسی چیز کے گرنے کی آواز نے اسے اپنا جملہ مکمل نہیں کرنے دیا تھا۔ وہ جو گھنٹے بھر سے اپنے آفت کے پرکالہ بیٹے پر نظریں جمائے بیٹھی تھی، بھائی کی محبت میں جوش وخروش سے گفتگو کرتی ذرا دیر کو چوک گئی۔

"توڑ ڈالا کم بخت میرا گھڑا، نانی کی طرح نواسے کو بھی میری چیزیں آنکھ میں کنکر کی طرح کھٹکتی ہیں، پتہ ہے میں فریج کا پانی نہیں پیتی گلا خراب ہوجاتا ہے لیکن دشمن ایسی ہے کہ برداشت نہیں ہوتا تم لوگوں سے میرا وجود بھیجا ہوگا نانی نے کہ جا کر منجھلی نانی کا گھڑا پھوڑ آؤ۔" زبیدہ خاتون ٹوٹے گھڑے کے پاس ہی پانی میں شرابور پڑے ثمن آراء کے بیٹے کے سر پر کھڑی چلا رہی تھیں۔

"اے میں کہتی ہوں، تمہیں اپنا یہ دو ٹکے کا گھڑا بچے سے بڑھ کر پیارا ہے ایسی ہی فکر تھی تو اپنے کمرے میں رکھتیں، بیچ صحن میں رکھنے کی کیا مار پڑی تھی" ہاجرا بیگم بھی خم ٹھونک کر میدان میں اتر آئی تھیں۔

ثمن آراء بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے گئی، ایسے ہی کسی حادثے سے بچنے کے لیے وہ اس پر کڑی نظر رکھتی تھی اب جو دونوں والداؤں کے درمیان مہابھارت شروع ہو چکی تھی اسے گھنٹے دو گھنٹے سے پہلے ختم نہیں ہونا تھا۔

"ادھر پڑوس کی دیوار سے سر نکال کر طاہرہ نے اس معرکہ سے لطف اندوز ہونا شروع کر دیا تھا۔ وقتاً فوقتاً دونوں فریقین کو جوش بھی دلا رہی تھی۔

"نہ نہ ہاجرا خالہ، یہ جملہ زیادہ مضبوط نہیں تھا ذرا کوئی زوردار طعنہ ماریں۔"

"ارے زبیدہ خالہ، آپ کا اتنا قیمتی گھڑا ٹوٹ گیا اور آپ صرف زبانی کلامی دھمکیاں دے رہی ہیں کچھ عملی مظاہرہ کریں۔"

"اے شیطان کی پوتی تم کیوں بات کو بڑھاوا دے رہی ہو؟" تخت پر آرام سے بیٹھی مٹر چھیلتی عابدہ نے اسے گھر کا۔

"ارے نہیں خالہ آپ کو کچھ غلط فہمی ہوئی ہے میں شیطان کی نہیں عبدالرؤف صاحب کی پوتی ہوں، کل گھر تشریف لائیے گا آپ کو اپنا شجرہ دکھاؤں گی۔" شرارتی انداز میں بولتی وہ جھٹ وہاں سے ہٹ گئی تھی ورنہ خدشہ تھا کہ باقی دو خواتین کی توپوں کا رخ بھی اس کی طرف ہو جائے گا۔

☆☆☆



اوڑھنی، اوڑھ کے ناچوں

اوڑھنی ..........

اوڑھنی اوڑھ کے ناچوں

"اب ناچ بھی چکو' کب تک تمہارے انتظار میں، یہاں کھڑی رہوں۔"

تخت پر لیٹے لہک لہک کر گاتے رفیع الزماں کے سروں کو بریک طاہرہ کی آواز نے لگایا تھا۔ وہ ہاتھ میں اسٹیل کی کٹوری پکڑے، لان کے ریڈ اور گرین پرنٹڈ سوٹ پر پیلا دوپٹہ اوڑھے رفیع الزماں کے اعلیٰ ذوق پر سخت گراں گزر رہی تھی۔

"کیا بکواس کر رہی تھیں تم۔" آنکھوں کو غصے سے کچھ باہر نکال کر اُسے رعب میں لینے کی کوشش کی۔

"میں کیوں بکواس کرنے لگی ابھی آپ ہی فرما رہے تھے اوڑھنی اوڑھ کر ناچنے کا میں نے سوچا چلو میں بھی مفت کا تماشہ دیکھ لوں۔ لیکن گھنٹہ بھر ہو گیا انتظار میں آپ اپنے کہے پر عمل کرنے کا نام ہی نہیں لے رہے اب میں کوئی فالتو تو ہوں نہیں جو یہاں کھڑی ہی رہوں، ویسے کہیں آپ اوڑھنی کی عدم دستیابی کی وجہ سے تو اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے سے گریز نہیں کر رہے۔" آخری جملہ ذرا ہمدردانہ انداز میں ادا کیا گیا تھا۔

اچھا اب زیادہ مجھ سے فری ہونے کی کوشش کرنے کی ضرورت نہیں ہے" سخت نروٹھے پن کا مظاہرہ کیا گیا۔

ارے طاہرہ بیٹی، کب آئیں اور یہ ہاتھ میں کیا ہے؟" اپنے کمرے سے نکلتی عابدہ بی بی نے جھٹ کٹوری اپنے قبضے میں لی بڑی دو اس وقت خریداری کے لیے بازار گئی ہوئی تھیں۔

"سرسوں کا ساگ ہے خالہ، اماں نے خاص آپ کے لیے بھیجا ہے" ہاجرہ اور زبیدہ کی غیر موجودگی کو محسوس کرتے اس نے انہیں بانس پر چڑھایا۔

"تمہاری ماں بڑی بھلی عورت ہے، میرا تو شروع ہی سے بڑا خیال رکھتی ہے۔" عابدہ بی اپنی اس اہمیت پر کھل اٹھیں۔

"خالہ ذرا تین چار ٹماٹر دے دیتا رات کے لیے ہانڈی بنانی ہے۔" ان کے موڈ سے فائدہ اٹھاتے اس نے اپنی آمد کا اصل مقصد بیان کیا عابدہ بی کو اس کا مطالبہ پسند تو نہ آیا لیکن ابھی ہاتھ میں پکڑی سرسوں کے ساگ کی کٹوری کی مروت باقی تھی ناچار ٹماٹر لینے کچن کی طرف بڑھ گئیں۔

"یہ تم اپنے گھاس پھوس کے بدلے ہمارے گھر سے اتنے مہنگے ٹماٹر سمیٹنے آگئی ہو، کچھ پتہ بھی ہے اسی روپے کلو مل رہے ہیں ٹماٹر۔" پتے دار سبزیوں سے سخت الرجک رفیع الزماں نے اس کو شرمندہ کرنا چاہا۔

"پہلی بات تو یہ کہ ٹماٹر بہت عرصہ ہوا بارش کے زمانے میں صرف ایک دن کے لیے اسی روپے کلو ہوئے تھے اب عام دس پندرہ روپے کلو مل رہے ہیں، دوسری بات یہ کہ آپ کو اپنی دولت کے لٹنے کا غم منانے کی زیادہ ضرورت نہیں شام تک آپ کی تینوں والدائیں باری باری ہمارے گھر سے کچھ نہ کچھ منگوا کر نہ صرف ان ٹماٹروں کا حساب بے باق کر دیں گی، بلکہ خاصا پرافٹ بھی حاصل کر لیں گی۔" دو بدو اسے جواب سے نوازتی وہ کچن کی طرف بڑھ گئی تھی جہاں عابدہ ٹوکری میں سے چھوٹے سے چھوٹے ٹماٹر منتخب کرنے کے مرحلے سے گزر رہی تھیں۔

☆☆☆

اپنے مشہور زمانہ ٹیکنی کلر لباس سے بھی بڑھ کر، پیلی شلوار، نیلی قمیض اور لال دوپٹے میں ملبوس، عجیب چڑیلوں جیسا ہیئر اسٹائل بنائے جب وہ ڈرائنگ میں داخل ہوئی اور الگ الگ ڈیزائن کے کپوں میں بھری سیاہی مائل چائے کی ٹرے لا کر زور سے میز پر رکھی تو مہمان خواتین کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اصل میں دہشت اور صدمے کے مارے انکے ہی کیا، گھنٹہ بھر سے اس کے حسن اور سلیقہ مندی کی شان میں رطب اللسان امی کے منہ سے بھی کوئی بات نہیں نکل پا رہی تھی چیخنے کی جرأت کرنا تو دور کی بات تھی۔

"یہ ہے آپ کی وہ ہمہ صفت بیٹی۔" ایک نظر چائے کی شکل اور دوسری اسکی صورت پر ڈالتی تین میں سے ایک محترمہ نے بالآخر ہمت کر کے پوچھ ہی لیا تھا۔



"ج ج۔ جی۔" اعتراف کرتی امی کو خود بھی شاید اپنی بات پر یقین نہیں تھا۔

"کیا مصروفیات ہیں بیٹی تمہاری۔" معمر خاتون شاید زیادہ ہی جی دار تھیں ورنہ ان کے ساتھ آئی لڑکیوں کے چہرے تو گیس نکلے غباروں جیسے ہو گئے تھے۔

"مصروفیت تو بہت زیادہ ہے آنٹی صبح منکو کے ساتھ کرکٹ کھیلتی ہوں، جب وہ اسکول چلا جاتا ہے تو منو گھر آجاتا ہے دوپہر بھر اس سے سائیکل چلانے اور کنچے کھیلنا سیکھتی ہوں۔ شام میں پھر ہمارا پتنگ بازی کا مقابلہ ہوتا ہے، اگر کبھی بیچ میں فراغت مل جائے تو کیرم اور لڈو کی باری بھی آجاتی ہے۔ سچ بعض دفعہ تو کھانا کھانے کے لیے بھی ٹائم نکالنا مشکل ہو جاتا ہے۔" امی کی قہر بار نظروں سے لاپرواہ بنی وہ گل افشانیوں میں مصروف تھی۔

"بالکل درست کہا تم نے بیٹی، اتنی زیادہ مصروفیت میں بھلا بندے کو کہاں کسی بات کا ہوش رہتا ہے، شادی وادی کرنے کی تو پھر بالکل ہی فرصت نہیں ہو گی تمہارے پاس۔"

"جی جی آنٹی جی" بہت زبردست اندازہ لگایا ہے آپ نے، میں تو مان گئی آپ کی ذہانت کو۔" خاتون کے ٹھنڈے ٹھارا انداز میں کئے گئے طنز کو شربت کی طرح اپنے حلق سے اتارا تھا۔

"بہن برا مت مانیئے گا لیکن جب آپ کی بچی کی مرضی نہیں ہے، تو آپ کیوں اسکی شادی کے پیچھے پڑی ہیں۔ ناحق دوسروں کا بھی وقت برباد ہوتا ہوگا۔" خاتون اتنی بھی احمق نہیں تھیں کہ اسکے ان ڈراموں کو اس کا الہڑ پن سمجھتیں۔

دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھی امی کے اندر اتنا حوصلہ بھی نہ تھا کہ اٹھ کر جاتی خواتین سے معذرت کے چند الفاظ ادا کرتیں یا اپنی ناہنجار بیٹی کے لتے ہی لے سکتیں۔

☆☆☆

"رفیع بیٹا ذرا انگریزی میں اس کمبخت کی مدد کر دیا کرو، پچھلے سال بھی رہ گئی

تھی، اب کی بار فیل ہوئی تو اس کے ابو ہرگز فیس جمع نہیں کروائیں گے اگلی بار کے لیے۔" یاسمین بانو (طاہرہ کی امی) نے بڑی لجاجت سے درخواست کی۔

"جی! خالہ! بھیج دیا کریں شام میں میرے دوکان سے آنے کے بعد، پڑھا دوں گا۔"

رفیع الزماں نے جس کی اپنی انگریزی بھی کچھ زیادہ اعلیٰ معیار کی نہیں تھی اپنی سعادت مندی کے ہاتھوں مجبور ہو کر طوعاً وکرہاً حامی بھری ویسے اس طاہرہ کی نالائقی کی وجہ سے کافی تسلی تھی کہ وہ کبھی اس کی غلطیوں کو پکڑ نہ پائے گی۔

"بس بیٹا تمہارا احسان ہوگا، کسی طرح یہ کمبخت انٹر ہی کر لے تو شاید کچھ عقل آجائے ورنہ اس نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے" کل گزرے حادثے کا غم ان کے دل میں بالکل تازہ تھا۔

"کیوں بھئی یاسمین اب کیا کر دیا، اس نے جو تم بیزار بیٹھی ہو۔" قریبی تخت پر بیٹھی پالک چنتی ہاجرہ بیگم نے سوال کیا۔

"ہونا کیا ہے آپا، وہی اس کے پرانے ڈھنگ ہیں، کل بھی کچھ لوگ آئے تھے اسے دیکھنے بھگا دیا اپنی اوٹنگی بونگی حرکتوں سے۔"

"پر یہ ایسا کرتی کیوں ہے؟" ہاجرہ بیگم کے لہجے میں حیرت تھی۔

"یہ تو یہ خود ہی جانتی ہوگی، مجھے تو بس اتنا پتہ ہے کہ دماغ میں کیڑے بھرے ہیں جو وقت بے وقت کلبلاتے رہتے ہیں۔" انہیں جواب سے نوازتی وہ گھر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ہاجرہ بیگم نے بھی سبزی کا تھال اٹھا کر باورچی خانے کا رخ کیا۔

"کیوں تنگ کرتی ہو اپنی امی کو" قدرے معقول کنٹراسٹ کے سوٹ میں اپنے ناخنوں کو چپ چاپ بیٹھی گھورتی طاہرہ پر اپنا استادانہ حق استعمال کرتے ہوئے رفیع الزماں نے سوال کیا۔

"ابھی تو بتایا ہے امی نے، دماغ میں کیڑے کلبلاتے ہیں، سنا نہیں تھا۔" پھاڑ کھانے والے انداز میں جواب دیتی وہ اس کے تازہ تازہ رتبے کو خاطر میں لانے کے



لیے ہرگز تیار نہیں تھی۔

"بہت بری بات ہے طاہرہ تمہیں ایسی حرکتیں نہیں کرنی چاہیں، لوگ کتنا برا امپریشن لے کر جاتے ہوں گے تمہارے گھر سے تمہیں اچھا لگتا ہے کیا اس طرح اپنے ماں باپ کی عزت خراب کروا کے، بڑی بیٹی ہو تم تمہیں تو ان کے مسائل کو سمجھنا چاہیے۔"

وہ اس سے خراب ترین تعلقات کے باوجود اسے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ جبکہ وہ بے نیازی سے بیٹھی۔

تیرے نام ہم نے کیا ہے
جیون اپنا سارا صنم
پیار بہت کرتے ہیں، تجھ سے
عشق ہے تو ہمارا صنم
گنگناتی رہی۔

☆☆☆

"میں پوچھتی ہوں تم نے بڑی آپا کے ساتھ گستاخی کرنے کی جرات کیسے کی؟"

دن بھر گھر میں بات بات پر ایک دوسرے سے کٹ کٹ کرنے والی زبیدہ اور عابدہ اس وقت سامنے والی ریحانہ کے خلاف ہاجرہ بیگم کی اتحادی بنی کھڑی تھیں ریحانہ کا جرم تھا بھی بڑا سنگین اس نے آم کے چھلکوں سے بھرا شاپر، اوپر کے کمرے کی کھڑکی سے بغیر دیکھے گلی میں پھینک دیا تھا جو سیدھا کسی کام سے گھر سے نکلتی ہاجرہ بیگم کے سر پر گرا نتیجتاً اب گھمسان کی جنگ چھڑی تھی۔

"تو تمہاری بڑی آپا کو کیا ضرورت تھی دوپہر میں میری کھڑکی کے نیچے منڈلانے کی۔" ادھر سے بھی دوبدو جواب حاضر تھا۔

"اسے کہتے ہیں چوری اور سینہ زوری جاہل لوگوں کو توفیق نہیں ہوتی کہ کچرا ڈسٹ بن میں ڈالیں، اٹھا کر اندھوں کی طرح گلی میں پھینک دیتے ہیں۔" انہیں جاہل کا ٹائٹل دیتی عابدہ بی، صبح اپنا گلی میں پھینکا گیا سبزی کے چھلکوں کا تھیلا سرے سے فراموش

کر چکی تھیں۔

"ہاں ہاں، تم سوکنیں تو ساری علی گڑھ یونیورسٹی سے ڈگریاں لیکر آئی ہو جبھی سب لوگ جاہل نظر آتے ہیں۔" اپنے ایج گروپ کے لوگوں میں واحد میٹرک پاس ریحانہ جاہل ہونے کا طعنہ قطعی برداشت نہیں کر سکیں۔

"ارے جاؤ، ڈگریوں سے کیا ہوتا ہے اصل چیز انسان کی خاندانی شرافت اور تربیت ہوتی ہے جس سے تم نیچ ذات کے لوگ قطعی محروم ہوتے ہو" ہاجرہ بیگم بالکل ہی ذاتیات پر اتر آئی تھیں۔

"ہاں میں نیچ ذات کی ہوں اور تمہارا شجرہ تو جیسے سیدھا مغل شہنشاہ بابر سے ملتا ہے۔" ریحانہ کی تاریخی معلومات بس بابر تک ہی تھیں وہ بھی ٹی وی پر دکھائے گئے ایک ڈرامہ سیریل کی وجہ سے۔

"آپا رفیع آرہا ہے۔" کسی نئے حملے کی تیاری کرتی زبیدہ کا شانہ ہلا کر عابدہ نے انہیں گلی میں داخل ہوتے رفیع کی آمد سے آگاہ کیا تھا۔

ناچار تینوں خواتین کو ایمرجنسی میں بکتی جھکتی ریحانہ کو بخش کر گھر میں واپس جانا پڑا رفیع الزماں ان کے گلی میں کھڑے ہو کر لڑنے جھگڑنے کی عادت سے بہت نالاں رہتا تھا۔ دوسروں کو کسی خاطر میں نہ لانے والی یہ خواتین بہرحال اپنے گھر کے واحد مرد کو ناراض کرنے کا خطرہ نہیں مول لیتی تھیں سو اس کے گھر میں داخل ہونے تک مختلف سمتوں میں یوں اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئیں جیسے دروازے سے باہر جھانکا تک نہ ہو۔

ان تینوں پر ایک طائرانہ سی نگاہ ڈالتا رفیع ٹھنڈی سانس لے کر صحن میں املی کے درخت کے نیچے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا تینوں والداؤں کا افراتفری میں گھر میں داخل ہونا اور سامنے والی ریحانہ آنٹی کا لال بھبھوکا چہرہ وہ ملاحظہ کر چکا تھا لیکن پتہ تھا کہ پوچھنے پر کوئی ایک بھی والدہ اپنا جرم نہیں قبولیں گی۔

"لیں بھئی، استاد محترم گرما گرم کڑھی چاول نوش فرمائیں" ٹرے ہاتھ میں لئے



کھڑی طاہرہ کی آواز پر اسے خیال آیا کہ وہ دوپہر کا کھانا کھانے گھر آیا تھا تینوں والدائیں جو عام طور پر اس کے گھر میں داخل ہوتے ہی دسترخوان لگانے دوڑتی تھیں اس وقت اس کی تفتیش سے بچنے کے لیے اس کی آمد سے انجان بنی بیٹھی تھیں۔

"کچن میں اماں کو لے جا کر دے دو یہ ٹرے، میرا دل نہیں چاہ رہا کھانے کو۔" ایک اور نئے پھڈے نے اس کی بھوک اڑا دی تھی۔

"کیوں دل کو کیا ہوا ہے جو بھوک نہیں لگ رہی" اس کے مشورے پر عمل کرنے کے بجائے وہ خود بھی ایک کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھ گئی تھی۔

"مجھ سے کیا پوچھ رہی ہو، تم نے تو خود لائیو سارا تماشہ دیکھا ہوگا۔" وہ چڑ ہی تو گیا تھا۔

"زندگی مشکل کر رکھی ہے ان عورتوں نے۔" زیر لب بڑبڑاہٹ بھی جاری تھی۔

"آپ کو ان لوگوں سے بدگمان نہیں ہونا چاہیے دوسروں سے چاہے جو سلوک کریں کم از کم آپ سے وہ تینوں سچی محبت کرتی ہیں اور ویسے بھی ان کے دل آئینوں کی طرح شفاف ہیں جن پر کسی منافقت کی دھول نہیں جمی جو کچھ دل میں ہوتا ہے، وہی زبان سے بھی کہتی ہیں ایمانداری سے دل پر ہاتھ رکھ کر بتائے گا کبھی آپ کو ان کی محبت میں منافقت کا رنگ دکھائی دیا۔"

اس کے ان کی طرف سے صفائی پیش کرنے پر وہ اپنی لمحاتی سوچ پر دل سے شرمندہ ہوا۔

☆☆☆

"ٹنکو میں کہہ رہی ہوں اگر تم نے میری بات نہ مانی تو واپسی پر تمہارے اسی بیٹ سے تمہاری ہڈی پسلی ایک کر دوں گی۔" اس کی دھمکیوں کو خاطر میں نہ لاتا چودہ سالہ ٹنکو بیٹ لہراتا لمحوں میں اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا وہ مایوسی سے دروازے پر کھڑی گلی میں نظر دوڑانے لگی۔

اڑتے ہوئے پلاسٹک کے شاپنگ بیگز اور مختلف قسم کی سبزیوں کے چھلکوں سے اٹی گلی میں بلی کے دو سفید رنگ کے بچوں کے سوا کوئی ذی نفس موجود نہیں تھا۔ اچانک برابر کے دروازے سے بجلی کے تاروں کا گچھا ہاتھ میں لئے نکلتے رفیع کو دیکھ کر اسکے دل کی کلی کھل اٹھی۔

''جناب رفیع الزماں صاحب ذرا بات تو سنیئے گا۔'' لہجے میں حد درجے شیرنی سمو کر پکارا۔

رفیع الزماں' جو اس وقت کسی کام سے گھر آیا تھا اپنے لیے اتنے باادب القابات سن کر ٹھٹک کر رک گیا پلٹنے پر خوش اخلاقی کے سارے ریکارڈ توڑنے کی کوشش میں' پوری باچھیں کھولے مسکراتی طاہرہ پر نظر پڑی۔ ابھی ابھی اپنے عزت دار ہونے کا جو خیال دل میں پیدا ہوا تھا' فوراً اڑنچھو ہو گیا۔

''کیا ہے؟ جلدی بولو دوکان پر پہنچنا ہے مجھے۔'' انداز معمول سے بھی زیادہ بے مروت تھا۔

''وہ جی ذرا بازار سے قیمے کے سموسے اور پکوریاں تو لا دیں۔'' اس کی بداخلاقی کے باوجود بھی اپنے ہونٹوں سے مسکراہٹ جدا نہ ہونے دی۔

''میں کوئی فالتو دکھائی دیتا ہوں تمہیں۔ جا کر اپنے نکمے بھائیوں سے منگواؤ۔'' بنا کسی لحاظ کے جواب دے کر قدم آگے کی طرف بڑھا دیئے۔

''پلیز لادیں ناں۔ ننکو اور منو گھر پر نہیں ہیں میری سہیلیاں آئی ہوئیں ہیں۔'' اب کے باقاعدہ التجا کی۔

''تو اتنی چٹوری سہیلیاں بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ گھر میں چائے شربت جو بھی ہے بنا کر پلادو۔'' سہیلیوں پر اعتراض کے ساتھ مفت مشورے سے نوازتا وہ آگے بڑھ گیا۔

اپنی اس قدر خوش اخلاقی اور التجاؤں کو بھی ناکام جاتا دیکھ کر وہ کچھ دیر اس کی پشت کو غصے سے گھورتی رہی اور پھر اس کے موڑ مڑ جانے پر ناچار پیر پٹختی چائے بنانے



کچن میں گھس گئی۔

چائے بنا کر ابھی کپوں میں نکال ہی رہی تھی کہ دروازے پر دستک کی آواز سن کر باہر کی طرف جانا پڑا۔ آج امی منو کے ساتھ ماموں سے ملنے گئی ہوئی تھیں اور اس کی خوب پریڈ لگ رہی تھی۔

''یہ پکڑیں باجی' سموسے اور پکوریاں' رفیع بھائی نے بھجوائے ہیں'' دروازہ کھولنے پر رفیع کی دوکان پر کام کرنے والا ایک بچہ اس کے ہاتھ میں لفافے پکڑا کر خود نو دو گیارہ ہو گیا۔

''پوری اپنی سوتیلی اماؤں کی عادتیں لی ہیں' زبان میں کڑواہٹ اور دل میں چاہت۔'' لفافے ہاتھ میں تھامے وہ بڑی محبت سے سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

میری سامنے والی کھڑکی میں
ایک چاند سا مکھڑا رہتا ہے
افسوس یہ ہے کہ وہ مجھ سے
کچھ اُکھڑا اُکھڑا رہتا ہے

''ہاں تو اکھڑا اکھڑا تو رہتا ہے انہوں نے ابھی پچھلے ہفتے ہی تو لڑائی ہوئی تھی۔'' لہک لہک کر گاتے وہ طاہرہ کی موجودگی کو فراموش کر چکا تھا سو اس کے جملے پر بڑ بڑا کر رہ گیا۔ ایک چور نظر ریحانہ آنٹی کے گھر کی کھلی کھڑکی پر بھی ڈالی جہاں اب سے کچھ دیر پہلے لہرانے والا دھنک رنگ آنچل غائب ہو چکا تھا۔ اپنی واردات کی (جو صرف معصوم تانک جھانک تک محدود تھی) کوئی نشانی نہ پا کر ایک گونا گو اطمینان محسوس ہوا۔

''کس کے اکھڑے اکھڑے رہنے کی بات کر رہی تھیں تم؟'' درشتی سے سوال کیا۔

''وہی جو سامنے والی کھڑکی میں رہتی ہیں۔ ان ہی کی؟'' وہ بھی ایک کائیاں تھی اس کی نگاہوں کا مرکز بھانپ لینے کے باوجود انجان بن گئی۔

"کون رہتا ہے سامنے والی کھڑکی میں؟" دل میں چور تھا سو وہ کھٹک گیا۔

"ریحانہ آنٹی اور کون؟ کیا محلے والوں کو پہچاننا بھی چھوڑ دیا ہے ابھی پچھلے ہفتے آپ کی اماؤں کی ان سے لڑائی نہیں ہوئی تھی کیا۔اب وہ بے چاری اکھڑی اکھڑی ہیں تو شکوہ کیسا؟ ان کا تو حق بنتا ہے۔" اسے ڈرا کر اب خود آرام سے ہنس رہی تھی۔

"اچھا' تم ان کی بات کر رہی تھیں میں سمجھا تم نے مجھے" عین وقت پر جملہ دانتوں تلے روکا۔

"کیا سمجھ رہے تھے آپ؟" وہ اس کے خاموش ہو جانے پر موضوع سے ہٹ جانے والی تھوڑا ہی تھی۔

"کچھ نہیں سمجھ رہا تھا میں' میری فکر چھوڑ کر اپنے کام پر توجہ دو گھنٹہ بھر سے ڈائریکٹ سے ان ڈائریکٹ بنانے کو دیا ہوا ہے تم سے ہو کر نہیں دے رہا۔"

"تو آپ بھی تو گھنٹہ بھر سے ان ڈائریکٹ کو ڈائریکٹ میں چینج کرنے کی کوشش کر رہے ہیں' کون سا کامیاب ہو گئے۔" اسکی گھر کی خاطر میں نہ لا کر وہ ذو معنی انداز میں بولی۔

"ویسے نام تو آپ کا رفیع ہے لیکن گلے میں سر نام کو نہیں' کاش تھوڑا نام کا ہی اثر پڑ جاتا آپ کی آواز پر ہماری سماعتوں کو اتنا عذاب تو نہ سہنا پڑتا۔" پہلی بات کا اثر زائل کرنے کے لیے فوراً ہی اس کا ذہن دوسری طرف الجھانے کی کوشش کی۔

"میری آواز پر نام کا اثر نہیں ہوا تو کیا۔تمہاری آواز تو بالکل طاہرہ سید جیسی ہے۔" حسب توقع وہ بھڑک چکا تھا۔

"بس کرم نوازی ہے آپ کی۔ ورنہ کہاں میں اور کہاں اتنی بڑی گلوکارہ۔" لہجے میں اتراہٹ تھی۔

"اترانے سے پہلے پوری بات سن لیا کرو' میں تمہیں طاہرہ سید کی طرح عظیم گلو کارہ نہیں ٹھہرا رہا بلکہ یہ بتا رہا ہوں کہ تمہاری آواز اس کی طرح موٹی اور بھاری ہے۔" اس نے جیسے اپنے پر کیے گئے حملے کا جواب دیا۔



"ہونہہ' بڑے آئے میری آواز کو بھونڈی کہنے والے۔ آواز ہو گی اس چھمک چھلو کی بھونڈی' جو اتنی دیر سے کھڑکی میں کھڑی جلوے دکھا رہی تھی۔" آخر وہ پھٹ ہی پڑی۔

"ہیں! یہ کون بے چاری چھمک چھلو بیچ میں آ گئی۔" اس ڈائریکٹ حملے پر گھبرا جانے کے باوجود اس نے تجاہل عارفانہ سے کام لینا چاہا۔

"خوب دیکھ رہی ہوں میں نگاہوں کے نشانے آج تک پڑوس کی دیوار سے جھانکتے چاند کا خیال تو آیا نہیں سامنے کھڑکی میں چاند سا مکھڑا نظر آنے لگا۔" منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی وہ اپنی کتابیں سمیٹ سماٹ گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

☆☆☆

"یہ کھیر کہاں سے آئی اماں؟" دستر خوان پر موجود خوب بادام پستوں سے سجی کھیر کی پیالی دیکھ کر اس نے پوچھا۔

"سامنے والی ریحانہ کے گھر سے آئی ہے؟۔"

"ریحانہ آنٹی کے گھر سے! لیکن ان سے تو شاید آپ لوگوں کا کوئی جھگڑا چل رہا تھا؟" اماں کے جواب پر اسے اچنبھا ہوا۔

"جھگڑا وگڑا کیا بیٹا' وہ عورت ہے ہی بڑی بد اخلاق مجھے تو خود حیرت ہے کہ اس نے یہ کھیر بھیجی کیسے؟ ورنہ وہ تو کسی کو اپنا بخار نہ دے" ہاجرا بیگم نے ابھی کچھ دن پہلے ہونے والی لڑائی کو فراموش نہیں کیا تھا۔

"کون دے کر گیا تھا یہ کھیر؟" پیالی اپنے آگے کھسکاتا وہ تجسس سے بولا۔

"اس کے بھائی کی بیٹی آئی ہوئی ہے آج کل رہنے وہی شام میں دیکر گئی تھی۔"

اماں کا جواب سن کر اسے دل ہی دل میں افسوس ہونے لگا کہ وہ کیوں شام کو گھر نہ پہنچ سکا اصل میں آج ان کے پرانے کسٹمر ہاشمی صاحب کا ٹیلیویژن ٹھیک ہونے آیا ہوا تھا۔ آجکل پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان میچز چل رہے تھے اور ہاشمی صاحب کرکٹ کے ازحد شیدائی تھے لہٰذا ان کے اصرار پر اسے ارجنٹ ان کا ٹی وی ٹھیک کر کے

دینا پڑا اور اسی وجہ سے وہ شام میں گھر نہیں آسکا لیکن اب یہ جان کر کہ وہ حور شمائل جو پچھلے چھ دن سے کھڑکی میں سے جلوے دکھا دکھا کر اس پر بجلیاں گرا رہی تھی شام میں بنفس نفیس ان کے ہاں جلوہ افروز ہوئی تھی اسے اپنی عدم موجودگی اور ہاشمی صاحب کی کرکٹ پسندی دونوں پر بڑا غصہ آیا۔

''شام میں طاہرہ بیچاری بھی بڑی دیر تک تمہارے انتظار میں بیٹھی رہی کہہ رہی تھی امتحان نزدیک ہے ابھی تک تیاری پوری نہیں ہوئی۔'' عابدہ بی نے اطلاع فراہم کی۔

''اس کی تیاری کبھی پوری ہو بھی نہیں سکتی سارا وقت تو باتوں میں دھیان لگا رہتا ہے۔'' وہ جل کر بولا۔

''پھر بھی بچے' جب تم نے ذمہ داری لی ہے تو تھوڑی زیادہ محنت کر کے اسکی تیاری مکمل کروا دو ورنہ وہ آفت کی پرکالہ فیل خود ہوگی الزام تمہارے سر رکھ دے گی۔'' زبیدہ خاتون نے اسے سمجھایا۔

''اچھا اماں کروا دوں گا اسکی تیاری'' ابھی تو مجھے سکون سے کھانا کھانے دو۔'' وہ بیزاری سے بولا' پھر کھیر کی پیالی واپس پٹخ کر وہاں سے اٹھ گیا۔ ٹھنڈی میٹھی کھیر میں طاہرہ کے ناوقت ذکر سے تلخی گھل گئی تھی۔

''کتنی بار سمجھایا ہے تم دونوں کو کھاتے وقت اسے ادھر ادھر کی باتیں سنا کر تنگ مت کیا کرو اب اٹھ گیا ناں وہ دسترخوان سے۔'' ہاجرہ بیگم نے دونوں سوکنوں کو ڈپٹا۔ وہ دونوں بھی خلاف معمول ان کی ڈانٹ سن کر خاموش رہیں۔'' ویسے ان کی سمجھ میں رفیع کی ناراضگی کی وجہ نہیں آرہی تھی۔

☆☆☆

علی یار آؤ گلی میں کرکٹ کھیلتے ہیں' برابر سے ٹنکو اور منو کو بھی بلا لیں گے۔'' بڑی دیر خاموشی سے تخت پر لیٹے لیٹے سامنے والی کھڑکی کی طرف تاڑتے رفیع الزماں نے ثمن آراء کے پانچ سالہ بیٹے کو پکارا علی نے بھی اکلوتے ماموں کی اس حیرت انگیز آفر پر فوراً بیٹ سنبھال لیا ورنہ ماموں صاحب جنہیں ہمہ وقت صرف اپنے لاڈ اٹھوانے کی عادت تھی



ہزار منتوں کے باوجود بھی راضی نہ ہوتے تھے۔

''مجھے لگتا ہے میرا ہونے والا داماد مستقبل میں کرکٹر بنے گا۔'' علی کے پر جوش انداز میں بیٹ لہرا کر باہر نکلنے پر ثمن آراء سے چھوٹی امن نے تبصرہ کیا۔

''اور میرا داماد تو شاید صرف دلہا ہی بنے گا ہر وقت پڑا سوتا رہتا ہے۔'' شبنم اپنی دو ماہ کی بیٹی کی پپی چینچ کرتے مسکرائی۔ اشارہ جھولے میں سوتے آٹھ ماہ کے ولی کی طرف تھا امن کی بیٹی ڈھائی سال کی اور شبنم کی صرف دو ماہ کی تھی لیکن دونوں بہنوں نے ابھی سے بڑی بہن کے دونوں بیٹوں کو اپنا داماد نامزد کر دیا تھا ثمن دونوں کے چٹکلے چھوڑنے کی عادت سے واقف تھی اس لیے ان کی باتوں پر صرف خاموشی سے مسکرانے پر اکتفا کرتی ورنہ آگے قسمت میں کیا لکھا ہے وہ کیا کہہ سکتی تھی۔

''اپنی گود کے بچوں کے لیے تم لوگوں نے بر ڈھونڈ لیے اور میرے گھبرو جوان بچے کی فکر نہیں' بے چارہ کیسا لنڈورا گھومتا رہتا ہے۔'' ہاجرہ بیگم کو رفیع الزماں کی فکر نے ستایا۔

''آپ فکر مت کریں خالہ' آپ کے بچے نے اب خود اپنی فکر شروع کر دی ہے جلد بہولا دے گا آپ کو۔'' اندر داخل ہوتی طاہرہ جو باہر رفیع کو بچوں کے ساتھ کرکٹ کھیلتے اور ریحانہ کی بھتیجی عطیہ کو کھڑکی میں لٹکے دیکھ کر آئی تھی بولی شاید ان کا جملہ اندر داخل ہوتے ہوئے اس کے کانوں میں پڑ گیا تھا۔

''اے بی رہنے دو تم تو اپنی خوامخواہ معصوم بچے پر الزام لگاتی ہو وہ تو اتنا سیدھا ہے کبھی کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔'' عابدہ بی نے اس کے لتے لیے'' بھئی میرا تو کام تھا آپ لوگوں کو خبردار کرنا آگے آپکی مرضی جو چاہیں کریں۔'' شبنم کی بیٹی کو گود میں اٹھا کر پیار کرتے اس نے جواب دیا۔

''اور تم بتاؤ طاہرہ کیا حال چال ہیں پڑھائی وڑھائی تو ٹھیک جا رہی ہے؟''

تینوں اماؤں کے بگڑے زاویے ثمن نے دیکھ لیے تھے لہٰذا خود بیچ میں دخل دے کر موضوع گفتگو بدل ڈالا۔

"وہ ہمارے استاد محترم ہی جانتے ہوں گے، ورنہ ہمیں تو خود اپنی خبر نہیں۔"

بچی کو واپس اس کی جگہ لٹاتے اس نے جواب دیا پھر فوراً ہی ہاجرہ بیگم کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"خالہ اماں کہہ رہی ہیں اپنا چمٹا دے دیں ہمارا منو نے کہیں چھپا دیا ہے۔"

"باورچی خانے میں رکھا ہے وہاں سے لے لو اور ذرا جلدی واپس لا دینا ابھی ہمیں خود بھی روٹیاں ڈالنی ہیں۔" ہاجرہ بیگم کی تیوری پر ابھی بھی بل تھا لیکن وہ نظر انداز کرتی کچن کی طرف بڑھ گئی۔

"اچھا ثمن باجی' امن اور شبنم جا رہی ہوں ابھی کام ہے شام کو آپ لوگوں سے ملنے آؤں گی تو پھر اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے باہر ہی سے آواز لگا کر بولتی وہ اپنے گھر روانہ ہو گئی۔

"اماں یہ طاہرہ بھی تو اچھی لڑکی ہے آپ بھیا کے لیے اس کے بارے میں کیوں نہیں سوچتیں۔" ثمن آراء نے انکی توجہ اسکی طرف دلوائی۔

"خاک اچھی لڑکی ہے سارا دن اودھم دھاڑ مچائے رکھتی ہے" ہاجرہ بیگم نے منہ بنایا۔

"صحیح کہہ رہی ہیں آپا' یاسمین بانو خود تو اچھے مزاج کی عورت ہے لیکن بیٹی کی تربیت ٹھیک نہیں کی۔لڑکی میں کوئی طریقہ سلیقہ ہی نہیں" زبیدہ خاتون نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

دیسے ثمن بیٹی تمہیں یہ خیال آیا کیسے؟ تم لوگوں کا ایک ہی تو بھائی ہے اسکی شادی ایسی لڑکی سے کروا کر کیا اپنا میکے آنا جانا بند کرواؤ گی۔" عابدہ بی نے بھی اپنا تبصرہ جاری کیا۔

ایسی بات نہیں ہے چھوٹی اماں' بس تھوڑا کھلنڈر پن ہے اس میں وقت کے ساتھ ٹھیک ہو جائے گی۔تینوں کی شدید مخالفت کے باوجود ثمن نے بے دبے الفاظ میں طاہرہ کی حمایت کی۔



"ناں بیٹی ناں' ہمارا تو ایک ہی بیٹا ہے اسے ہم تجربات میں نہیں گنوا سکتے۔"

ہاجرا بیگم نے ٹکا سا جواب دیا۔

"چھوڑیں باجی' کوئی طاہرہ دنیا کی واحد لڑکی تو نہیں کوئی اور مل جائے گی بھیا کے لیے" امن نے گویا بات ختم کرنا چاہی۔

"لیکن کب......؟" شبنم کے انداز میں حسرت تھی۔

☆☆☆

سنو طاہرہ میرا ایک کام کر دو گی" کسی Passage کی Explanation میں الجھی طاہرہ کو بڑی سوچ بچار کے بعد اس نے مخاطب کیا۔

"دل چاہا تو کر دوں گی" وہ بھی طاہرہ تھی اتنی آسانی سے ہاتھ کیسے آتی۔

"دل کو اپنے مارو گولی میرا چھوٹا سا کام کر دو' یہ خط ریحانہ آنٹی کی بھتیجی تک پہنچا دو۔" اس کی لاپرواہی کو خاطر میں نہ لاتا وہ فوراً بولا۔

"دل کو گولی تو آپ نے مار ہی دی ہے' میں خود کیا ماروں" زیر لب بڑبڑاتے آنکھوں میں آئے آنسو چھپانے کے لیے اس نے کتاب پوری طرح اپنے چہرے کے سامنے کر لی۔

"یہ تمہیں آج زیادہ پڑھا کو بننے کی کیا سوجھ رہی ہے پہلے میری بات کا جواب دو' میرا کام کرو گی یا نہیں؟" جھنجھلا کر اس نے کتاب اس کے ہاتھ کھینچنا چاہی کر دوں گی آپ کا کام پڑھنے تو دیں مجھے اتنا مشکل Passage ہے سمجھ ہی آ کر نہیں دے رہا۔" اس کی آواز رندھنے لگی۔

"تو اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ نہیں سمجھ آ رہا تو مجھ سے کہو میں سمجھا دوں گا" اس کی آنکھوں میں ڈولتے آنسو دیکھ کر وہ فوراً ہی پسیج گیا پھر ہاتھ میں کتاب لے کر بڑی دیر تک اسے سمجھاتا رہا وہ یونہی خالی خالی دماغ سے اس کے ہلتے لبوں کو دیکھتی رہی۔

"اب ٹھیک ہے اب تو کوئی مشکل نہیں" مسلسل دس منٹ بولنے کے بعد وہ چند لمحے خاموش رہ کر اس سے مخاطب ہوا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے اب میں جاؤں" وہ کھوئی کھوئی کیفیت میں بولی تھی۔

"پڑھنے میں دل ہی نہیں لگاتی ہو تم تو تمہیں سمجھ کیسے آئے گا کچھ" اس کی غائب دماغی اور عدم دلچسپی کو اس نے بھی بھانپ لیا تھا سو فوراً ہی ٹوکنے لگا۔

دل جہاں لگانا تھا بہت پہلے لگا چکی اب کسی چیز میں لگنا مشکل ہے" بے بسی سے بولتی وہ اپنی کتابیں سمیٹ رہی تھی۔

"کہاں لگا لیا ہے تم نے اپنا دل ٹنکو کی سائیکل میں یا منو کی پتنگ میں؟" اسکی آزردگی کو سمجھے بغیر اس نے مذاق اڑایا۔

"آپ نہیں سمجھ سکتے اس بات کو جانے دیں۔" وہ جیسے یکدم ہی بڑی ہو گئی تھی۔

"مجھے سمجھنے بھی نہیں ہیں تمہاری اونگی بونگی باتیں میں تم سے صرف اپنے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔" تینوں والدائیں باہر صحن میں بیٹھی ہمسائیوں کی غیبت میں مصروف تھیں چنانچہ وہ بڑے اطمینان سے اپنا مدعا بیان کر رہا تھا۔

"ٹھیک ہے کردوں گی آپ کا کام آگے آپ کی قسمت" بالآخر اس نے حامی بھر ہی لی۔

☆☆☆

"یہ لیں جی آپ کی امانت" کتاب میں سے نکال کر ایک تہہ کیا ہوا پرچہ اس کی طرف بڑھایا لیکن جیسے ہی اسنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا رات بھر ٹریجڈی فلموں کی ہیروئنوں کی طرح آنسو بہانے کے بعد وہ آج پھر اپنے پہلے والے جوبن میں تھی۔ "محبت میں طلب کیسی؟" اسنے اپنے آپ کو سمجھا لیا تھا۔

"کیا ہے طاہرہ دوناں مجھے یہ پیپر" منجھلی اماں اس کے کمرے کے دروازے کے ساتھ رکھے گملوں کو پانی دے رہی تھیں سو آواز دبا کر التجا کی۔

"اوں، ہوں ایسی چیزیں اتنی آسانی سے تھوڑا ہی ملا کرتی ہیں۔" پرچے کو کتاب میں رکھ کر کتاب اپنے دونوں ہاتھ میں مضبوطی سے تھام کر اسے جلایا وہ بھی سمجھ گیا




کہ اس کی بیتابی کو دیکھ کر تنگ کر رہی ہے اس لیے انجان بن گیا۔

"ٹھیک ہے مت دو میں کونسا مرا جا رہا ہوں اس کے لیے۔"

"اچھا ......تو پھر ایسا کرتی ہوں آپ کی کسی ایک والدہ ماجدہ کو دے دیتی ہوں ویسے کس کو دوں؟" اچھا کو کافی لمبا کرتے اُس نے اسے دھمکایا تھا اور آخر میں سرگوشی میں رائے بھی پوچھی تھی۔

"خدا کے لیے طاہرہ کیوں میری محبت کو شروع ہونے سے پہلے ہی ختم کر دینے پر تلی ہو۔" وہ اسکی دھمکی س فوراً ہی مرعوب ہو گیا۔

"بھئی آپ کو مجھ سے اتنا خوفزدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے ساری دنیا آجکل Give and take کے اصول پر چل رہی ہے اگر آپ کو مجھ سے اپنے کام کی چیز چاہیے تو پہلے میرا کام بھی کرنا ہوگا۔"

"تمہارا کام ......تمہیں کیا کام ہے؟ کیا نکڑ والے کلو قصائی کو پریم پتر بھجوانا ہے۔" اس کے سودے بازی کی ادا اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی سو جل کر اس کی ناپسندیدہ ہستی کا حوالہ دیا۔

"فی الحال تو آپ سے important topics کے چھرّے بنوانے ہیں۔" اس کی دل جلی بات پر کوئی ردعمل ظاہر کیے بغیر اپنا مطالبہ پیش کیا تھا۔

"اچھا بنا دوں گا اب تو دے دو مجھے وہ خط۔" منجھلی اماں پودوں کو پانی دے کر وہاں سے جا چکی تھیں سو اطمینان سے "خط" کا لفظ استعمال کیا۔

"ہائے ہائے کیا زمانہ آگیا ہے اب استاد خود شاگردوں کو چھرّے بنا کر دیا کریں گے۔" کتاب سے فولڈ کیا کاغذ نکال کر اسے دیتی وہ چھیڑنے سے باز نہیں آئی تھی۔ لیکن وہ پوری طرح اپنے خط کا جواب پڑھنے میں محو تھا خوشی سے چہرہ ہزار والٹ کے بلب کی طرح جگمگا رہا تھا۔

"ایسا کرنا طاہرہ جاتے وقت مجھ سے جواب لیکر جانا' میں ابھی لکھ دوں گا۔"

"جی نہیں میں کوئی کبوتری نہیں ہوں جو ادھر سے ادھر سندیسے پہنچاتی رہوں

فون نمبر دے دوں گی ''عطیہ آپا کو آپ کی دکان کا' خود ہی رابطہ کر لیں گی وہ آپ سے۔'' اسکی خوشی کو ملیا میٹ کرتی وہ ''عطیہ آپا'' کے الفاظ پر زور دے کر بولی۔

''وہ تمہاری عطیہ آپا کہاں سے ہوگئی اچھی خاصی کم عمر لگتی ہے۔'' رفیع الزماں کو اس کا آپا پکارنا برا لگا۔

''کیوں بی اے میں پڑھ رہی ہیں وہ مجھ سے بڑی ہی ہوں گی میں نے تو ابھی انٹر بھی نہیں کیا۔''

''اگر مسلسل دو سال سے انگلش کے پیپر میں فیل نہ ہو رہی ہوتیں تو بھی اس وقت بی اے فائنل میں ہوتیں۔'' رفیع الزماں نے اسے حقیقت یاد دلانی چاہی۔

''کچھ بھی ہو'' ہم تو کلاسوں سے عمر کا اندازہ لگاتے ہیں' جتنی کلاس بڑی ہوگئی اتنی ہی عمر بھی زیادہ۔'' وہ ڈھٹائی سے اپنی بات پر جمی تھی۔

☆☆☆

''سارا سال اسکول والے بچوں کو سردی گرمی خزاں بہار چار موسموں کے نام رٹواتے رہتے ہیں جبکہ اس ملک میں گرمی کے سوا کوئی دوسرا موسم آتے میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا پتہ نہیں باقی کے تین کب آتے ہیں اور کب چلے جاتے ہیں جو ہمیں علم ہی نہیں ہوتا۔'' بس کے انتظار میں اپنی دوست سیما کے ساتھ اسٹاپ پر کھڑی وہ دوپٹے کے پلو سے چہرے پر سے پسینے کی بوندیں صاف کرتی مسلسل بڑبڑا رہی تھی ایک تو گرمی واقعی کافی زیادہ ہو رہی تھی دوسرے پیپر بھی اچھا نہیں ہوا تھا قسمت کی ستم ظریفی سے انہیں ممتحن بڑی سخت قسم کی ٹکرا گئی تھی چنانچہ دھمکیاں دے کر رفیع الزماں سے بنوائی گئی پرچیاں نکالنے کا موقع بھی نہیں مل سکا تھا۔

''تم کیوں گونگے کا گڑ کھائے کھڑی ہو' کچھ بولتی کیوں نہیں؟'' موسم پر اپنے رواں تبصرے پر سیما کی رائے شامل نہ ہونے پر اسے کچھ بے چینی ہوئی۔

''میں سوچ رہی ہوں اگر اس بار بھی فیل ہوگئی تو کیا ہوگا؟'' سیما کافی روہانسی ہو رہی تھی۔





''اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ معلوم ہی ہے تمہیں کہ وہ تمہارا سڑیل منگیتر شادی کو پھر ایک سال کے لیے بڑھا دے گا۔'' سیما کی منگنی اپنے خالہ زاد سے ہو چکی تھی' وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے تھے لیکن اس کا منگیتر چونکہ خود پڑھا لکھا تھا اس لیے اس نے شرط رکھی ہوئی تھی کہ سیما کو شادی سے پہلے کم از کم انٹر ضرور کرنا ہوگا۔ آگے بی۔اے، ایم۔اے وہ خود کروا دے گا سیما کو بی۔اے کرنے کی کوئی خواہش نہیں تھی لیکن فی الحال اس نے خاموشی اختیار کی ہوئی تھی اور شادی کے لیے لازمی شرط یعنی انٹر پاس ہونے کے مرحلے سے گزرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آگے کے لیے اس نے سوچ رکھا تھا کہ بس ایک بار شادی ہو جائے پھر وہ خود مسٹر خالد (اپنے منگیتر) سے نمٹ لے گی۔

''تمہیں اللہ پوچھے طاہرہ، دوست کے غم میں شریک ہونے، اسے دلاسہ دینے کی بجائے زخموں پر نمک چھڑک رہی ہو لے کر جھٹ شادی کو ایک سال بڑھا دیا یہ نہیں کہہ سکتی تھیں کہ سیما انشاء اللہ تم اس سال ضرور پاس ہو جاؤ گی اور تمہارے ہاتھوں پر مہندی رچ جائے گی یا یہ کہ سیما تم فکر مت کرو اگر فیل بھی ہوگئیں تو خالد اس بار اپنی شرط میں نرمی کر لے گا اور تمہیں انٹر کروانے کا ارادہ شادی تک ملتوی کر دے گا۔'' سیما کو طاہرہ کی بے نیازی ایک آنکھ نہیں بھائی تھی سو اب اسے آڑے ہاتھوں لے رہی تھی۔

''بھئی میں کافی حقیقت پسند ہوں اس لیے تمہیں وہ ہی بتا رہی ہوں جو اصل میں تمہارے ساتھ پیش آئے گا۔ لہٰذا بہتر ہے کہ تم بھی شیخ چلی کی طرح خواب دیکھنے سے پرہیز کرو اور گھر جا کر دوبارہ پیپر کی تیاری کرنے بیٹھ جاؤ۔'' اس کے بڑی ادا سے حقیقت پسند ہونے کا اعلان کرنے پر سیما کا دل تو یہی چاہا کہ ہاتھ میں پکڑی فائل اس کے سر پر دے مارے لیکن اسٹاپ پر کھڑے دیگر لوگوں کی وجہ سے لحاظ کر گئی۔ البتہ زبان کے جوہر دکھانے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی اس لیے جوابی حملہ کر ڈالا۔

''اوہنہ! بڑی آئیں حقیقت پسند، حقیقت پسند ہوتیں تو اب تک اکتوبر کے مہینے میں گرمی کی شدت برداشت کرنے کی عادی ہوگئی ہوتیں ......اور وہ دیکھو ایک اور حقیقت اتر رہی ہے تمہارے رفیع الزماں کی بائیک سے۔'' اچانک ہی اس کی نظر رفیع الزماں کے

ساتھ کالج یونیفارم میں ملبوس عطیہ پر پڑی تھی اور نہایت تیزی سے اس نے بات کا رخ! موسم سے اس کی طرف موڑ دیا تھا۔

"اوہو...... یہ عطیہ آپا تو بڑی تیز نکلیں، گھر سے چلی ہوں گی کالج کے لیے اور پہنچیں ہوئی تھیں سیر سپاٹے کرنے۔" طاہرہ نے بغور عطیہ کے میک اپ زدہ چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ویسے اسے رفیع کا اس طرح سے سڑکوں پر کسی کے ساتھ گھومنا ذرا نہیں بھارہا تھا۔

"کیا خیال ہے چل کر معلومات نہ حاصل کریں تمہاری عطیہ آپا سے آج کی "ڈیٹ" کے بارے میں" سیما کو اپنا غم بھول کر نیا ہی موقع ہاتھ لگا تھا۔

"اپنی جنرل نالج میں اضافے کے لیے اس شوق کو پھر کبھی پورا کرلینا اس وقت بس میں سوار ہو جاؤ پہلے ہی گھنٹہ بھر انتظار کے بعد تشریف لائی ہے۔" طاہرہ بازو تھام کر عطیہ کے پاس جانے کے لیے مچلتی سیما کو بامشکل گھسیٹ کر بس تک لے جانے میں کامیاب ہوسکی۔

☆☆☆

کیسا ہوا تمہارا پیپر؟ سوالات کا پرچہ ہاتھ میں تھامے وہ طاہرہ سے استفسار کر رہا تھا۔

"ویسا ہے جیسا پچھلے دو سال سے ہو رہا ہے۔" نہایت اطمینان سے شانے اچکا کر جواب دیا گیا۔

"کیا......؟" اور وہ جو میں نے اتنی محنت سے تمہیں پڑھایا تھا اور وہ جو رات بھر جاگ کر پھرّے بنا کر دیئے تھے۔ وہ کچھ کام نہیں آئے۔" اس کی اس درجے نالائقی پر رفیع الزماں کو شدید صدمہ پہنچا۔

"محنت سے کب پڑھایا تھا۔ اگر محنت سے پڑھایا ہوتا تو میرا پیپر اچھا نہیں ہو جاتا' محنت تو آپ آجکل صرف عطیہ آپا پر کر رہے ہیں۔" اپنی نااہلی پر پردہ ڈالنے کے لیے سارا الزام اس کے سر ڈال دیا۔



"یہ تمہاری پڑھائی سے عطیہ کا کیا تعلق' جو تم خواہ مخواہ اسے بیچ میں گھسیٹ رہی ہو۔" اپنی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھے جانے پر وہ بلبلا اٹھا۔

"تعلق تو ہے اب یہی دیکھ لیں کہ آج جب میں پیپر دے کر نکلی تو دیکھا عطیہ آپا شاہی سواری سے اتر کر بس اسٹاپ پر قدم رنجہ فرما رہی ہیں ایسے حالات میں مجھ جیسی شریف باحیا لڑکی کا ذہن تو متاثر ہوگا ہی ناں۔ اور جب ذہن ہی صحیح کام نہ کرے تو بندہ پیپر کیا خاک اچھا کرسکتا ہے۔" پیپر کے بعد رونما ہونے والے واقعہ کو پیپر کی خرابی سے منسوب کرنے کا نادر خیال طاہرہ کے زرخیز ذہن میں ہی آسکتا تھا۔

"اوہ! تو تمہارا سینٹر اس کے کالج میں بنا تھا؟" اپنے موقع واردات پر دیکھ لیے جانے پر وہ کچھ جھینپ سا گیا۔

"ویسے استاد محترم یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اچھا خاصا صاف ستھرا ماضی رہا ہے آپ کا اب اگر کسی نے ایسی حرکتیں کرتے دیکھ لیا تو ساری زندگی کی پارسائی پر حرف آجائے گا بہتر ہے اپنی اماؤں کو راضی کر کے عطیہ آپا کے گھر بھیج دیں تاکہ تعلق رجسٹرڈ ہو جائے۔" لاپرواہی سے کرسی جھلاتی وہ بڑے ہلکے پھلکے انداز میں اسے اس کی غلطی کا احساس دلا رہی تھی۔

"اچھا تو مجھے بھی نہیں لگتا لیکن مجبور ہو جاتا ہوں۔ خیر ایک آدھ دن میں اماں سے بات کروں گا پہلے ذرا ریحانہ آنٹی سے تعلقات ہموار کرلوں۔" وہ واقعی بڑی شفاف زندگی گزارنے والا لڑکا تھا اور ان سب باتوں کو دلی طور پر اچھا بھی محسوس نہیں کرتا تھا لیکن جب عطیہ فون پر ملنے کی فرمائش کرتی اور محبوبانہ انداز میں اپنی بے قراری کا حال سناتی تو ناچار اسے حامی بھرنی پڑتی یوں بھی ابتدائی دن تھے محبت کے جس میں محبوب کی بات ماننے سے انکار کرنا تو دور کی بات اس کے ابرو کے اشارے کو نظر انداز کرنا بھی ناممکن لگتا ہے چنانچہ کسی اچھے ہوٹل میں لنچ کی فرمائش ہو یا کسی سوٹ، چپل، چوڑی، پر پسندیدگی اظہار رفیع الزماں عطیہ کی ہر بات زبان سے ادا ہونے سے پہلے پوری کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

"جو کچھ کرنا ہے جلدی کریں سرجی' ایسا نہ ہو کہ یہ گوٹی بھی آپ کے ہاتھ سے نکل جائے ویسے بھی اب رمضان شروع ہونے والا ہے یہ غیر شرعی قسم کی حرکتیں زیب نہیں دیں گی اتنے مقدس مہینے میں۔" جب سے رفیع نے اسے پڑھانا شروع کیا تھا وہ ایسے ہی القابات سے اسے پکارنے لگی تھی۔

"زیادہ بی نصیحت بننے کی ضرورت نہیں ہے مجھے خود بھی پتہ ہے کہ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔" مسلسل طعنے بازی نے آخر کار اسے تپا ہی دیا تھا۔

"ہم تو آپ کے خیر خواہ ہیں' اگر آپ کو ہماری باتیں اچھی نہیں لگتیں تو لیجئے اپنا منہ بند کیئے لیتے ہیں بلکہ یہاں سے رخصت ہی لے لیتے ہیں۔ ویسے بھی اب ہم فارغ التحصیل ہو گئے ہیں اور ہمیں آپ کی خوشامدوں کی ضرورت نہیں رہی۔"

"فارغ التحصیل تو خیر نہیں ہو سکتیں آپ البتہ رزلٹ آنے کے بعد اپنی امی کے ہاتھوں فارغ البال ضرور ہو جائیں گی خیر کسی بھی طرح ہی سہی آپ نے یہاں سے جانے کا جو فیصلہ کیا ہے اس پر میں تہہ دل سے آپ کا مشکور ہوں۔" اس کے شاہانہ انداز میں بولنے پر اسی کے لہجے میں جواب دیتے اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے باہر کا راستہ دکھایا۔

"جا رہی ہوں' جا رہی ہوں' کیوں آنکھیں ماتھے پر چڑھا رہے ہیں۔" دل جلانے والے انداز میں مسکراتی وہ باہر کی طرف چل دی۔

"طاہرہ! ذرا اپنی ماں کو بھیجنا' یہ موا ڈیزائن پلے ہی نہیں پڑ رہا اس سے پوچھوں گی شاید اسے سمجھ آجائے۔" رنگ برنگی اون کے گولے سامنے پھیلائے ہاجرہ بیگم صحن میں بیٹھی بڑی عرق ریزی سے سوئیٹر کے ایک نمونے پر غور کر رہی تھیں۔

"اچھا خالہ بھیج دوں گی۔" سعادتمندی سے جواب دیتی وہ دہلیز پار کر گئی۔

☆☆☆

"خالی ہاتھ فقیرنیوں کی طرح آئی تھیں تم اس گھر میں نہ کوئی زیور نہ گہنا' نہ کپڑے لتے کچھ بھی تو ساتھ نہیں تھا اور آج چلی ہو یہاں کی چیزوں پر حق جتانے۔"



ہاجرہ بیگم پوری قوت سے چلا رہی تھیں۔

"خالی ہاتھ آئی تھی، بھاگ کر تو نہیں آئی تھی جتنا آپ کا حق ہے اس گھر پر اور یہاں کی چیزوں پر اتنا ہی میرا بھی ہے۔" زبیدہ خاتون بھی پیچھے نہیں تھیں۔

آج برسوں بعد ان لوگوں کو ساس کا صندوق کھولنے کا خیال آیا تھا۔ عابدہ بی نے آئیڈیا دیا تھا کہ اس بار رمضان میں اماں ک پرانے برتنوں کو قلعی کر کے استعمال کیا جائے چنانچہ وہ تینوں اسٹور روم میں ان کا بڑا صندوق کھولے کھڑی تھیں۔ ایک نقشین ڈونگے کا ڈھکن ہٹانے پر چمکتے ہوئے سونے کے بٹن نظر آئے، یہ بٹن ہاجرہ بیگم نے اپنی شادی کے ابتدائی سالوں میں ہی انہیں استعمال کرتے دیکھا تھا ان کا شروع ہی سے ان بٹنوں پر بہت دل تھا سو اب برسوں بعد سامنے پا کر فوراً ہی ان پر لپکیں لیکن اس سے پہلے زبیدہ خاتون نے انہیں اپنے قبضے میں کر لیا۔

"یہ تو میں لوں گی۔" ساتھ ہی با آواز بلند اعلان بھی فرما دیا۔

ہاجرہ بیگم بھی اتنی آسانی سے اپنی من پسند چیز سے دستبردار ہونے والی نہیں تھیں سو ایک محاذ قائم ہو گیا بات تو تو میں میں سے بڑھ کر طعنوں تشنوں تک جا پہنچی بیچاری عابدہ بی دونوں کو چپ کروانے کی کوشش میں ہلکان ہو کر آخر کار تھک ہار کر بیٹھ گئیں۔ جبکہ وہ دونوں پوری دل جمعی سے لڑنے میں مصروف تھیں۔

"گھر پر اور گھر کی چیزوں پر حق کی بات کرتی ہو تم تو ویسے ہی برسوں پہلے میرے گھر پر قبضہ جمانے آ گئی تھیں۔ نہ جانے تمہارے اماں ابا نے کیا جادو کیا تھا رفیع کے ابا پر کہ وہ تمہیں میرے سینے پر مونگ دلنے یہاں لے آئے اور بجائے اس کے کہ تم میری احسان مند ہو یہاں اپنا حق جتا رہی ہو۔" ہاجرہ بیگم کو پرانے غم ستا رہے تھے۔

"میرے اماں ابا نے جادو کیا ہو یا نہ کیا ہو تم نے ضرور جادو کیا تھا مرحوم پر جو وہ تم جیسی بدکردار' غیر مردوں کے ساتھ تنہا گھومنے والی عورت سے شادی کر بیٹھے۔" چند پرانی لگائی بجھائی کرنے والی محلہ والیوں کی وجہ سے ہاجرہ بیگم کے ماضی کا یہ بدنما حصہ زبیدہ خاتون کے علم میں تھا لیکن انہوں نے کبھی اسے ظاہر نہ کیا تھا اب نہ جانے کیسے

زبان پھسل گئی۔

ہاجرہ بیگم کا تو اس عمر میں ایسا طعنہ سن کر یہ حال تھا کہ مانو بدن میں لہو نہ رہا ہو، زرد پڑتے چہرے اور کانپتی ٹانگوں کے ساتھ وہ بامشکل خود کو گھسیٹتی اپنے کمرے تک لے جانے کی ہمت کر سکی تھیں۔

زبیدہ خاتون بھی غصے میں تن فن کرتی اپنے کمرے میں جا گھسی تھیں جبکہ صحن کے بیچوں بیچ کھڑی عابدہ بی ساری صورتحال پر دم بخود تھیں ایک سناٹا سا پورے گھر میں اتر آیا تھا جس میں کچھ دیر بعد ابھرنے والی ہاجرہ بیگم کے قدموں کی چاپ نے ارتعاش پیدا کیا تھا۔

عابدہ بی نے دیکھا وہ بڑی سی سفید چادر اوڑھے' ہاتھ میں چھوٹا سا بیگ لیے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ رہی ہیں۔

''کہاں جا رہی ہیں بڑی آپا'' وہ فوراً ہی اسکی طرف لپکیں۔

''اشفاق بھائی کے گھر۔'' انہوں نے سپاٹ انداز میں جواب دیتے اپنے بھائی کا نام لیا جس کے نام پر ان کے پاس فقط ایک بھائی کا گھر ہی رہ گیا تھا۔

''بیگ لیکر کیوں جا رہی ہیں رکنے کا ارداہ ہے کیا؟ کل سے رمضان شروع ہو رہے ہیں' رکیے گا نہیں آپ کے بغیر افطار اور سحری میں مزہ نہیں آتا۔'' عابدہ بی کو ان کے انداز سے ہول آ رہا تھا سو جلدی جلدی بول رہی تھیں۔

''تم اور زبیدہ مل کر سنبھالو اس گھر کو' مجھ جیسی عورت کا بھلا کیا کام ہے یہاں۔'' وہ بے انتہا آزردہ تھیں۔

''مانتی ہوں بڑی آپا' چھوٹی آپا نے زیادتی کی ہے لیکن اسطرح کسی بات پر انسان اپنا گھر چھوڑ کر تھوڑا ہی چلا جاتا ہے چلیے رکھیئے اپنا سامان ایک آدھ دن میں انہیں اپنی زیادتی کا احساس ہو گا تو خود ہی آپ سے معافی مانگ لیں گی۔'' کہتے کے ساتھ عابدہ بی نے ان کا بیگ پکڑنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔

''اس وقت مجھے نہ روکو عابدہ' اگر میں یہاں رہی تو شاید صدمے سے میرا دل



پھٹ جائے آگ لگی ہوئی ہے میرے وجود میں مجھے ڈر ہے کہ کہیں میں کچھ کر نہ بیٹھوں۔''

بیگ ان کے ہاتھ سے چھڑاتی وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئیں ان کے انداز میں چٹانوں کی سی سختی تھی عابدہ باوجود چاہنے کے مزید کچھ کہنے کی جرات نہ کر سکیں اور خاموش نگاہوں سے انہیں جاتا دیکھتی رہیں۔

☆☆☆

سحری کے لیے کچھ منگوانا تو نہیں ہے چھوٹی اماں! اگر منگوانا ہے تو ابھی بتا دیں تراویح کے بعد لیتا آؤں گا۔'' قریشیہ کی بنی سفید ٹوپی سر پر لگاتے رفیع الزماں نے عابدہ بی سے پوچھا آج شام میں اسے کسی کام سے اپنے دوست کے پاس جانا تھا اس لیے حسب معمول چائے کے وقت گھر نہیں پہنچ سکا تھا اور اب بھی کھانے سے فارغ ہو کر جلد از جلد تراویح کے لیے جانے کی فکر تھی چنانچہ گھر میں بولتے سناٹوں کو محسوس نہ کر سکا۔

''سب موجود ہے بیٹا' تم اطمینان سے جا کر نماز پڑھ لو'' عابدہ بی نے اسکی تشفی کروائی۔

''اچھا! لیکن گجریلا تو لانا ہی ہو گیا' بڑی اماں کو سحری میں اس کے بغیر مزہ نہیں آتا۔'' اسے یکدم ہی خیال آیا۔

''جو تمہارا دل چاہے لے آنا ابھی تو جاؤ ورنہ جماعت نکل جائے گی اور ہاں واپسی میں دوستوں کے پاس مت رک جانا سیدھے گھر آنا مجھے کچھ کام ہے۔'' اس سے نظر چراتے عابدہ بی بی نے ہدایت کی آج جو کچھ پیش آیا تھا انہیں اسے اس کی اطلاع ضرور دینی تھی وہ بھی کچھ اس طرح کہ بجائے پریشان ہونے کہ وہ کوئی حل نکال سکے وہ جانتی تھیں کہ تینوں ماؤں میں اس کی سب سے زیادہ وابستگی ہاجرہ بیگم سے ہی ہے اور حقیقت میں انہوں نے بھی اسے سب سے بڑھ کر محبت دی تھی یہاں تک کہ اپنی سگی بیٹیوں کو بھی وہ رفیع کے سامنے نظر انداز کر دیتی تھیں۔ اب ان کے اس طرح گھر چھوڑ کر جانے پر وہ یقیناً شدید صدمے سے دو چار ہوتا۔ اس کے تراویح سے واپس آنے تک وہ مسلسل ذہن میں جملے ترتیب دیتی رہیں وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اسے زیادہ پریشانی ہو۔ وہ

کوئی پونے گیارہ کے قریب گھر آیا تھا اور پھر صحن میں انہیں تخت پر بیٹھے دیکھ کر شرمندہ سا ہو گیا۔

"سوری اماں وہ دراصل مسجد کے مائیک میں کچھ خرابی ہو گئی تھی مولوی صاحب نے مجھ سے دیکھنے کے لیے کہا تو میں انکار نہیں کر سکا اسے ہی ٹھیک کرنے میں دیر ہو گئی لیکن آپ سو جاتیں صبح سحری کے وقت بات کر لیتے کیا کوئی بہت ضروری بات تھی؟" وہ شرمندہ سا تاخیر کی وجہ بتا رہا تھا۔

"کوئی بات نہیں بیٹا! آدمی گھر سے نکلتا ہے تو سو جھمیلے اسکی جان کو لگ جاتے ہیں دیر سویر ہو ہی جاتی ہے مجھے بھی اگر ضروری بات نہیں کرنی ہوتی تو اس وقت تمہیں بے آرام نہیں کرتی" اس کی معذرت قبول کرتے عابدہ بی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"مسئلہ کیا ہے چھوٹی اماں؟ کوئی پریشانی کی بات تو نہیں" انکے بے انتہا سنجیدہ انداز پر اسے بھی تشویش ہونے لگی ایک نظر دونوں بڑی اور منجھلی اماں کے تاریک کمروں کی طرف ڈالتا وہ عابدہ بی کے قریب ہی تخت پر ٹک گیا۔ عابدہ بی نے دوپہر کو پیش آنے والا واقعہ مناسب الفاظ میں اسے کہہ سنایا سن کر کافی دیر تو وہ ساکت سا بیٹھا رہا اس گھر میں سوکنوں کے درمیان چھوٹے موٹے جھگڑے تو چلتے ہی رہتے تھے لیکن کبھی نوبت یہاں تک نہیں پہنچی تھی بلکہ جتنا وہ لوگ لڑتی جھگڑتی تھیں اس سے کہیں زیادہ ایک دوسرے کا خیال بھی رکھتی تھیں اور اتنے مقدس مہینے کی ابتداء پر تو اسے ذرا بھی ان لوگوں سے ایسے کسی رویے کی توقع نہیں تھی۔ وہ تو کھانے کے وقت گھر آنے پر بھی ان دونوں کے سامنے نظر نہ آنے پر یہی سمجھا تھا کہ اندر کسی کام میں مصروف ہوں گی۔ لیکن اب جو کچھ سن رہا تھا وہ بہت بدصورت تھا۔

عابدہ بی سے ساری بات سننے کے بعد بغیر کچھ کہے وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں اٹھ آیا تھا جب وہ اسے سحری کے لیے جگانے اس کے کمرے میں آئیں تو وہ انہیں جاگتا ہوا ہی ملا ان کے کہنے پر دسترخوان تک آ کر بیٹھا بھی تھا لیکن سامنے دونوں ماؤں کو بیٹھے دیکھ کر اسے بڑی ماں شدت سے یاد آئی تھیں ان تینوں کو برسوں سے اپنے اردگرد



دیکھنے کی عادت اتنی پختہ تھی کہ اس وقت ایک کی کمی نے سارے منظر کو ادھورا سا کر دیا تھا سامنے رکھے اپنے پسندیدہ شامی کباب اور ورقی پراٹھے بھی اس کی توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کروا پا رہے تھے اس کا سارا دھیان تو اس شاپر کی طرف تھا جس میں وہ کل رات بڑی اماں کے لیے گجریلا لایا تھا اور وہ ابھی تک تخت پر اسی طرح پڑا تھا جیسے رات اس نے رکھا تھا۔

"شروع کرو بیٹا! ٹائم ختم ہو جائے گا" اس پر چھائے سکوت سے گھبرا کر بالا آخر عابدہ بی نے اسے ٹوک ہی دیا۔

"آپ لوگ کھائیں اماں' میرا دل نہیں چاہ رہا" یکدم ہی وہ اٹھ کر باہر کی طرف چل پڑا۔

عابدہ بی شکوہ کناں نگاہوں سے زبیدہ خاتون کی طرف دیکھنے لگیں جنہوں نے خود بھی ہاتھ میں پکڑا پہلا لقمہ ابھی تک منہ میں نہ رکھا تھا۔

☆☆☆

"خالہ کچھ کریں' کسی طرح ہاجرہ خالہ کو گھر لے کر آئیں' ورنہ یہ گھر بالکل ویران ہو جائے گا" طاہرہ منت بھرے انداز میں عابدہ بی سے مخاطب تھی جس طرح پچھلے دس دن سے اس گھر پر موت کا سا سناٹا طاری تھا اور سب سے بڑھ کر رفیع الزماں کے چہرے پر جو اداسی چھائی تھی اسے دیکھ دیکھ کر اس کا دل خون ہوا جا رہا تھا۔

"کیا کروں بچی! میں تو اپنی سی پوری کوشش کر رہی ہوں لیکن کوئی میری سنتا ہی نہیں بڑی آپا ہیں تو اپنی جگہ اینٹھ کر بیٹھی ہیں دس چکر لگا آئی ہوں' ان دس دنوں میں ان کے بھائی کے گھر کے خود رفیع نے بھی ہزار منت سماجت کی ہے لیکن انہوں نے تو جیسے اپنا دل پتھر کر لیا ہے یہاں چھوٹی آپا سے کچھ کہوں تو لگتا ہے پتھر سے سر پھوڑ رہی ہوں ایسی چپ سادھ رکھی ہے انہوں نے خود پر کہ لگتا ہے اب قیامت تک نہیں بولیں گی۔ بیچارے میرے بچے کا اتنا سا منہ نکل آیا ہے ڈھنگ سے کھاتا پیتا تک نہیں اور بچیوں کی بھی فکر ہے ان کے لیے عیدیاں بھیجنی ہیں خریداری کرنی ہے سو بکھیڑے ہیں اب میں اکیلی جان

کن کن مسئلوں سے نمٹوں اور سچ تو یہ ہے کہ میری اپنی عقل بھی ٹھکانے نہیں کسی کام میں دل ہی نہیں لگتا کل ثمن کا فون آیا تھا۔ آج آنے کا کہہ رہی تھی ۔اب دیکھو کیا کہتی ہے یہاں کہ حالات دیکھ کر میں نے تو فون پر کچھ نہیں بتایا بہانا بنا دیا کہ دونوں بازار گئی ہوئی ہیں ۔ورنہ تمہیں پتہ ہے جب تک ایک ایک سے الگ الگ بات نہ کرلے اسے چین نہیں آتا اب بھلا بتاؤ سسرال میں بیٹھی بچی کو کیا یہاں کا حال سنا کر پریشان کرتی دسیوں بکھیڑے ویسے ہی لگے ہوئے ہیں بیاہی بیٹیوں کی جان کے ساتھ۔'' عابدہ بھی خود بڑی پریشان تھیں سو اس سے سارا حال کہہ گئیں ۔ورنہ عام حالات میں وہ تینوں ہی اسے بہت زیادہ لفٹ کروانے کی قائل نہیں تھیں ۔

''ثمن آپا آجائیں تو مجھے بلا لیجئے گا خالہ ہم دونوں ہی مل بیٹھ کر کوئی حل نکالنے کی کوشش کریں گے ۔'' وہ خلوص سے بولی ۔

''ٹھیک ہے بچی جب ثمن آئے گی تو میں تمہیں آواز دے لوں گی ۔'' عابدہ بی نے ایک سرد سی آہ بھرتے جواب دیا۔

☆☆☆

''سنا ہے جس نے کسی کی دل آزاری کی ہو یا خود کسی سے قطع تعلق کر رکھا ہو اللہ تعالیٰ اس کی کوئی عبادت قبول نہیں فرماتا بلکہ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ تین دن تک ایک دوسرے سے بات نہ کرنے والا شخص دائرہ اسلام سے ہی خارج ہوجاتا ہے۔'' عابدہ بی سے باتیں کرتی طاہرہ کی آواز تلاوت میں معروف زبیدہ خاتون کو مسلسل ڈسٹرب کر رہی تھی وہ کچن کے دروازے پر کھڑی اندر کام کرتی عابدہ بی سے گفتگو کر رہی تھی لیکن والیوم اتنا بلند تھا کہ زبیدہ خاتون اپنے کمرے میں ہونے کے باوجود ہر لفظ پوری طرح سن سکتی تھیں ویسے بھی انہیں یقین تھا کہ وہ یہ سب انہیں سنانے کے لیے ہی کہہ رہی تھی پچھلے کئی دنوں سے ان پر بہت زیادہ پریشر تھا کسی نے ان سے اپنے رویے کی معافی مانگنے پر تو زور نہیں دیا تھا لیکن پھر بھی وہ سمجھ رہی تھیں کہ سب ان سے ایسا ہی چاہتے ہیں جس روز ثمن گھر آئی تھی اس کے دوسرے ہی دن ان کی اپنی بیٹی شبنم نے انہیں فون پر



خوب آڑے ہاتھوں لیا اور واشگاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ جب تک بڑی اماں گھر نہیں آئیں گی وہ تینوں بہنیں بھی انہیں اپنی شکل نہیں دکھائیں گی ۔ادھر رفیع الزماں اور عابدہ بھی ان سے مخاطب نہ ہوتے تھے اپنے ہی گھر میں وہ احساس تنہائی کا شکار ہوگئی تھیں انہیں لگتا تھا کہ سب مل کر انہیں دبانا چاہتے ہیں اور انصاف سے کام نہیں لے رہے ورنہ زیادتی کی ابتداء تو ہاجرہ بیگم کی طرف سے ہوئی تھی بات سونے کے ان بٹنوں کی نہیں تھی بلکہ ان طعنوں کی تھی جو انہوں نے انہیں دیئے تھے وہ نہیں جانتی تھیں کہ ان کے بچے ان ہی جیسا سلوک ہاجرہ بیگم سے بھی کر رہے ہیں دراصل یہ سب طاہرہ کے مشوروں پر ہو رہا تھا۔اسی نے ان لوگوں کو سمجھایا تھا کہ کس طرح دونوں خواتین کو قابو کیا جا سکتا ہے۔سوتیلی اولادیں ہونے کے باوجود وہ چاروں ان دونوں کو جان سے بڑھ کر عزیز تھے ان کی کچھ دن کی بے رخی ہی ان دونوں کو راہ راست پر لاسکتی تھی ثمن نے بھی ماموں کے گھر فون کر کے ماں کو خبردار کر دیا تھا کہ چاہے زندگی گزر جائے وہ اپنے باپ کے گھر کے علاوہ کہیں اور ان سے ملنے نہیں آئے گی اپنی سگی بیٹیوں کی دھمکیوں کو تو خیر وہ کیا خاطر میں لاتیں اصل مسئلہ رفیع الزماں کا تھا جس میں انکی جان اٹکی رہتی تھی شروع کے دس بارہ دن ان کے پاس چکر لگانے کے بعد اس نے ان سے ملنے جانا چھوڑ دیا تھا اور اس کی صورت دیکھے بغیر دن گزارنا ان کے لیے دشوار ہوا جا رہا تھا۔خود رفیع الزماں کب ان کے بغیر رہ سکتا تھا لیکن بہنوں نے بامشکل اسے قائل کیا تھا کہ اماں کو واپس گھر لانے کا یہی حل سب سے زیادہ کارگر ہے ناچار اسے انکی بات ماننی پڑی تھی ۔عابدہ بی اس موقع پر ان سب کی ہمنوا بنی ہوئی تھیں سو سارا ڈرامہ بڑی کامیابی سے چل رہا تھا اندر ہی اندر وہ دونوں ڈھ رہی ہیں یہ وہ سب جانتے تھے بس انتظار تھا کہ کب موم ہوتی ہیں طاہرہ جو اس سارے اسکرپٹ کی رائٹر اور ڈائریکٹر تھی وقتاً فوقتاً اپنا رول بھی ادا کرنے پہنچ جاتی اپنے مخصوص لب و لہجہ میں ایسے ایسے بھیانک نقشے کھینچ کر قطع تعلق کرنے والوں کے متعلق اللہ کی ناراضگی کا حال سناتی کہ زبیدہ خاتون لرز جائیں ۔

اس وقت بھی انہوں نے گھبرا کر قرآن شریف بند کر دیا تھا،اور سوچ رہی تھیں

کہ واقعی ایسی عبادت کرنے سے کیا حاصل جسے دربارِ الٰہی میں شرفِ قبولیت ہی حاصل نہ ہو لیکن بس ایک انا تھی جو انہیں اپنی غلطی کا اعتراف نہ کرنے دیتی تھی۔

☆☆☆

''اوہو رفیع! تم کیا ہر وقت چھوٹے بچوں کی طرح اماں اماں کرتے رہتے ہو جب فون کرو ایک ہی قصہ سننے کو ملتا ہے میں دوسروں کی باتیں سننے کے لیے نہیں تم سے تمہاری اور اپنی باتیں کرنے کے لیے فون کرتی ہوں۔''

''یہ دوسروں کی بات نہیں ہے عطیہ! یہ میری اپنی بات ہے میری ماں کو تم دوسروں میں کیسے شمار کر سکتی ہو۔'' عطیہ کے نہایت روڈ لہجے میں بولنے پر اس نے اسے جتایا آج کل وہ جس قدر پریشان تھا اسے اس ایک قصے کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا، عطیہ کی محبت بھری باتیں' عید کی تیاریاں، شاپنگ، مستقبل کے پلان اسے کچھ بھی اچھے نہیں لگتے تھے اور وہ اس کی ہر بات کے بعد لوٹ پھر کر اپنی پریشانی کی طرف آ جاتا تھا۔ یوں بھی جس لڑکی کو وہ اپنے شریک سفر کی حیثیت سے دیکھتا تھا اپنی زندگی کے مسائل بھی اس سے شیئر کرنا چاہتا تھا لیکن عطیہ کو اس ساری داستان نے بے زار کر دیا تھا جبھی وہ چٹک کر بولی۔

''تمہاری کوئی ایک اماں ہوں تو بندہ ان کو برداشت بھی کر لے تین تین کے قصے سننا اور انہیں ہضم کرنا کم از کم میرے لیے تو بہت مشکل ہے۔''

''اگر تمہیں میرے ساتھ زندگی گزارنی ہے تو میری ماؤں کو برداشت کرنے کی عادت بھی ڈالنی ہوگی۔ ورنہ گزارا مشکل ہوگا۔'' اس نے فوراً ہی تنبیہہ کر ڈالی۔

''اچھا ٹھیک ہے لیکن فی الحال تو بورمت کرو اور یہ بتاؤ کہ کب میرے گھر اپنے گھر والوں کو بھیج رہے ہو۔'' اس نے اپنے مطلب کی بات بیان کی۔

''میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ میرے گھر پریشانی ہے بڑی اماں گھر پر موجود نہیں ہیں اور تم رشتہ بھیجنے کی بات کر رہی ہو۔ ان کی غیر موجودگی میں بھلا کون آئے گا تمہارے گھر والوں سے بات کرنے۔'' وہ جیسے اس کی خود غرضی پر تپ ہی گیا۔



''بڑی اماں نہیں ہیں تو کیا ہوا؟ منجھلی اور چھوٹی تو موجود ہیں ان میں سے کسی کو بھیج دو۔'' وہ بھی اپنی بات پر اڑی تھی۔

''کسی ایک کو بھیجنے کا کیا سوال' آئینگی تو تینوں آئینگی خاص طور پر بڑی اماں کو تو لازمی ہی اس کام میں شامل ہونا ہے۔''

''بھئی وہ کون سی تمہاری سگی ماں ہیں کہ انہیں اپنی شادی کے قصے ہیں انوالو نہیں کرو گے تو کوئی مصیبت آ جائیگی۔ ویسے بھی ابھی صرف رشتے کی بات ہو رہی ہے شادی تک راضی کر لینا انہیں۔'' وہ جھنجھلا سی گئی۔

''سگی ماں بے شک نہیں ہیں لیکن سگی ماں سے بڑھ کر ہیں۔ اگر تم میری زندگی میں ان کے کردار کے بارے میں غور نہیں کیا تو مجھے تمہیں اپنی زندگی میں شامل کرنے کے فیصلے پر غور کرنا پڑے گا۔'' اس کے انداز میں بڑی گھمبیر سنجیدگی تھی۔

''صرف تمہیں ہی نہیں مجھے بھی غور کرنا ہوگا اس معاملے میں کیونکہ میں تمہاری اماؤں کی اس فوج کو برداشت کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ میں تو سمجھتی تھی کہ سوتیلی مائیں ہیں ہر وقت لڑتی جھگڑتی رہتی ہیں تم بیزار ہو گے تینوں سے مجھے ان کے ساتھ رکھنے کے بجائے کسی دوسری جگہ رکھو گے لیکن آج پتہ چلا کہ تم تو گوڈے گوڈے ان کے عشق میں ڈوبے ہوئے ہو۔'' بالآخر عطیہ نے اپنے چہرے پر چڑھائی نقاب اتار ڈالی اور اندر سے اس کا مکروہ چہرہ اور چھوٹی سوچ برآمد ہو گئی۔

''کسی کو بھی اب غور کرنے کی ضرورت نہیں ہے نہ تمہیں نہ مجھے کیونکہ میں فیصلہ کر چکا ہوں۔ آئندہ مجھ سے رابطہ کرنے یا ملنے کی کوشش ہرگز نہیں کرنا کہ میرے دل میں تمہارے لیے اب کوئی جگہ نہیں رہی۔'' اس نے حتمی لہجے میں کہہ کر ریسیور پٹخ دیا تھا۔

☆☆☆

''بیٹا! آج مجھے بڑی آپا کے پاس لے چلنا آخری عشرہ شروع ہو گیا ہے رمضان کا ان کے بغیر عید کیسے منائیں گے۔'' صبح سے بے قرار پھرتی اندر باہر کمروں کے چکر لگاتی زبیدہ نے افطار کے وقت رفیع سے کہا تو وہ کھل اٹھا عابدہ بی نے بھی سکون کا

سانس لیا ورنہ جس طرح وہ انہیں بے چین دیکھ رہی تھی، ڈر تھا کہ کہیں وہ بیماری ہی نہ پڑ جائیں۔

"یہ آپ نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے چھوٹی آپا۔" شدت جذبات سے ان کی آواز بھرا سی گئی۔

"صحیح کہتی ہو عابدہ اگر آج میں یہ فیصلہ نہیں کرتی تو خود کو ساری زندگی معاف نہ کر پاتی اس خاندان کو توڑنے اور اپنی ہی اولاد کو دکھی کر دینے کا سارا الزام میرے سر ہوتا۔" ان کی پلکیں بھی بھیگ رہی تھیں۔

افطار کے فوراً ہی بعد وہ لوگ ہاجرہ بیگم کے بھائی کے گھر پہنچے تھے، ہاجرہ بیگم ان لوگوں کو دیکھ کر حیران تو بہت ہوئیں لیکن حسب توقع کسی ناراضگی کا اظہار نہ کیا بلکہ زبیدہ خاتون کے سوال کے جواب میں بے اختیار انہیں گلے سے لگا لیا۔

"مجھے معاف کر دیں بڑی آپا، میں نے آپ کا دل دکھایا پتہ نہیں اس روز مجھے کیا ہو گیا تھا جو آپ سے گستاخی کر بیٹھی، ورنہ آپ کتنی باکردار خاتون ہیں یہ مجھ سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے۔ برسوں گزارے ہیں میں نے آپ کے ساتھ بھلا میں نہ جانوں گی آپ کو تو کون جانے گا۔" وہ ہاجرہ بیگم کے گلے لگے لگے ہی معذرت کے الفاظ ادا کر رہی تھیں۔

"جانے دو زبیدہ، غلطی میری بھی تھی میں نے ہی بڑی ہو کر بڑے پن کا ثبوت نہیں دیا تھا ورنہ بھلا مجھے کیا کرنا تھا ان معمولی بٹنوں کا۔ بس دل میں خیال تھا کہ رفیع کی دلہن کو بری میں چڑھاؤں گی۔" انہوں نے بھی اپنی غلطی کے اعتراف کے ساتھ وضاحت دی۔

"گلے شکوے سارے بعد میں کرتے رہیے گا آپ لوگ اب گھر چلنے کی تیاری کریں اتنے تھوڑے دن رہ گئے ہیں عید میں اور کچھ تیاری نہیں اب ہم تینوں ملکر ہی ہاتھ پاؤں چلائیں گے تو کچھ ہو سکے گا، بچیاں بھی تینوں اپنی اپنی جگہ ناراض بیٹھی ہیں انہیں بھی راضی کرنا ہے۔" عابدہ بی نے دونوں کی توجہ فوری درپیش مسائل کی طرف مبذول کروائی۔



"ہاں ہاں عابدہ۔ فکر مت کرو سب ہو جائے گا میں بس ابھی دومنٹ میں اپنا بیگ لے کر آتی ہوں۔" ہاجرہ بیگم فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئیں لیکن آگے بڑھنے سے پہلے ہی رفیع الزماں نے پیچھے سے ان کی گردن میں بازو حائل کر دیے۔

"اپنی بہنوں سے مل کر بیٹے کو بھول گئیں ہیں میری اماں۔"

"چل ہٹ! میں تجھ سے بات نہیں کرتی، اتنے دنوں سے ملنے نہیں آیا اور اب محبت جتا رہا ہے۔" ہاجرہ بیگم نے روٹھے روٹھے لہجے میں جواب دیا لیکن اگلے ہی پل وہ اسے گلے سے لگائے کھڑی تھیں دونوں سوکنیں اور بھائی بھاوج ان کے اس انداز پر مسکرا اٹھے۔ جانتے تھے وہ اس کے بغیر بالکل نہیں رہ سکتیں ان کی ضد ٹوٹی ہی اس کی جدائی کی وجہ سے تھی اس کے لیے دل تڑپا تھا ہی تو وہ گداز ہوئی تھیں اور انہیں اپنی غلطیوں کا احساس بھی ہوا تھا۔

☆☆☆

رات کوئی ڈھائی تین بجے کا عمل تھا۔ مسجد سے مشہور عالم دین کا بیان سن کر باجماعت صلوٰۃ تسبیح کی نماز پڑھنے کے بعد وہ گھر آیا تھا، ستائیسویں شب تھی لہٰذا مسجدوں اور راستوں میں ہر جگہ چہل پہل تھی وہ باقی وقت گھر میں ہی عبادت کرنے کے خیال سے واپس لوٹا تھا ہاجرہ بیگم کے کمرے میں وہ تینوں خواتین بھی ایک ساتھ عبادات میں مصروف تھیں کچھ دیر اپنے کمرے میں بیٹھ کر تلاوت کرنے کے بعد اس کا دل اچانک ہی چھت پر جانے کو چاہا تھا اچھی خاصی خنکی کے باوجود اس وقت وہ وہاں بہت اچھا محسوس کر رہا تھا، سارے ماحول پر ایک عجیب سا سحر طاری تھا۔ زیر لب درود شریف کا ورد کرتے وہ چھت پر ٹہل رہا تھا ٹہلتے ٹہلتے وہ اپنی اور طاہرہ کی چھت کے درمیان موجود درمیانی دیوار تک پہنچا تو اس کی نظر جائے نماز پر بیٹھی اللہ سے راز و نیاز کرتی طاہرہ پر پڑی بڑی سی سفید چادر کے ہالے میں اس کے چہرے پر اتنا سکون تھا کہ وہ چند لمحے ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا ہمیشہ اوتگے بوتگے حلیے میں رہنے والی لاپرواہ مزاج کی لڑکی کے اندر اس وقت جانے ایسی کون سی خاص بات پیدا ہو گئی تھی کہ وہ اپنی نظریں واپس نہ موڑ سکا اسے یوں

محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے آسمان سے جونور کی لہریں اور رحمتوں کی بارش ہو رہی ہے ان سب کا مرکز صرف اس لڑکی کی ذات ہے جو اپنے دل میں دوسروں کے لیے بہت پر خلوص جذبات رکھتی ہے جس کی لاپرواہ طبیعت کے پردے میں بڑا حساس دل چھپا ہوا ہے جس طرح پچھلے کئی دنوں تک وہ ان کے گھر کے مسئلے میں پوری طرح انوالو رہی تھی۔ رفیع الزماں پر اس کے دل کی حالت عیاں ہو گئی تھی، اس کا آنے والے رشتوں پر ردعمل اور بے نیازی کی آڑ لے کر کی جانے والی محبت، آنے بہانے اپنے گھر کے چکر لگانا سب اسے سمجھ آنے لگا تھا۔

"اور یہ لڑکی جو میرے گھر کے ماحول کو سمجھتی ہے، میری بہنوں کو اپنی بہنوں کی طرح اور میری ماؤں کو اپنی ماں کی جگہ دیتی ہے، کیا میری زندگی کی حقیقی شراکت دار ثابت نہیں ہو گی؟" اپنے آپ سے کیے گئے اس سوال کا جواب اس کے پاس ہاں کی صورت آیا تھا، عطیہ کی اصلیت کھل جانے کے بعد تو ویسے بھی اس کے سامنے دنیا کے بہت سے رنگ کھل کر سامنے آ گئے تھے۔

"شاید اسی کی محبت بھری دعائیں تھیں کہ میرے گھر کا سکون ایک بار پھر قائم ہو گیا اور کسی فاش غلطی سے پہلے ہی مجھے اپنے فیصلے پر غور کرنے کا موقع مل گیا۔" بھیگی بھیگی پلکوں کے ساتھ خدائے بزرگ و برتر کے حضور اسے دعا میں مصروف دیکھ کر اس نے سوچا اور پھر واپس نیچے جانے کے لیے سڑھیوں کی طرف قدم بڑھا دیے۔

☆☆☆

"چاند ہمیں کہاں دکھائی دے گا، وہ تو نکلا ہو گا عطیہ آپا کے آنگن میں۔"

آسمان پر چاند کی تلاش سے مایوس ہو کر وہ اپنے آپ ہی بڑبڑائی لیکن فوراً ہی پیچھے سے آتی آواز سن کر رخ موڑنا پڑا۔

"اگر آپ آسمان پر چاند کو تلاش کرنے کے بجائے اپنی دیوار کے پار دیکھیں تو شاید کامیاب ہو جائیں۔" یہ رفیع الزماں تھا جو درمیانی دیوار پر کہنیاں ٹکائے شوخی سے مخاطب تھا پل بھر کو تو وہ اپنے رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر گڑبڑا سی گئی لیکن پھر اپنی ازلی



ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہوئے چمک کر جواب دیا۔

"بڑی خوش فہمی ہے آپ کو اپنے بارے میں، کبھی آئینے کو صاف کر کے اس میں شکل دیکھی ہوتی تو کبھی ایسی بات نہ کرتے۔"

"آئینوں کے سامنے سے پردے ہی تو ہٹیں ہیں جو میں پہلی بار وہاں اپنی شبیہ دیکھ پایا ہوں۔" اس کی آنکھوں میں بغور دیکھتا وہ ذومعنی لہجے میں بولا۔

اس بار اس سے خاموشی سے پلکوں کی جھالر گرا گئی کوئی جواب جو نہیں بن پڑا تھا۔

"بس بس اب کوئی فائدہ نہیں اس پردہ داری کا جو دیکھنا تھا میں دیکھ چکا۔" اس کے پلکیں جھکا لینے پر اس نے اسے چھیڑا تھا۔

"آپ جا کر عطیہ آپا کے آئینوں میں اپنی شکل دیکھیں خوامخواہ مجھے کیوں پریشان کرتے ہیں۔" وہ اب وہاں سے جانے کے لیے پر تول رہی تھی۔

"تمہاری "عطیہ آپا" کو ٹیوشن پڑھانے والے لوگ اچھے نہیں لگتے اس لیے میں نے ان سے معذرت کر لی ہے۔ تمہارا تو ساری زندگی انٹر کرنے کا ارادہ نہیں ہے اور میں نے اس کام کی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے لہٰذا مجبوری ہے اب تو تمہیں ہمیشہ ہی مجھ سے ٹیوشن لینی ہو گی۔" وہ لمحوں میں دیوار پھاند کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا اور اب اس کی راہیں مسدود کر رکھی تھیں۔

"پتہ نہیں کیا اول فول بکے جا رہے ہیں۔ ہٹیں سامنے سے ابھی بہت کام ہیں مجھے۔" وہ بے بس ہونے کے باوجود اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔

"بک نہیں رہے بلکہ فرما رہے ہیں۔ اور اب آئندہ بھی ہمیشہ فرمایا ہی کریں گے لہٰذا آپ حد ادب قائم رکھنا سیکھ لیں نیچے اب تک میری امائیں اور بہنیں آپ کے امی ابو کے پاس پہنچ چکی ہوں گی۔"

"کیوں پہنچ گئی ہوں گی؟" کچھ کچھ سمجھنے کے باوجود بھی وہ حیران تھی۔

"پڑوس میں رہنے والے چاند سے مکھڑے کو اپنے گھر لانے کی درخواست

کرنے۔"

"طاہرہ‘ طاہرہ بیٹی جلدی سے نیچے آؤ‘ مہمان آئے ہیں" نیچے سے آتی امی کی آواز نے اسے ٹھیک طرح سے کچھ سمجھنے کا موقع نہ دیا اور وہ محبت میں سیڑھیوں کی طرف بڑھی لیکن فوراً ہی اس کا دایاں ہاتھ رفیع کی گرفت میں آگیا۔ وہ اپنی جیب سے خوبصورت سی انگوٹھی نکال کر اس کی انگلی میں ڈال رہا تھا۔

"عید مبارک ہو تمہیں۔" اس کی سرگوشی طاہرہ کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

"آپ کو بھی" محبوب سے انداز میں جواب دیتی اس کی کسی خوبصورت گستاخی سے پہلے وہ اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے نکال کر نیچے کی طرف سرپٹ دوڑی تھی آخر اسے اپنے ہونے والے سسرالیوں کا سواگت بھی تو کرنا تھا۔

☆☆☆



# کئی چراغ جل گئے

"آئی ایم ویری سوری پھپھو! میں یہ شادی نہیں کرنا چاہتی‘ اس لیے میں عباس سے اپنا رشتہ ختم کر رہی ہوں۔" اپنی انگلی میں موجود انگوٹھی اتار کر اس نے پھپھو کے سامنے ٹیبل پر رکھ دی۔

ڈرائنگ روم جو ابھی تھوڑی دیر پہلے مچھلی بازار بنا ہوا تھا۔ جہاں سے پھپھو کے رعونت آمیز زہریلے فقرے‘ ابا کا کبھی بلند اور کبھی پست ہوتا لہجہ‘ اماں کی پریشانی میں ڈوبی آواز اور صدیق ماموں کی مصالحانہ باتیں باہر لاؤنج تک سنائی دے رہی تھیں یکدم ہی وہاں ایسی خاموشی چھا گئی جیسے جملہ افراد کو کسی نے جادوئی چھڑی کے ذریعے مہر بہ لب کر دیا ہو۔

ان لوگوں کے ردعمل پر بنا کوئی غور کیے اس نے جس پرسکون اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنی بات کہی تھی اسی پرسکون انداز میں وہاں سے باہر نکل گئی۔ اس کے باہر نکلتے ہی گویا کمرے کا منظر ایک بار پھر جاگ اٹھا۔

"اس چھٹانک بھر کی لڑکی کی ہمت جو میرے منہ پر انگوٹھی مار گئی۔ ایسی تربیت کی ہے تم نے اپنی بیٹی کی۔ بڑے گن گائے جاتے تھے اپنی بیٹی کی سمجھ داری اور فرمانبرداری کے میری غنوئی یہ میری غنوئی وہ۔ دیکھ لی آج میں نے تمہاری بیٹی کی صلاحیت۔ شکر ہے کہ ایسی آفت کی پرکالہ کو گھر لے جانے سے پہلے ہی میری جان چھوٹ

گئی ۔اب دیکھتی ہوں کون بیاہنے آئے گا اس بدتہذیب لڑکی کو بلکہ میں تو کہتی ہوں' یہ تو کیا اس کے بعد جو چار بیٹھی ہیں۔ انہیں بھی کوئی نہیں پوچھے گا۔جیسی یہ خود ہے ویسی ہی چھوٹیاں بھی ہوں گی۔اثر تو پڑا ہوگا بڑی بہن کا۔"

پھپھو ایک تو اتر سے بول رہی تھیں' درمیان میں اماں کے بار بار معذرت کرنے کی کوشش بھی اس روانی میں کوئی خلل نہیں ڈال رہی تھی۔

"جا رہی ہوں نصیر بھائی! اب لوٹ کر اس گھر میں نہیں آؤں گی۔آج سے میرا آپ لوگوں سے ہر رشتہ ختم۔آپ کی لاڈو نے جو گل کھلایا ہے' اس کے بعد تعلق رکھنے کی کوئی گنجائش بنتی بھی نہیں ہے۔آپ رکھیے گا ساری زندگی اپنی بیٹی کو اپنے گلے کا ہار بنا کر۔میں تو اس شان اور دھوم سے اپنے بیٹے کی شادی کروں گی کہ دنیا دنگ ہو کر دیکھے گی اور آپ کی بدقسمتی پر افسوس کرے گی۔"

ساکت بیٹھے بھائی کی طرف رخ کرتے انہوں نے اعلان کرنے والے انداز میں اپنے عزائم کا اظہار کیا اور اماں کے روکنے کی کوشش کو خاطر میں نہ لاتی دھب دھب کرتی گھر سے باہر نکل گئیں۔

اماں سے اور کچھ نہ بن سکا تو سر پکڑ کر رونے بیٹھ گئیں۔جب کہ ابا کی خاموشی ہنوز برقرار تھی۔البتہ چہرے پر زلزلے کے آثار دیکھے جا سکتے تھے۔کمرے میں موجود واحد متنفس جس کے چہرے پر اطمینان تھا' صدیق ماموں تھے۔

☆☆☆

"اماں! میں یونیورسٹی جا رہی ہوں ڈگری نکلوانے کے لیے فارم جمع کروانا ہے۔"

"ہاں تو جاؤ بھلا تمہیں اطلاع دینے کی کیا ضرورت' تم خود مختار ہو جو جی چاہے وہ کر سکتی ہو۔" اس نے کچن میں ناشتہ بناتی اماں کو مخاطب کیا تو جواب میں گزشتہ تین دن سے روا رکھے جانے والے رویے کو برقرار رکھتے ہوئے انہوں نے جلی کٹی سنائی۔ غنوی آنکھوں میں آ جانے والے آنسوؤں کو پیتی باہر نکل گئی۔لاؤنج میں ابا بیٹھے اخبار



پڑھ رہے تھے۔

"اچھا ابا! میں جا رہی ہوں' اللہ حافظ۔" وہ کچھ دیر وہاں کھڑی رہی لیکن حسب سابق کوئی جواب نہ آیا' ابا کا رویہ اماں سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھا۔اماں طنز کے تیر برساتی تھیں۔اسے برا بھلا کہتی تھیں' لیکن کم از کم مخاطب تو ہوتی تھیں۔ابا نے تو اس سے کلام ہی ترک کر رکھا تھا وہ خود پر قابو پاتی گھر سے باہر نکل گئی۔

وہ اپنے ماں باپ کی پیاری بیٹی ایک غیر منصفانہ رویے کے خلاف احتجاج کرنے کے جرم میں معتوب ٹھہرادی گئی تھی۔

یونیورسٹی پہنچ کر اپنے مطلوبہ کام کو انجام دینے میں اسے زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔اس نے سوچا کہ کیوں نہ اپنے اساتذہ سے ملاقات کر لی جائے ڈیپارٹمنٹ میں دو تین پروفیسرز تھے جو اس کی ذہانت اور محنت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے اس سے خصوصی سلوک کرتے تھے۔اسے خود بھی اپنے ان اساتذہ سے بے حد لگاؤ تھا۔کچھ اس لگاؤ کی وجہ سے اور کچھ یہ سوچ کر کہ ان میں سے کوئی فرد نوکری کی تلاش میں اس کا مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔وہ ان سے ملنے جا پہنچی باری باری ہر ایک سے ملنے میں اسے کافی وقت لگ گیا تھا وقت کا وہ افسوس نہ کرتی جو اسے اپنے خلوص و محبت کے زیاں کا احساس نہ ہوتا۔دنیا میں کتنی جلدی سب کچھ بدل جاتا ہے۔وہی ڈیپارٹمنٹ جہاں اس نے پورے دو سال گزارے تھے یکدم ہی اجنبی سا لگنے لگا تھا نئے چہرے تھے جنہوں نے خالی جگہوں کو پر کر دیا تھا۔وہ پروفیسر جو کل تک اس کی تعریفیں کرتے تھے اب نئے اسٹوڈنٹس کی تعریفوں میں رطب اللسان تھے غنوی نصیر اگرچہ انہیں بھولی نہیں تھی لیکن وہ اب اتنی اہم بھی نہ رہی تھی۔

اس کا دل یوں بھی اداس ہی تھا شاید اس لیے اس نے اور زیادہ محسوس کیا تھکی تھکی سی وہ گھر لوٹ آئی۔

"آپی! آپ کا فون ہے۔نوشابہ باجی بات کریں گی۔"

پیروں کو سینڈلز کی قید سے آزاد کر کے وہ تھوڑا سا ریلیکس ہوئی ہی تھی کہ سونیا

نے اسے اطلاع دی۔ خود کو فضول باتوں کے لیے تیار کرتی وہ ٹیلی فون اسٹینڈ تک آئی۔

"السلام علیکم' کیا حال ہے نوشابہ! خیریت سے ہو۔" وہ باوجود کوشش کہ اپنے لہجے کی بیزاری پر مکمل قابو نہیں پا سکی تھی۔

"میں تو الحمدللہ ٹھیک ہوں۔ لیکن تمہیں کیا ہوا۔ تمہاری آواز کچھ اداس اداس سی لگ رہی ہے۔" نوشابہ کا پرتجسس لہجہ اس کی سماعتوں سے ٹکرایا تو وہ جھنجھلایا سی گئی۔ وہ یقیناً اس کی اور عباس کی منگنی ٹوٹنے سے باخبر ہو چکی تھی اور اب بہانے سے مزید تفصیلات جاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

"میں ہرگز بھی اداس نہیں ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے یونیورسٹی سے واپس آئی ہوں اس لیے شاید تھکن کی وجہ سے آواز صحیح طرح نہیں نکل رہی۔" اس نے نوشابہ کے اندازہ کی پرزور تردید کی۔

"ہو سکتا ہے' تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" نوشابہ کا لہجہ "میں نہ مانوں" کا عکاس تھا۔

"ایک بات پوچھوں غنوی؟" بظاہر اس نے بہت جھجک کر پوچھا تھا لیکن غنوی جانتی تھی کہ اس کے فون کرنے کا مقصد کیا ہے۔

"ہاں پوچھو۔" اس نے نوشابہ کے سوالوں کے لیے خود کو تیار کیا۔ بہر حال اسے اس سچویشن سے اب بار بار نمٹنا تھا۔

"پھپھو آئی تھیں کل رات' امی سے کہہ رہی تھیں کہ انہوں نے تمہارا اور عباس بھائی کا رشتہ ختم کر دیا ہے۔"

"رشتہ انہوں نے نہیں بلکہ خود میں نے توڑا ہے۔" غنوی نے حقیقت بتائی۔

"چلو' جو بھی ہوا۔ لیکن تمہیں دکھ تو ہوا ہوگا۔ آخر پانچ سال سے تم دونوں کا رشتہ طے تھا۔" نوشابہ نے ٹوہ لینا چاہی۔

"جو بات ختم ہو گئی' اس پر مزید گفتگو کرنا بے کار ہے نوشابہ! کیوں نہ ہم کوئی اور بات کریں۔" اپنے دل کی خبر اتنی آسانی سے دینے والی نہیں تھی غنوی نصیر۔

"اچھا یہ بتاؤ یونیورسٹی کیوں گئی تھیں۔ اب تو تمہارا رزلٹ بھی آچکا۔"



"ڈگری نکلوانا تھی۔" غنوی نے مختصراً وجہ بیان کی۔

"پھپھو کہہ رہی تھیں غنوی بہت دیدہ ہوائی ہو چکی ہے۔ جانے اس نے یونیورسٹی میں کون کون سے چکر چلا رکھے ہیں اس لیے اب عباس کو گھاس نہیں ڈال رہی۔ تم بتاؤ ناں' اصل بات کیا ہے۔" سارا تجسس ہی اس اصل بات کو جاننے کے لیے تھا جو سرے سے تھی ہی نہیں۔ ورنہ غنوی کے اس انتہائی قدم کے پیچھے جو سبب تھا اس سے خاندان بھر ہی واقف تھا۔

"نوشابہ! میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔ صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں۔ پلیز برا مت ماننا' میں فون بند کر رہی ہوں۔" خود پر بہت ضبط کرتے اس نے نوشابہ سے کہا اور فون بند کر دیا۔

☆☆☆

"پھپھو عباس کی شادی کہیں اور کر رہی ہیں۔" اسریٰ آپی نہایت افتاں وخیزاں میکے پہنچی تھیں۔

"تو کرنے دیں۔" کشنز کو ترتیب سے رکھتے اس نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا......؟" پانچ سال تک تمہیں اپنا پابند رکھنے کے بعد وہ کسی دوسری جگہ اپنے بیٹے کی شادی کر رہی ہیں اور تمہیں پرواہ ہی نہیں۔" انہیں اس کی بے پرواہی بری طرح کھٹکی تھی۔

"پانچ دن پہلے میں اپنے آپ کو اس پابندی سے آزاد کر چکی ہوں۔" اپنے لہجے کے اطمینان کو برقرار رکھتے ہوئے وہ ان کے برابر میں آبیٹھی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا......؟" وہ حیران تھیں۔

"آپ کو جن لوگوں نے عباس کی شادی کی اطلاع دی ہے۔ انہوں نے میری اور اس کی منگنی ٹوٹنے کی خبر نہیں دی۔"

"مجھے یہ اطلاع ناصر نے دی ہے۔ شمس اور وہ ایک ہی انسٹیٹوٹ سے بی سی

ایسی کر رہے ہیں۔کل شمس نے اپنے کلاس فیلوز میں عباس کی انگیجمنٹ کی مٹھائی بانٹی ہے اور پندرہ دن بعد شادی کی دعوت بھی دی ہے۔ناصر نے گھر آکر مجھے یہ ساری باتیں بتائیں تو میرا سر گھوم گیا' تم جانتی ہو میرے سسرال والوں کو۔ذرا ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہیں۔کل سے عجیب وغریب باتیں کر کر کے میرا جینا دوبھر کر دیا ہے۔'' اسریٰ حد درجہ پریشان تھی۔

''اچھا جب ہی آج انہوں نے صبح صبح آپ کو میکے روانہ کر دیا کہ جاؤ اور ساری تفصیل لے کر آؤ تا کہ وہ لوگ صحیح سے لطف اندوز ہو سکیں۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی غنویٰ کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

''وہ لوگ جیسے بھی ہیں اور جو بھی ان کی نیت ہو لیکن میں تو اس گھر کی بیٹی ہوں مجھے تو یہ حق ملنا چاہیے کہ مجھے اپنے میکے میں ہونے والے اتنے بڑے حادثے کی خبر دی جائے پانچ دن ہو گئے تمہاری منگنی ٹوٹے' پھپھو نے عباس کے لیے لڑکی تلاش کر کے شادی کی ڈیٹ بھی فکس کر دی اور مجھے کچھ معلوم ہی نہیں۔شادی کیا ہوئی ہے میری' تم لوگوں نے مجھے بالکل غیر ہی بنا ڈالا۔'' اب وہ بالکل روہانسی ہو گئی تھی۔

''ایسی بات نہیں ہے آپی! ہمیں معلوم ہے' آپ پہلے ہی اتنی مشکلوں اور پریشانیوں میں ہیں اور اس پر سے ہم یہاں کی الجھنیں بھی آپ کو بتائیں تو کیا یہ اچھا لگتا ہے۔''

اس نے گلے میں ہاتھ ڈال کر بڑی بہن کی دل جوئی کی۔ویسے وہ شکر ادا کر رہی تھی کہ اس وقت وہ گھر میں تنہا ہے۔چھوٹی چاروں بہنیں اپنے اسکول اور کالج اور ابا آفس گئے ہوئے تھے۔اماں بھی سودا سلف لینے مارکیٹ تک گئی تھیں۔اسریٰ آپی کا دیورا نہیں چھوڑنے آیا تو صرف وہ ہی گھر میں تھی ان کی صورت دیکھتے ہی وہ سمجھ گئی کہ اتنی ایمرجنسی میں آپی کو میکے بھیجنے کی کیا وجہ ہے۔ورنہ جب سے شادی ہوئی تھی ابا ہی بیٹی کو لانے لے جانے کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔یاسر بھائی تو چند ایک بار دعوتوں کی حد تک ہی یہاں آئے تھے۔



''آپی! آپ کو یہ تو پتا ہے نا کہ پھپھو مہینہ بھر سے ابا کے پیچھے لگی تھیں کہ انہیں اگلے مہینے شادی کی تاریخ دے دی جائے۔'' بالآخر اس نے بہن کو تفصیلات بتانا شروع کیں۔

''اور آپ یہ بھی جانتی ہیں کہ ابا اس وقت ایسی پوزیشن میں نہیں ہیں کہ شادی کے اخراجات برداشت کر سکیں۔جب آپ کی شادی ہو رہی تھی تو ابا نے پھپھو پر کتنا زور دیا کہ وہ بھی آکر تاریخ لے لیں تا کہ ابا دونوں بیٹیوں کے فرض سے ایک ساتھ سبکدوش ہو جائیں' لیکن اس وقت پھپھو نے ہامی بھر کر نہیں دی۔یہی کہتی رہیں کہ ابھی عباس سیٹ نہیں ہے اور وہ فی الحال شادی نہیں کر سکتیں۔حالانکہ عباس ٹھیک ٹھاک جاب کر رہا تھا' اور پھپھو کے گھر میں بھی ہر طرح کی سہولت موجود ہے لیکن بہرحال ابا نے ان کی معذرت قبول کر لی' لیکن آپ کی شادی کے دو مہینے بعد ہی پھپھو نے ابا سے مطالبہ شروع کر دیا کہ غنویٰ کی رخصتی کی تاریخ دے دو۔ابا اس وقت ملا جلا کر ہم دونوں کی شادی کرتے تو انتظامات ہو سکتے تھے لیکن اب تو وہ بالکل خالی ہاتھ ہیں۔خاص طور پر ایسی صورت میں کہ انہیں آپ کی شادی پر ایسے بہت سے اخراجات کرنے پڑے جن کا انہیں سرے سے کوئی اندازہ ہی نہیں تھا۔اور پھپھو سب کچھ جانتے بوجھتے ابا کو پریشرائز کر رہی تھیں۔
اس لیے مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔مسلسل ایک مہینے سے چلنے والی بحث اور ٹینشن کو میں نے اپنے فیصلے سے ختم کر دیا۔''

غنویٰ کی زبانی تفصیلات سن کر اسریٰ کا سر جھک گیا۔حالانکہ قصور اس کا نہیں تھا لیکن وہ اپنے میکے والوں کے سامنے خود کو شرمندہ پاتی تھی۔یاسر کے گھر والوں نے آخری دنوں میں آنے بہانے کئی مطالبات پورے کروائے تھے اور رخصتی والے روز یاسر کی طرف سے کی گئی بائیک کی فرمائش کو پورا کرنے میں تو ابا کی رہی سہی جمع پونجی بھی خرچ ہو گئی تھی ایسے میں وہ بہن کا مطالبہ پورا کرتے ہوئے غنویٰ کی شادی کی تاریخ دیتے تو کیوں کر' کم از کم ڈیڑھ دو سال تو لگنا تھے ان جیسے سفید پوش شخص کو انتظامات کرنے میں۔

''تم عباس سے بات کرتیں غنویٰ! آخر وہ تمہیں اتنا چاہتا تھا۔پھپھو کو تمہاری

ناطر سمجھا لیتا۔" کچھ دیر بعد سر اٹھاتے اسریٰ نے غنویٰ سے کہا۔

"عباس کی چاہت کو جانچ کر ہی اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا آپی!" اس کے لہجے میں آزردگی اتر آئی۔

"کتنی التجا کی تھی اس سے کہ وہ پھپھو کو سمجھائے۔ لیکن اسے اچانک ہی لگنے لگا تھا کہ اب وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے اس کے جذبے کی قدر کی اور یہاں تک کر گئی کہ اس سے کہا کہ اگر شادی کی ایسی ہی جلدی ہے تو تم بغیر کسی دھوم دھام کے چند لوگوں کے ساتھ آکر مجھے رخصت کروا کر لے جاؤ' لیکن پتا ہے اس نے کیا کہا۔ اس نے کہا کہ غنویٰ! تم بے وقوف ہو۔ اسریٰ اتنا کچھ سمیٹ کر لے گئی ہے اور تم چاہتی ہو کہ میں خالی ہاتھ اٹھ کر آجاؤں۔ ٹھیک ہے' میں یاسر جتنا کمینہ نہیں کہ ڈیمانڈز کروں' لیکن پہلی بیٹی کو جو کچھ دے کر ماموں نے روایت قائم کی ہے وہ تو انہیں اب ہر بیٹی کی دفعہ نبھانی پڑے گی۔ اگر ان کے پاس رقم نہیں ہے تو وہ ریٹائرمنٹ لے لیں۔ فنڈز وغیرہ سے اتنا تو ہو ہی جائے گا کہ وہ شادی کے انتظامات کر سکیں۔"

"غنویٰ کی پلکیں بھیگ رہی تھیں اور اسریٰ دم بخود بیٹھی سب کچھ سن رہی تھی۔
عباس کا یہ کون سا روپ تھا جس سے وہ لوگ کبھی باخبر ہی نہ ہو سکے تھے۔

"عباس سے اپنا رشتہ جڑنے کے بعد پانچ سالوں میں میں نے اسے اتنا نہیں جانا تھا۔ جتنا اس پانچ منٹ کی ٹیلیفونک گفتگو میں جان گئی اور ان پانچ سالوں میں۔ میں نے اس سے اتنی محبت نہیں کی تھی جتنی ان پانچ منٹوں میں میرے دل میں اس کے لیے نفرت پیدا ہوئی۔ میں نے اس سے کہا کہ عباس! تمہیں جو کچھ کہنا تھا تم کہہ چکے' اب تم میرے فیصلے کا انتظار کرو۔ اور اس دن جب پھپھو نے یہاں آکر ابا اور اماں کے سامنے اپنا مطالبہ ایک بار پھر دہرایا تو مجھے فیصلہ سنانے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ آج ابا اور اماں مجھ سے ناراض ہیں۔ لوگ میرے بارے میں طرح طرح کی باتیں بنا رہے ہیں لیکن میں مطمئن ہوں کہ میں نے ایک صحیح فیصلہ کیا ہے۔ بے شک آپ لوگ مجھے نافرمان کہیں لیکن مجھے فرمانبرداری کا مظاہرہ کر کے ایسی خوشیاں حاصل کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں جن



کے حصول کے لیے مجھے اپنی چھوٹی بہنوں کی گردنوں پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہونا پڑے۔ آپ کے خیال میں اگر عباس کا مشورہ مانتے ہوئے ابا ریٹائرمنٹ لے لیتے تو کیا میں کبھی اپنے آپ کو معاف کر پاتی' چھوٹی چاروں ابھی پڑھ رہی ہیں۔ انہیں گھر والوں کی سپورٹ کی ضرورت ہے۔ ابا اگر بے روزگار ہو جائیں تو یہ سپورٹ کون فراہم کرے گا۔ بلکہ اب میں فیصلہ کر چکی ہوں کہ میں خود جاب کروں گی اور ابا کا سہارا بنوں گی۔" وہ بہت عزم سے بول رہی تھی اسریٰ کو بے ساختہ ہی اپنی بہن پر پیار آ گیا۔

"اللہ تمہاری مدد کرے اور تمہارا حوصلہ ہمیشہ یوں ہی بلند رہے۔ میں تو اپنی بزدلی اور کم ہمتی کے ہاتھوں سدا تم لوگوں کے سامنے شرمندہ ہی رہوں گی۔" اس نے بہت دل سے غنویٰ کو دعا دیتے ہوئے آزردگی سے کہا۔

"نہیں آپی! ایسی کوئی بات نہیں' آپ کیوں شرمندہ ہوتی ہیں۔ آپ کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں آپ کا کیا قصور' آپ نے تو بڑوں کے فیصلے پر سر ہی جھکایا تھا۔ دھوکا تو یاسر بھائی کے گھر والوں نے کیا ہمارے ساتھ اور ہماری بدقسمتی کہ حقائق جان نہیں پائے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا بیٹا گریجویٹ ہے ہم نے مان لیا انہوں نے یاسر بھائی کو جنرل اسٹور کا مالک بتایا اور ہم انہیں وہاں دیکھ کر واقعی مالک سمجھ بیٹھے۔ پتا ہی نہیں چلا کہ وہ وہاں صرف ایک ملازم ہیں۔ بس ایسے ہی وقت میں بھائی کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ بے چارے ابا اکیلے کیا کچھ کرتے۔ عباس سے کہا تھا کہ معلومات کروا دو اور اس نے کہا سب کچھ ٹھیک ہے۔ عباس کی غیر ذمہ داری اور بے حسی کا اندازہ آپ اسی واقعے سے لگا سکتی ہیں۔ اس نے اتنی بے پروائی دکھائی اس معاملے میں کہ سوچا ہی نہیں اس کے اس عمل سے کسی کی پوری زندگی تباہ ہو جائے گی اس کی وجہ سے یاسر بھائی جیسا ایک داماد اس گھر کو مل گیا۔ کافی ہے وہ خود بھی اس لسٹ میں شامل ہو جاتا تو ابا کے سر سے بوجھ کم ہونے کے بجائے کچھ اور بھی بڑھ جاتا۔"

"اچھا چلو غصہ تھوک دو اور میرے لیے ایک کپ مزے دار سی چائے بنا دو۔ ابھی امی سودا لے کر آتی ہیں تو میں تم لوگوں کے لیے اپنے ہاتھ سے کھانا بناتی ہوں۔"

اسریٰ جانتی تھی کہ اس کے گھر والوں کو اس کے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی کا بہت دکھ ہے۔لیکن وہ کیا کرتی۔گلے پڑا ڈھول تو اب بجانا ہی تھا مڈل کلاس گھر میں جہاں صرف لڑکیاں ہی لڑکیاں ہوں' بڑی بہن کی شادی کی ناکامی چھوٹی بہنوں کے مستقبل پر بھی اثر انداز ہوتی ہے اور وہ یاسر سے نباہ کر کے اپنی بہنوں کا مستقبل محفوظ رکھنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

''حمیدہ! اس سے کہو کہ میرے سامنے نہ آیا کرے۔ایسی نافرمان اولاد کو دیکھ کر میرا خون کھولتا ہے۔''وہ ابا کے سامنے کھانے کی ٹرے رکھ کر پلٹی تو اس نے اپنے پیچھے انہیں اماں سے کہتے سنا۔

''اب جانے دیجیے جو ہونا تھا' وہ تو ہو ہی چکا۔وہ تو بچی ہے جذباتی ہوگئی لیکن آپ کی بہن نے تو لمحوں میں رشتے ناتے توڑ ڈالے۔''

وہ خود بھی بے شک بیٹی کے عمل سے ناخوش تھیں لیکن نند سے اس قدر بے مروتی کی بھی امید نہ تھی۔

''ہر بار بیٹی کی پیدائش پر لوگ مجھ پر افسوس کرتے لیکن میں نے کبھی اپنا دل تنگ نہیں کیا۔سوچتا تھا چھ بیٹیاں ہیں۔دامادوں کی شکل میں چھ بیٹے مل جائیں گے۔لیکن میری تو قسمت ہی خراب ہے بڑا داماد ہے تو دردِ سر عباس سے امید تھی کہ میرا سہارا بنے گا۔میرا بھانجا ہے' سگے بیٹوں کی طرح پیارا ہے مجھے' لیکن تمہاری بیٹی کی بدزبانی نے اسے ہمیشہ کے لیے مجھ سے دور کر دیا۔کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ عباس دولہا بنے گا اور میں اُسے دیکھ بھی نہیں سکوں گا۔''

ابا کہہ رہے تھے اور باہر کھڑی وہ آنسو بہا رہی تھی۔بے شک اس نے بہت سوچ سمجھ کر عباس سے اپنا رشتہ ختم کیا تھا لیکن اتنا آسان نہیں تھا یہ سہنا کہ وہ شخص جس کے نام کی انگوٹھی پانچ سال تک اس کی انگلی میں رہی تھی' آج بارات لے کر کسی اور کی دہلیز پر پہنچا ہوا تھا اس پر ماں باپ کی ناراضی ستم بالائے ستم تھی۔اسریٰ نے چاہا بھی کہ ابا



کے دل سے غنویٰ کے لیے غلط فہمی کو دور کر سکے لیکن ابا اس معاملے میں کچھ سننے کو تیار ہی نہیں تھے۔ان کی فطرت ہی ایسی تھی جب کسی بات پر ضد میں آجاتے تو پھر کسی کی نہیں سنتے تھے۔اب بھی ان کے لیے غنویٰ کے عمل کے پیچھے موجود اسباب سے زیادہ اہم یہ بات تھی کہ غنویٰ نے ان کے ہوتے ہوئے خود سے فیصلہ سنا کر ان کی حیثیت کو چیلنج کیا ہے۔ان کے نزدیک یہ سرکشی تھی جسے وہ کسی صورت معاف کرنے کو راضی نہیں تھے۔

☆☆☆

''آپی! پلیز تھوڑا سا کھالیں۔کل سے آپ نے کچھ نہیں کھایا۔خالی پیٹ دوا کیسے لیں گی۔''طوبیٰ دلیے کا پیالہ لیے اس کے سرہانے بیٹھی تھی۔

''میرا دل نہیں چاہ رہا گڑیا! کچھ بھی کھانے کا۔''بے بسی سے کہتے اس نے بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔دو دن سے اسے شدید بخار نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا مسلسل ذہنی دباؤ کا کچھ نہ کچھ نتیجہ تو سامنے آنا ہی تھا۔

''شاید ماموں آئے ہیں۔''لاؤنج سے سنائی دیتی آوازوں سے طوبیٰ نے اندازہ لگایا اور کمرے سے نکل گئی۔البتہ غنویٰ ہنوز اپنی سابقہ پوزیشن میں ہی لیٹی رہی تھی۔

''ارے میں یہ کیا سن رہا ہوں' میری اتنی بہادر بیٹی ذرا سے بخار سے گھبرا کر بستر پکڑ بیٹھی ہے۔''تھوڑی ہی دیر بعد اسے ماموں کی آواز اپنے قریب سنائی دی۔تو آنکھوں پر سے بازو ہٹا کر شرمندہ شرمندہ سی اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔

''لیٹی رہو بھئی ہم نے تو یوں ہی جوش دلانے کو کہا تھا ورنہ سب نارمل لوگ بیماری میں بستر ہی سنبھالتے ہیں۔''ماموں اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر ایک قریبی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

''لیکن سارے بیمار لوگ اتنا تنگ نہیں کرتے جتنا آپی نے کر رکھا ہے۔گھنٹہ بھر سے خوشامد کر رہی ہوں کہ کچھ کھالیں مگر مجال ہے جو یہ اس معصوم بندی کے بصد اخلاص بنائے گئے دلیے کو شرف قبولیت بخشیں' خاص طور پر اس بہن کی خاطر کالج سے

چھٹی کی ہے لیکن انہیں کوئی قدر ہی نہیں۔" طوبیٰ نے جھٹ ماموں سے شکایت کی۔

"تو تم نے آخر بھی کی تو دلیے کی۔ ایک تو پہلے ہی بخار میں منہ کا ذائقہ خراب رہتا ہے اس پر سے ایسی بے رنگ و بے ذائقہ ڈش ...... ہوتی کوئی بریانی' کباب کی پیشکش تو میری بیٹی قبول بھی کرتی۔ لیکن خیر تم جیسی نکمی لڑکی سے ایسی امید لگانا بھی بے کار ہے۔ لاؤ دو ہم کھلاتے ہیں اپنے ہاتھ سے اپنی بیٹی کو' تمہارے ہاتھ کا دلیہ بھی مزیدار حلیم کا ذائقہ نہ دینے لگے تو نام بدل دینا۔" وہ اپنے ازلی شگفتہ لہجے میں بولے تو طوبیٰ ان کے ہاتھ میں دلیے کا پیالہ پکڑا کر مطمئن سی باہر نکل گئی۔ معلوم تھا کہ ماموں اپنی کہی بات پر عمل بھی کر دکھائیں گے۔

"چلو بھئی۔ منہ کھولو۔" ماموں نے حکم دیا تو غنویٰ انکار نہیں کر سکی۔

"بس ماموں۔" دو چار چمچوں کے بعد ہی اس نے انہیں روک دیا۔

"چلو تم کہتی ہو تو بس کیے دیتے ہیں۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ یہ اٹوائی کھٹوائی لیے کیوں پڑی ہو۔" انہوں نے پیالہ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

غنویٰ جو پہلے ہی رقیق القلب ہو رہی تھی ان کے سوال پر بنا جواب دیے آنسو بہانے لگی۔

"کتنا فرق ہے اس آنسو بہاتی لڑکی اور اس دن بہادری سے فیصلہ سناتی لڑکی میں میں تمہیں ایسا بزدل تو نہیں سمجھتا تھا۔ بیٹی! حق بات کہنے والے تو بڑے حوصلے مند ہوتے ہیں۔"

"میرے حوصلے کو میرے اپنوں کی بے رخی نے توڑ ڈالا ہے ماموں!" وہ بلک اٹھی۔

"نہ بچے! یوں اتنی جلدی تمہارا حوصلہ نہیں ٹوٹ سکتا۔ میں جانتا ہوں میری سب بھانجیوں میں سب سے اسٹرانگ ہو تم' بس یہ ہے کہ ابھی چوٹ گہری لگی ہے تو تمہیں اپنے حوصلے کی بلندیوں کو جج کرنا نہیں آ رہا۔ لیکن میں جانتا ہوں۔ تم اس فیز سے



نکلو گی تو ایک بار پھر حالات کے سامنے سینہ سپر ہو جاؤ گی۔ میں تم سے بس یہی کہنے آیا ہوں کہ اپنے آپ کو اور اپنی صلاحیتوں کو پہچاننے میں غلطی ہرگز نہیں کرنا۔ یہ جو فیز تمہاری زندگی میں آیا ہے اس سے جلد از جلد نکل آؤ پھر دیکھنا تم کیا کچھ کرنے کی اہلیت رکھتی ہو۔" وہ اسے حوصلے کی کمک دے کر باہر نکل آئے۔ لاؤنج میں حمیدہ بیٹھی تھیں۔

"نہ جانے کس کی نظر لگ گئی' میری بچی کو خوشیوں کو۔" بھائی کو دیکھتے انہوں نے آزردگی سے کہا اور نم آنکھیں دوپٹے سے پونچھنے لگیں۔

"کوئی نظر وزر نہیں لگی۔ اس نے بالکل صحیح وقت پر ایک صحیح فیصلہ کیا ہے اور آپ اور بھائی صاحب بے کار کی ناراضی جتا کر اسے پریشان کر رہے ہیں۔" بہن کے آنسوؤں کو خاطر میں نہ لاتے۔ وہ قدرے خفگی سے بولے۔

"ہاں بھیا! بس ایک تم انقلابی ہو' دوسری تمہاری بھانجی بھلا اچھی لگتی ہے لڑکی ذات کی یوں کتر کتر چلتی زبان۔" جواباً انہوں نے بھی ناراضی کا اظہار کیا۔

"بات انقلابی ہونے کی نہیں۔ حق پر ہونے کی ہے۔ رہی لڑکی ذات کے بولنے کی بات تو اگر اس معاملے میں کوئی قباحت ہوتی تو اللہ تعالیٰ عورت کے منہ میں زبان ہی نہ دیتے غنویٰ کوئی زبان دراز یا بدتہذیب لڑکی نہیں بلکہ بہت سمجھ دار اور حساس بچی ہے۔ جسے آپ لوگوں کے رویے نے اس حال کو پہنچا دیا ہے۔" انہوں نے دو بدو بہن کو جواب دیا۔ پھر ذرا لہجے کو نرم کرتے ہوئے بولے۔

"آپا! جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ بھائی صاحب کو سمجھانا مشکل ہے لیکن آپ ماں ہیں۔ بیٹی کے دل کا حال سمجھ سکتی ہیں۔ وہ پہلے ہی تکلیف میں ہے اس پر سے آپ کے رویے اسے بالکل ہی توڑ دیں گے۔ خدانخواستہ اسے کچھ ہو گیا تو کیا آپ سہہ لیں گی۔" وہ ان پر جذباتی وار کر رہے تھے۔

"خیر کا کلمہ بولو صدیق!" آخر حمیدہ بانو کی ممتا جاگ ہی اٹھی۔

"بس تو پھر طے ہو گیا کہ میں غنویٰ کو چند دن کے لیے اپنے گھر لے جا رہا ہوں' وہاں اپنی ممانی اور چھوٹے بھائیوں کے ساتھ بہل جائے گی۔ پھر میں اسے واپس

یہاں چھوڑ جاؤں گا۔ لیکن آپ وعدہ کریں کہ اس کے ساتھ بالکل نارمل طریقے سے پیش آئیں گی۔ اور کوشش کریں کہ بھائی صاحب کا مزاج بھی ٹھنڈا ہو جائے۔" بہن کو نرم پڑتے دیکھ کر انہوں نے اپنا طے کردہ پروگرام سنا ڈالا۔

"ٹھیک ہے لے جاؤ۔ رہی رویہ ٹھیک کرنے کی بات تو اپنی تو میں گارنٹی دے سکتی ہوں' البتہ اس کے باپ کا ذمہ نہیں لے سکتی۔ وہ اپنی مرضی کے بادشاہ ہیں جنہیں سمجھنا کسی کے بس کی بات نہیں۔" انہوں نے صاف جواب دیا۔

"چلیں اتنا بھی بہت ہے' غنویٰ صحت یاب ہو جائے تو میں نے اپنے ایک جاننے والے کے توسط سے اس کے لیے ایک اخبار کے دفتر میں نوکری کی بات کر رکھی ہے۔ ذہنی مصروفیت ملے گی اور گھر کے ماحول سے نکلے گی تو سب کچھ خود بخود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔" صدیق احمد مطمئن اور پُر امید تھے۔

☆☆☆

صدیق ماموں نے ٹھیک کہا تھا' وہ واقعی سنبھل گئی تھی۔ اخبار کے دفتر میں نوکری اتنی مصروف اور ہنگامہ خیز تھی جو کہ اسے کچھ سوچنے کی مہلت ہی نہ ملتی صرف ابا کی خاموشی ہی اس کے لیے بوجھ تھی لیکن صدیق ماموں کی تسلیاں دل کو ڈھارس دیتی تھیں' انہوں نے کہا تھا۔

"دیکھو بیٹا! تمہارے باپ کے مزاج میں ضد کا عنصر کچھ ضرورت سے زیادہ ہے۔ وہ مانتے نہیں ورنہ جانتے وہ بھی ہیں کہ ان کی بیٹی غلط نہیں' لیکن ایسا ہمیشہ نہیں رہے گا۔ وہ ساری زندگی تم سے ناراض نہیں رہ سکتے۔

ایک نہ ایک دن نرم ہو ہی جائیں گے۔ ماں باپ کبھی بھی ساری زندگی کے لیے اپنی اولاد سے ناراض نہیں رہ سکتے۔ ابھی بس یہ ہے کہ انہیں ٹھیس لگی ہے۔ لیکن جس دن انہیں یقین آ گیا کہ ان کی بیٹی خود سر نہیں اور نہ ہی ان کے اختیارات کو چیلنج کر رہی ہے تو وہ راضی ہو جائیں گے۔ بس تم ناامید نہیں ہونا۔"

اور وہ نئے عزم سے زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینے کے لیے تیار ہو



گئی تھی اپنی اعلیٰ ہمتی کام کرنے کی اہلیت اور تخلیقی صلاحیتوں کے باعث بہت جلد اس نے خود کو اپنے دفتر میں بھی منوا لیا تھا۔ اس کی تنخواہ کی صورت گھر میں آنے والی اضافی آمدنی اماں کے لیے سکون کا باعث تھی۔ ابھی نہیں اپنی پانچ بیٹیوں کا جہیز جوڑنا تھا۔ چھوٹی بہنیں بھی خوش تھیں کہ اب ان کی معصوم سی بے ضرر خواہشات آپی پورا کر دیا کرتی تھیں۔

"غنویٰ! بیٹا آفس سے واپسی میں ذرا اسریٰ کی خبر لیتی آنا۔ بہت دن ہوئے اس نے یہاں چکر نہیں لگایا۔ تمہارے ابا کے دفتر میں آج کل کام زیادہ ہے اس لیے ان سے نہیں کہا۔ یوں بھی اس کے سسرال والے دس باتیں سنا کر اسے ان کے ساتھ بھیجتے ہیں۔ بے چارے ٹینشن میں آ جاتے ہیں کہ بیٹی کی زندگی کا فیصلہ صحیح نہیں کر سکے۔ میرا تمہیں معلوم ہے اکیلی ہوں میں آنے جانے سے گھبراتی ہوں۔" صبح وہ ناشتہ کر رہی تھی تو اماں نے اس سے کہا۔

"اچھا' آپ فکر نہ کریں۔ میں چلی جاؤں گی۔" اماں کو تسلی دے کر وہ بیگ کندھے سے لٹکا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ڈھنگ سے ناشتہ تو کر لیا کرو' آفس میں بھی اللہ جانے کچھ کھاتی ہو یا نہیں۔ کام کرتے ہوئے تو تمہیں یوں بھی ہوش کھو دینے کی عادت ہے۔" اماں اسے یوں اٹھتے دیکھ کر بڑبڑائیں تو وہ ہنس کر خدا حافظ کہتی باہر نکل گئی۔ گھر سے سب سے آخر میں وہی نکلا کرتی تھی جب کہ ابا اور باقی بہنیں صبح صبح چلے جاتے تھے۔

"ذرا گنجائش نکلے تو اسریٰ آپی کے لیے ایک موبائل فون خرید دوں گی۔ کم از کم گھر بیٹھے خیر خبر تو لی جا سکے۔ ان کے سسرال کا تو دستور ہی نرالا ہے۔ گھر میں فون نہیں لگاتے۔ سب نے اپنے اپنے موبائل رکھے ہوئے ہیں۔ ایک بہو بیچاری ہی خوار ہے۔" آفس میں اپنے کام نمٹاتے بھی اس کے ذہن پر اسریٰ آپی ہی سوار تھیں۔

"ضیاء! آج مجھے جلدی جانا ہے۔ پلیز تم یہ صائمہ خان کے انٹرویو کو فائنل کر دینا۔ سب کام میں نے کر لیے ہیں۔ فوٹوگرافس آ جائیں تو ان میں سے دو چار اچھے پوز سلیکٹ کر کے ساتھ میں لگا دینا۔" اپنی ڈیسک سے چیزیں سمیٹ کر بیگ میں ڈالتے

اس نے ضیاء سے ملتجی لہجے میں کہا۔

''آپ کے اس عاجزی بھرے لہجے پر تو لوگ چندہ دینے سے انکار نہ کریں۔ میں یہ ذرا سا کام کرنے سے کیونکر منع کر سکتا ہوں۔'' ضیاء کا بات کرنے کا اپنا ہی ڈھنگ تھا۔

''بکواس مت کرو۔'' وہ جھینپ گئی۔

''ضیاء کو بکواس کرنے کے سوا آتا ہی کیا ہے۔'' سامنے بیٹھی سمیرا نے فقرہ کسا۔

''جی واقعی' کم از کم مس سمیرا جیسا میک اپ کرنا تو ہرگز نہیں آتا۔'' ضیاء کب چوکنے والا تھا۔ سمیرا کے جما جما کر کیے گئے میک اپ کو نشانہ بنایا۔

''تم سچ مچ بہت بکواس کرتے ہو ضیاء!'' غنوی ہنس پڑی۔

''شہزاد! ذرا نیچے سے کچھ پھل وغیرہ تو لے لو۔ میں بھی بس آرہی ہوں۔ تم رکشہ روک لینا۔'' دفتر میں اوپر کے کاموں پر فائز لڑکے کو پیسے پکڑاتے اس نے ہدایت دی۔

''خیریت کہیں' ہسپتال وغیرہ جارہی ہو۔'' سمیرا نے اندازہ لگایا۔

''نہیں' بس یہیں آپی کے گھر تک جانا ہے خالی ہاتھ جانا اچھا نہیں لگتا۔ اس لیے سوچا پھل ہی لے جاؤں۔'' اس نے علاقے کا نام بتاتے وضاحت دی۔

''اگر آپ کہیں تو میں ڈراپ کردوں۔ صرف دس منٹ لگیں گے۔'' ضیاء نے پیش کش کی۔

''اور میری آپی کی ساس کو بھی کم سے کم دس دن لگیں گے یہ بات بھولنے میں کہ میں کسی لڑکے کے ساتھ ان کے گھر آئی تھی۔'' زیر لب بڑبڑاتے اس نے ضیاء کی آفر کو مسکرا کر رد کیا اور سامان سمیٹ کر آفس سے نکل گئی۔

''ارے تم یہاں کیسے؟ اکیلی آئی ہو۔'' آپی کے گھر پہنچی تو وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

''جب آپ مہینہ بھر اپنی خبر نہیں دیں گی تو ایسا تو کرنا پڑے گا۔'' پھلوں کے



تھیلے انہیں تھماتے اس نے پیار سے شکوہ کیا۔

''ہاں' بس فرصت ہی نہیں ملتی۔'' ایک ہاتھ سے اپنے بکھرے بالوں کو سمیٹنے کی کوشش کرتے وہ یاسیت سے مسکرائیں۔

''یہ تو مجھے بھی دکھائی دے رہا ہے۔'' وہ ابھی تک بہن کے ساتھ صحن میں ہی کھڑی تھی جہاں ایک طرف لگی واشنگ مشین اور رسیوں پر سوکھنے کے لیے ڈالے گئے ڈھیروں کپڑے اسریٰ کی مصروفیت کی پوری داستان سنا رہے تھے۔ غنوی کو دکھ ہونے لگا۔ دھان پان سی اسریٰ جو تخلیق کے مراحل طے کرتی پہلے سے بھی کئی گناہ کمزور ہوگئی تھی بے پناہ بوجھ تلے دبی ہوئی گی۔

''کافی شام ہو چکی ہے۔ اتنی دیر سے دھلائی کا کام کیوں شروع کیا' آپ کو احتیاط کرنا چاہیے خدانخواستہ ٹھنڈ لگ گئی تو کیا کریں گی۔''

''یہی بات تو میں بھی اس سے کہتی ہوں بہو بیگم کو اپنی ہی چلانے کی عادت ہے۔ جانے کیسی تربیت لے کر آئی ہیں میکے سے جو کسی کام کا ڈھنگ ہی نہیں۔'' اس سے قبل کہ اسریٰ کوئی جواب دیتی اس کی ساس وہاں چلی آئیں۔

''السلام علیکم آنٹی! کیا حال ہیں؟'' رشتہ ایسا تھا کہ غنوی کو دل پر جبر کر کے خوش اخلاقی برتنا پڑی۔

''حال کیا ہونا ہے۔ پڑے ہیں تمہاری بہنا کے رحم و کرم پر' اندھیرا اتر رہا ہے دیکھ لو ابھی تک شام کی چائے نہیں پی۔'' انہوں نے چہرے پر مصنوعی مظلومیت طاری کرنا چاہی یہ جانے بغیر کہ اس کوشش میں ان کی شکل کافی مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔

''امی! میں نے چائے بنائی تھی' آپ کو دینے آئی تو دیکھا آپ سو رہی ہیں میں نے ڈسٹرب نہیں کیا۔'' اسریٰ نے گھبرا کر وضاحت دی۔

''ارے وہ تو سر میں درد تھا' اس لیے آنکھیں بند کر کے لیٹی تھی۔ تم نے سر شام سونے کا الزام لگا دیا۔ تاکہ بہن کو بتا سکو کہ ایک اکیلی تم کام میں جتی رہتی ہو اور ہم پلنگ توڑتے ہیں۔'' اسریٰ آپی کی ساس کو پر کا کوا بنانا خوب آتا تھا۔

"آپی! کم از کم اندر اپنے کمرے ہی میں لے چلیں۔ کیا یہیں صحن میں ہی کھڑا رکھیں گی۔" غنویٰ نے انہیں نظر انداز کر کے گم صم کھڑی بہن کو مخاطب کیا۔

"ہاں ہاں لے جاؤ اندر' بے چاری مردوں کی طرح ان کے ساتھ ماری ماری پھرتی ہے۔ تھک گئی ہو گی۔" اسریٰ آپی کی ساس کی ہمدردی بھی طنز میں لپٹی ہوئی تھی۔ لیکن اس نے سنی ان سنی کر دی۔

"کیا حال کر رکھا ہے آپ نے اپنا بجائے بہو کے اس گھر کی نوکرانی لگ رہی ہیں آپ۔" کمرے میں پہنچ کر اس نے بہن کو جھڑکا۔

"جس عورت کا میاں کماتا نہ ہو۔ اس کی حیثیت سسرالیوں میں نوکرانیوں کی سی ہی ہوتی ہے۔" اسریٰ نے آزردگی سے کہا۔

"کیوں ابھی ڈیڑھ مہینہ پہلے ہی تو نئی جگہ نوکری کی تھی یاسر بھائی نے۔ کیا اسے بھی چھوڑ دیا۔"

"وہ کسی جگہ ٹکتے ہی کہاں ہیں' جب سے شادی ہوئی ہے یہی دیکھ رہی ہوں۔ ذرا سا مالکان کچھ کہہ دیں وہ دوسرے دن واپس نوکری پر ہی نہیں جاتے۔ ساس صاحبہ مجھے طعنے دیتی ہیں۔ مفت کی روٹیاں توڑنے پر۔" اس کے پوچھنے پر اسریٰ نے بتایا تو وہ مارے دکھ کے کچھ کہہ ہی نہیں سکی۔ اس کی پھولوں جیسی بہن مٹی میں رل رہی تھی۔

"اس وقت کہاں ہیں یاسر بھائی؟" کچھ دیر ٹھہر کر اس نے پوچھا۔

"بیٹھے ہوں گے اپنے دوستوں کی محفل میں۔ گھر تو بس سونے اور کھانے کے لیے ہی آتے ہیں۔" اسریٰ کے جواب نے اسے ایک بار پھر گنگ کر دیا تھا۔

"اچھا' اب میں چلتی ہوں زیادہ دیر ہو گئی تو اماں پریشان ہوں گی۔ اسے لگا کہ کہنے کے لیے کچھ بچا ہی نہ ہو' سو گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ایسے کیسے جاؤ گی۔ تم نے تو کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔" اسریٰ نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

"نہیں۔ فی الحال کسی چیز کی خواہش نہیں ہے۔ آفس سے کھا پی کر ہی نکلی تھی۔"





پھیکی سی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر اس نے بہن کو تسلی دی۔

"غنویٰ! گھر میں کسی کو میرے بارے میں مت بتانا۔ وہ لوگ پریشان ہوں گے۔" اسریٰ نے اسے پکار کر پیچھے سے کہا تو وہ صرف سر ہلا کر رہ گئی۔ کیا کہتی کہ پریشان تو وہ لوگ اس کے لیے ہمیشہ ہی رہتے تھے۔ لاکھ چھپانے کی کوشش کرتی اسریٰ لیکن اس کے حالات اتنے واضح طور پر خراب تھے کہ پردہ پوشی کا بھرم بھی قائم نہیں رہتا تھا۔

☆☆☆

"غنویٰ! مرتضیٰ احمد کے ولیمہ میں چلو گی۔" سمیرا نے کام کرتے کرتے سر اٹھا کر پوچھا۔

"چھوڑ و یار! کیا کروں گی جا کر مجھے ایسے فنکشنز میں بہت بوریت ہوتی ہے۔"

"بے وقوف! یہ کوئی عام ولیمہ نہیں' چیف ایڈیٹر کے بیٹے کا ولیمہ ہے۔ رہی بوریت کی بات تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ وہاں بوریت ہو۔ ایسی ایسی شکلیں نظر آئیں گی کہ انہیں دیکھنے میں وقت کے گزرنے کا احساس بھی نہیں ہو گا۔" سنجیدگی سے اسے ولیمہ کی اہمیت کا احساس دلاتے سمیرا آخر میں شرارت سے آنکھ دباتے ہوئے بولی۔

"لیکن میرے لیے ذرا مسئلہ ہے۔ ساتھ جانے والا کوئی نہیں ہو گا۔ ابا کو پریشان کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا اور لیٹ نائٹ اکیلے جانا ممکن نہیں۔" سمیرا کی شرارت کو خاطر میں لائے بغیر وہ اپنی الجھن میں پھنسی تھی۔

"اوہو! یہ بھی کوئی مسئلہ ہے۔ میرا بھائی جائے گا ساتھ۔ میں تمہیں پک اینڈ ڈراپ دے دوں گی۔" سمیرا نے گویا چٹکی بجاتے مسئلہ کا حل پیش کیا تھا۔ غنویٰ کے لیے کسی بہانے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اس نے نیم دلی سے ہامی بھر لی۔ اصل میں تو اس کا ذہن اسریٰ میں الجھا ہوا تھا۔ اس روز جب وہ اس کے گھر گئی تھی، اس کے بعد صرف ایک بار وہ دو دن کے لیے رکنے آئی تھی اور اب دو مہینے سے پھر کوئی خبر نہیں تھی۔ غنویٰ کی طرف سے موبائل سیٹ کی آفر اس نے یہ کہہ کر رد کر دی تھی کہ

"رہنے دو میں افورڈ نہیں کرسکتی ۔فضول میں میری ساس صاحبہ کو بھی تشویش رہے گی کہ میں جانے کس کس سے اور کیا کیا باتیں کرتی ہوں ۔"

اسریٰ باہمت تھی لیکن اب جس حالت میں تھی بہت زیادہ بوجھ اس کے لیے نقصان دہ بھی ہوسکتا تھا آج اماں ابا اسریٰ کے گھر اسی ارادے سے جانے والے تھے کہ اسے اپنے ساتھ لے آئیں تاکہ وہ باقی کے دن کچھ آرام سے گزار سکے ۔غنویٰ صبح گھر سے آنے کے بعد سے اسی فکر میں مبتلا تھی کہ پتا نہیں وہ لوگ اسریٰ آپی کو اتنے دنوں کے لیے میکے رہنے بھیجتے ہیں یا نہیں ۔اسی الجھن کے ساتھ وہ گھر واپس پہنچی تو نوشابہ کو گھر میں دیکھ کر کوفت کچھ اور بڑھ گئی ۔

"اتنی دیر سے آتی ہو آفس سے ۔میں تو انتظار کرتے کرتے تھک گئی ۔سوچا تھا تم سے ڈھیر ساری باتیں کروں گی لیکن اب تو وقت ہی زیادہ نہیں رہا۔ ابا تھوڑی دیر میں آتے ہوں گے مجھے لینے ۔" نوشابہ حسب عادت اسے دیکھتے ہی شروع ہوگئی تھی ۔

"چچا تمہیں چھوڑ کر خود کہاں چلے گئے ؟" اس کے سوالوں کا جواب دینے کے بجائے غنویٰ نے اس سے پوچھا۔

"ابا تو گئے ہیں "ان" کے گھر کوئی ضروری کام تھا ۔" ان اور ضروری کام پر زور ڈالتے اس نے شرمانے کی کوشش کی ۔

"ہدیٰ! دیکھنا گڑیا ،سونیا نے اگر چائے بنائی ہو تو ایک کپ میرے لیے لادو ۔ نوشابہ !تم پیو گی اور چائے ۔" ہوم ورک کرتی ہدیٰ سے کہتے اس نے نوشابہ سے اخلاقاً پوچھا۔ ورنہ وہ دیکھ چکی تھی کہ نوشابہ نے ابھی ابھی ہی چائے کا کپ خالی کر کے ٹیبل پر رکھا ہے ۔

"نہیں بھئی ۔میں نے تو ایک کپ بھی مجبوراً ہی پیا ہے ورنہ آج کل تو زیادہ تر جوسز وغیرہ ہی لیتی ہوں ۔اصل میں زیادہ چائے پینے سے رنگ خراب ہونے کا ڈر ہے اور "ان کا" تو تمہیں پتا ہے ،انہوں نے مجھ سے رشتہ کیا ہی میری گوری رنگت کی وجہ سے ہے ۔" نوشابہ نے بڑی ادا سے جواب دیا ۔تو آٹھویں کلاس کی اسٹوڈنٹ ہدیٰ منہ بناتے



ہوئے وہاں سے ہٹ گئی ۔

"نوشابہ پتا نہیں اتنی فضول گفتگو کیسے کر لیتی ہے ۔جیسے بچے تک سننا پسند نہیں کرتے ۔" غنویٰ نے کوفت سے سوچا ۔

"پتہ ہے غنویٰ !کل پھپھو آئی تھیں ہماری طرف ۔بڑی برائیاں کر رہی تھیں اپنی بہو کی کہ کوئی کام کاج نہیں کرتی سارا سارا دن کمرے میں بند رہتی ہے گھر والوں سے سیدھے منہ بات نہیں کرتی اور تو اور عباس بھائی کو بھی کاٹھ کا الو بنا کر رکھا ہوا ہے وہ سارا وقت بیوی کی ناز برداری میں لگے رہتے ہیں ۔مگر بھئی صاف بات ہے میں تو یہی کہوں گی کہ جلد بازی میں پھپھو نے کچھ دیکھا بھالا نہیں ،صرف ضد میں شادی کر بیٹھیں ۔ ویسے بھی انہیں تمہاری آہ تو لگنا ہی تھی ۔"

ہدیٰ کے جاتے ہی نوشابہ نے اسے اطلاعات پہنچانے اور ساتھ ساتھ ہمدردی جتانے کا فریضہ انجام دیا ۔

"پھپھو کے گھر کیا ہوتا ہے کیا نہیں ،مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ۔لیکن میں تمہیں یہ ضرور بتا دوں کہ اس کے پیچھے میری کوئی آہ ،واہ نہیں کیونکہ جو کچھ ہوا ،میری مرضی سے ہوا اور مجھے اس پر کوئی افسوس بھی نہیں ہے ۔"

"مجھے پتا ہے ،تم یہ صرف اوپری دل سے کہہ رہی ورنہ دکھ تو تمہیں ہوا ہے ۔"

غنویٰ کے جواب کو خاطر میں لائے بغیر نوشابہ نے بڑی دل سوزی سے کہا اور غنویٰ کا دل چاہا کہ اپنا سر پیٹ لے مگر عافیت چپ رہنے میں تھی ۔

"میرے خیال میں ابا آگئے ہیں ۔" ڈور بیل کی آواز پر نوشابہ نے اندازہ لگایا تو غنویٰ دروازہ کھولنے اٹھ کھڑی ہوئی ۔

"السلام علیکم چچا !" نوشابہ کے اندازے کے مطابق دروازے پر سچ مچ چچا ہی تھے ۔وہ انہیں سلام کرتے ہوئے اندر لے آئی ۔

"چلو بھئی نوشابہ !کھڑی ہو جاؤ جلدی سے کافی دیر ہوگئی ہے ۔" انہوں نے آتے ہی بیٹی کو ہدایت دی ۔

"بیٹھیے نا چچا! رات کے کھانے کا وقت ہونے والا ہے اماں ابا بھی ہو سکتا ہے تب تک واپس آ جائیں۔" طوبیٰ جو چچا کی آواز سن کر وہاں آ گئی تھی بولی۔

"نہیں بھئی۔اتنی دیر رکنے کا وقت نہیں ہے میرے پاس واپس جا کر دوکان کا حساب کتاب بھی دیکھنا ہے۔" چچا نے انکار کرتے ہوئے نوشابہ کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔اور ان لوگوں کے روکتے روکتے بھی نکل کر چلے گئے۔

"چچا بھی عجیب ہیں ہوا کے گھوڑے پر سوار آئے بھی اور چلے بھی گئے کم از کم اماں ابا کے آنے تک ہی رک جاتے میں نے بتایا بھی تھا کہ وہ لوگ اسریٰ آپی کو لینے گئے ہوئے ہیں لیکن یہ تک نہیں پوچھا کہ آپی خیریت سے ہیں یا نہیں۔" ان کے جانے کے بعد طوبیٰ نے تبصرہ کیا۔

"چچا کی عادت کا پتہ تو ہے تمہیں۔بے کار میں اپنی جان جلا رہی ہو۔" غنویٰ نے اسے سمجھایا۔

"ویسے طوبیٰ کہہ بالکل صحیح رہی ہے چچا کچھ عجیب ہی ہیں۔نہ کسی کے برے میں نہ اچھے میں کسی کے اوپر بڑی سے بڑی مصیبت ٹوٹ پڑے چچا غیر جانب دار بنے ایک طرف کھڑے رہیں گے۔خوشی کی بات ہو تو بھی چپ۔"

سونیا جو روٹیاں پکا کر کچن سے نکلی تھی پنکھے کے نیچے آ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"چچا کے اس رویے کو غیر جانب داری کا نام دینا صحیح ہو گا یا بے حسی کا مجھے نہیں معلوم مگر یہ ضرور جانتی ہوں کہ ان کے ہونے کے باوجود ابا کو کبھی بھائی کے ہونے کا احساس نہ مل سکا۔حالانکہ ابا ان سے اتنا پیار کرتے ہیں لیکن وہ ابا سے بھی لیے دیے ہی ملتے ہیں۔"

"اچھا بس،اب چپ ہو جاؤ۔بیل بج رہی ہے میرے خیال میں اماں ابا آ گئے۔" غنویٰ نے بہنوں کو چپ کرایا جبکہ ہدیٰ اس دوران دروازہ کھولنے جا چکی تھی۔

"آپی آئی ہیں۔" باہر سے ہی ہدیٰ کے بولنے کی آواز آئی تو وہ سب بہنیں خوش ہو گئیں۔صبح سے ہی ان سب کو اسریٰ کا انتظار تھا۔



"آپی! اب آپ بہت سارے دن یہاں رہیں گی ناں۔" ہدیٰ چھوٹی ہونے کے باعث اسریٰ کی خصوصی توجہ کا مرکز رہی تھی۔اس لیے اس کی آمد پر سب سے زیادہ خوش بھی وہی تھی۔

"تنگ مت کرو بہن کو۔جاؤ میرے لیے ایک گلاس ٹھنڈا پانی لے کر آؤ اور طوبیٰ! تم اسریٰ کا سامان اندر رکھ دو۔جاؤ اسریٰ تم بھی منہ ہاتھ دھو کر آؤ پھر آرام سے سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا لینا۔" اماں نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہدیٰ کو گھرکنے کے ساتھ ساتھ طوبیٰ اور اسریٰ کو بھی ہدایات دیں۔غنویٰ نے ایک نظر ان کے ستے ہوئے چہرے پر ڈالی اسریٰ کی آنکھیں بھی اسے روئی روئی سی لگی تھیں اور ابا تو لاؤنج میں ٹھہرے بغیر سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔

"میں کھانا لگاتی ہوں۔" سونیا کو بھی اماں کا موڈ ٹھیک نہیں لگا تھا سو وہ ان کے کہے بغیر خود ہی کھانا لگانے چلی گئی۔

"کیا ہوا اماں، خیر تو ہے؟ آپ پریشان لگ رہی ہیں۔" غنویٰ نے اماں کے نزدیک بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"پریشان تو جس دن سے بیٹی بیاہی ہے مستقل ہی رہتے ہیں۔اس کے سسرال والوں کی کل کل سن کر دل مزید خراب ہو جاتا ہے دیکھوں تو انہیں اسریٰ سے شکوے ہیں۔حالانکہ اس حال میں بھی میری بچی سارا سارا دن گھر کے کاموں میں جتی رہتی ہے لیکن ان لوگوں کو نہ اس کی قدر ہے اور نہ اس کا خیال۔اب بھی چھوٹے بیٹے کی شادی کی ڈیٹ طے کیے بیٹھی ہیں اسریٰ کی ساس یہ تک نہیں سوچا کہ بہو بیچاری شریک بھی ہو سکے گی یا نہیں اس پر سے ہمارے داماد صاحب کے فرمائشی پروگرام،اسریٰ سے کہا ہے اپنے جہیز کا سیٹ منہ دکھائی میں ناصر کی دلہن کو دے دینا خود کچھ کماتے دھماتے نہیں لے کر میری بچی کی ہر چیز اجاڑ کر رکھ دی۔"

اماں بہت دل گرفتہ تھیں غنویٰ انہیں تسلی تک نہ دے سکی۔

☆☆☆

''وہ دیکھو' ضیاء اور حامد صاحب نظر آ رہے ہیں۔ آؤ۔ ہم بھی وہیں چلتے ہیں۔''
میرج لان میں داخل ہوتے ہی سمیرا نے اپنے کولیگز کو ڈھونڈ نکالا اور غنویٰ کا ہاتھ تھامے ان لوگوں کی طرف بڑھ گئی۔

''السلام علیکم' کہیں ہم لوگ لیٹ تو نہیں ہو گئے۔''

''جی بالکل نہیں' ابھی کھانا اسٹارٹ ہونے میں ٹائم لگے گا۔'' سمیرا کے سوال کا جواب ضیاء نے حسب عادت ایسا دیا تھا کہ وہ تپ جائے۔

''جی ہمیں ایسی کوئی فکر نہیں۔ جنہیں ایسی فکر ہوتی ہے وہ تمہاری طرح سر شام آ کر دعوتوں میں ڈیرا ڈال لیتے ہیں۔'' سمیرا نے سلگ کر جواب دیا۔

''جی وہ تو ہم اس لیے جلدی پہنچ جاتے ہیں کہ ہمیں لوگوں کی طرح چہرے کی ڈینٹنگ پینٹنگ نہیں کرنا ہوتی۔ ماشاء اللہ سے شکل ہی ایسی ہے کہ صرف منہ دھو کر بھی کہیں پہنچ جائیں تو چودھویں کے چاند کی طرح چمکتے دکھائی دیتے ہیں۔'' وہ دوبدو بولا۔

''اچھا بس کرو' ورنہ تم لوگوں کی نوک جھونک میں ہی سارا وقت گزر جائے گا۔'' حامد صاحب نے ضیاء کو ٹوکتے ہوئے تعارف کی رسم انجام دینی شروع کی۔

''یہ ضیاء کی امی اور چھوٹی بہن ہیں۔ اور یہ میری بیگم اور وہ جو پھولوں کے گملوں کے گرد تتلیوں کی طرح منڈلاتی پھر رہی ہے میری چہیتی اور اب تک کی اکلوتی بیٹی ہے۔''

''باقی لوگ نظر نہیں آ رہے کیا ابھی تک پہنچے نہیں۔'' سب سے ہاتھ ملا کر ان لوگوں نے رسمی کلمات ادا کیے اور پھر چیئرز سنبھال کر بیٹھتے غنویٰ کو خیال آیا تو اس نے پوچھا۔

''کافی لوگ آ گئے ہیں ادھر ادھر سب سے ملتے پھر رہے ہیں۔ بابر اور آفاق کا تو تمہیں پتا ہے کہ تقریب کی کوریج ان ہی کی ذمہ داری ہے سو وہ دونوں تو ہم سے بھی پہلے سے پہنچے ہوئے ہیں۔ باقی لوگ بھی بس پہنچتے ہی ہوں گے۔''
حامد صاحب نے اطلاع بہم پہنچائی تو وہ صرف سر ہلا کر رہ گئی۔ وسیع وعریض





لان میں اس وقت بلا مبالغہ ہزاروں لوگ موجود تھے۔ ایسے میں کسی کا کسی کو ڈھونڈ نکالنا کمال ہی تھا اور ایسا کمال سمیرا تو دکھا سکتی تھی غنویٰ نصیر ہرگز بھی نہیں۔

''چلیں حامد بھائی! ہم بھی چل کر لوگوں سے ملتے ہیں ورنہ میرا اور ریما سے لے کر نرما اور نرگس تک سب سے اکیلے نعمان صدیق ہی ملاقاتیں کرتا رہے گا۔ کچھ ہم بھی اس کار ثواب میں حصہ لے لیں۔ اگر آپ لوگ چاہیں تو آپ بھی کسی ہیروئن پر طبع آزمائی کر سکتی ہیں۔''

''نہیں بھئی آپ ہی کافی ہیں ایسے کاموں کے لیے۔ ہم یہاں سکون سے بیٹھے ہیں۔'' غنویٰ نے ضیاء کی پیش کش پر ہنستے ہوئے انکار کیا تو وہ دونوں بھی مسکرا کر وہاں سے چلے گئے۔

''بہت شریر ہے ضیاء' تم لوگ برا مت ماننا۔'' ضیاء کی امی نے اس کے جانے کے بعد ان لوگوں سے کہا۔

''ارے نہیں آنٹی! ہم لوگ ضیاء کی نیچر بہت اچھی طرح جانتے ہیں بہت نائس لڑکا ہے ہنستے ہنستے بہت سے کام نمٹا دیتا ہے اور پتا بھی نہیں چلتا اس کی وجہ سے تو آفس کا ماحول خوشگوار رہتا ہے۔'' یہ سمیرا تھی جس کی ضیاء سے ہر دم ٹھنی رہتی تھی مگر اس وقت کھلے دل سے اس کی خوبیوں کا اعتراف کر رہی تھی۔

''یہ ہے' حامد بھی اکثر ضیاء کی تعریف کرتے ہیں۔'' مسز حامد نے گفتگو میں حصہ لیا۔

''اور تم کیا کرتی ہو عرشی! یقیناً ابھی تو پڑھ رہی ہو گی۔'' بڑی دیر سے چپ چاپ بیٹھی مسکرا کر باتیں سنتی ضیاء کی بہن کو مخاطب کرتے غنویٰ نے پوچھا۔

''میں سیکنڈ ائیر میں پری میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''میری بھی ایک بہن سیکنڈ ائیر پری میڈیکل میں ہے۔ لیکن اسے ڈاکٹر بننے کا شوق نہیں۔ وہ انٹر کے بعد بی فارمیسی میں ایڈمیشن لینے کا ارادہ رکھتی ہے۔''

''مگر مجھے تو جنون ہے ڈاکٹر بننے کا اگر میرا میڈیکل میں ایڈمیشن نہیں ہوا تو

یں تو آگے کچھ بھی نہیں پڑھ سکوں گی۔" غنوئی کے بتانے پر عرشی نے جوش سے کہا۔

"ان شاء اللہ تعالیٰ تمہارا میڈیکل میں ایڈمیشن ہو جائے گا لیکن تم نے یہ جو کہا کہ اگر میرا میڈیکل میں ایڈمیشن نہیں ہوا تو میں کچھ بھی نہیں پڑھ سکوں گی' یہ غلط بات ہے۔ انسان کو ہر طرح کے حالات کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ بے شک زندگی میں اپنا ٹارگٹ طے کرو اور اسے حاصل کرنے کے لیے پوری جدوجہد بھی کرو لیکن ناکام ہو کر سرے سے میدان چھوڑ دینا تو سراسر بے وقوفی ہے۔ اگر تم ڈاکٹر نہ بن سکیں خدانخواستہ تو کیا کبھی کچھ بھی نہ بن سکو گی۔ جو لوگ سوسائٹی میں رہ کر اپنا رول پلے نہ کریں اور عضو معطل کی طرح پڑے رہیں ان کو نہ تو معاشرہ پسند کرتا ہے نہ ہی اللہ۔ اللہ کے نزدیک تو جدوجہد کرنے والے لوگ ہی پسندیدہ ہوتے ہیں۔" وہ عرشی کو سمجھانے لگی۔

"ماشاء اللہ بہت سلجھی ہوئی اور مثبت سوچ ہے تمہاری کچھ اپنے گھر والوں کے بارے میں بتاؤ۔" ضیاء کی امی کی دلچسپی یکدم ہی اس میں بہت بڑھ گئی۔

"جی ہم چھ بہنیں ہیں۔ ابا گورنمنٹ ملازم ہیں اور اماں مکمل طور پر گھریلو خاتون بڑی بہن کی شادی ہو گئی ہے۔ مجھ سے چھوٹی بہن بی اے فائنل ایر میں پڑھتی ہے۔ اس سے چھوٹی سیکنڈ ائیر میں پانچویں نمبر والی میٹرک میں اور سب سے چھوٹی 8th کلاس میں ہے۔" سمیرا اور مسز حامد کے چہروں پر پھیلی معنی خیز مسکراہٹ سے نظر چراتے وہ ان کے سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔ کھانا کھانے کے دوران بھی وہ ان کی توجہ کا مرکز رہی۔

"چلو بھئی' اسٹاف کا دولہا دلہن اور چیف ایڈیٹر صاحب کے ساتھ گروپ فوٹو بن رہا ہے۔ تم دونوں بھی وہاں اپنا چہرہ کرو دو تاکہ سند رہے۔" حامد صاحب کے بلاوے پر اس کی گلو خلاصی ہوئی تھی۔

سمیرا! تمہارا بھائی کب تک آئے گا ہمیں لینے۔ تمہیں پتا ہے اسریٰ آپی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اماں کو کسی بھی وقت ان کے ساتھ ہاسپٹل جانا پڑ سکتا ہے۔ ایسے میں میرا گھر پر چھوٹی بہنوں کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔" وہ لوگ تصویر کھنچوا کر اور ضروری



ملاقاتیں کر کے فارغ بھی ہو گئے لیکن سمیرا کے بھائی کا کہیں پتا نہیں تھا۔

"تو تم ہمارے ساتھ چلو' ہم تمہیں ڈراپ کر دیں گے۔" ضیاء کی امی نے پیش کش کی۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے' سمیرا! تم بھی بھائی کو کال کر کے آنے سے منع کر دو تمہیں ہم لوگ ڈراپ کر دیں گے۔" حامد صاحب نے کہا سمیرا نے جھٹ ہامی بھر لی چاروناچار غنوئی کو ضیاء کی امی کی آفر قبول کرنا پڑی۔

"ذرا احتیاط سے کہیں' ایسا نہ ہو کر محترمہ تمہیں تمہارے گھر پہنچانے کے بجائے سیدھی اپنے گھر لے جائیں۔ دل آ گیا ہے ان کا تم پر۔" ضیاء کی گاڑی میں اس کے بیٹھتے ہوئے سمیرا نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"تم فکر نہ کرو' میرے دل و دماغ دونوں ٹھکانے پر ہیں' اس لیے کسی گڑبڑ کی گنجائش نہیں۔" وہ نہایت سنجیدگی سے جواب دیتی ضیاء کی امی کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

☆☆☆

"ہاشمی صاحب نے تو لگتا ہے' شہر کی کوئی شخصیت نہیں چھوڑی تھی۔" ابھی کچھ دیر پہلے بابر تصویروں کا لفافہ دے کر گیا تھا۔ ڈھیروں ڈھیر تصویروں میں بے شمار مشہور و معروف شخصیات کو دیکھتے سمیرا نے تبصرہ کیا۔

"ظاہر ہے یار! ان کے اکلوتے بیٹے کا ولیمہ تھا پھر ظاہر ہے ان کے تعلقات بھی بے حد وسیع ہیں۔ یہاں کسی سنیئر رپورٹر' کھلاڑی یا اداکار کی شادی ہو تو آدھا شہر جمع ہو جاتا ہے تو پھر ہاشمی صاحب کی تو بات ہی الگ ہے۔" غنوئی بھی اسی کی طرح تصویروں میں کھوئی ہوئی تھی۔ اپنی مصروفیت کو جاری و ساری رکھتے اس نے سمیرا کی بات میں ٹکڑا لگایا۔

"آپ خواتین تو یوں ان تصویروں کو دیکھ رہی ہیں جیسے تقریب میں شرکت ہی نہ کی ہو اور یہ جو لوگ نظر آ رہے ہیں ان تصویروں میں ان سے کبھی ملاقات کا شرف ہی

حاصل نہ ہوا ہو۔" ضیاء جو کچھ پیپرز کے ساتھ الجھا بیٹھا تھا ان لوگوں کی محویت پر ٹوک بیٹھا۔

"تو ہم کون سا تقریب میں اڑے اڑے پھر رہے تھے۔ زیادہ تر ایک ہی جگہ بیٹھے رہے۔ چند ایک ہی لوگوں سے ملاقات کی۔" سیمرا نے تاسف سے کہا۔

"تو کس نے کہا تھا کہ ایلفی لگا کر چپک جاؤ کرسیوں کے ساتھ۔ غضب خدا کا صحافیوں والی تو کوئی خصوصیت ہی نہیں پائی جاتی محترماؤں میں۔ بجائے اس کے کہ خود خبریں تلاش کریں اور بنائیں، یوں اخبار کو گھور گھور کر دیکھتی ہیں جیسے دنیا کی کوئی خبر ہی نہ ہو۔ جنہیں دنیا کو اطلاعات فراہم کرنا ہوں انہیں ایسی بے خبری زیب نہیں دیتی۔" وہ ان دونوں کو خوب اچھی طرح جھاڑ پلا رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ یوں ہی دوست سے انچارج کا روپ دھار لیتا تھا۔

"سمیٹیں یہ سارا پھیلاوا۔ ابھی پندرہ منٹ بعد مجھے صمدانی صاحب کا فیملی انٹرویو لینے لنچ پر ان کے گھر جانا ہے۔ غنویٰ! آپ ریڈی ہو جائیں' آپ میرے ساتھ چلیں گی اور سیمرا! آپ جاوید صاحب سے رابطہ کریں' ان کا افسانہ ابھی تک موصول نہیں ہوا۔ سنڈے میگزین میں ادبی صفحے پر کیا چھپے گا۔" اس کی ڈانٹ پر سیمرا تو جلدی جلدی تصویریں واپس لفافے میں رکھ کر ٹیلیفون پر نمبر ڈائل کرنے لگی جبکہ غنویٰ حق دق اسے دیکھنے لگی۔

"مگر ضیاء......! وہ اسمارا تو کہہ رہی تھی کہ اسے جانا ہے تمہارے ساتھ۔ میں تو کوئی خاص تیاری بھی نہیں کر کے آئی۔" اسمارا کی بے حد اہتمام سے کی گئی تیاری اور اپنے سادہ کاٹن کے سوٹ کو دھیان میں رکھتے اس نے ڈرتے ڈرتے ضیاء سے کہا۔

"تو کیا اب یہاں اسمارا کی مرضی سے کام ہوا کرے گا۔ میگزین انچارج میں ہوں یا اسمارا اور رہی تیاری کی بات تو فار یور کائنڈ انفارمیشن' آپ نے انٹرویو لینا ہے' دینا نہیں۔" وہ اپنی اسی ٹون میں جواب دیتا دراز سے ٹیپ ریکارڈر نکال کر شہزاد کو آواز دینے لگا۔



"یوسف سے کہو' کیمرا وغیرہ گاڑی میں رکھوا کر خود بھی بیٹھے ہم لوگ آرہے ہیں۔"

"چلو۔" اسے ایک لفظی حکم سناتا وہ باہر نکل گیا۔

"یہ اس موڈ کے ساتھ انٹرویو کیسے کرے گا۔" اس نے تشویش سے سیمرا سے پوچھا۔

"ارے گرگٹ ہے۔ جا رہی ہو ساتھ دیکھ لینا کیسی خوش اخلاقی برتے گا۔"

سیمرا فون سے فارغ ہو چکی تھی۔ کان پر سے مکھی اڑاتے اطمینان سے بولی۔

غنویٰ جس نے پہلی بار ضیاء کا یہ انداز دیکھا تھا سیمرا کے جواب پر قدرے مطمئن ہو کر باہر نکل گئی۔

☆☆☆

"صمدانی کی بیوی تو بہت ینگ ہے اس کے مقابلے میں۔" سیمرا کی پیش گوئی کے مطابق صمدانی کے گھر پہنچتے ہی ضیاء کا موڈ خوشگوار ہو گیا تھا۔ کافی خوشگوار ماحول میں انٹرویو اور لنچ سے لطف اندوز ہو کر وہ لوگ ان کے گھر سے نکلے تو گاڑی میں بیٹھتے ہی غنویٰ نے بہت دیر سے ذہن میں گردش کرتے خیال کو زبان دی۔

"ہاں تو ان لوگوں کے لیے کیا مشکل ہے۔ خاندانی بیوی گاؤں میں ہے جس سے جوان جوان بچے ہیں۔ یہ جن سے ابھی مل کر آرہے ہیں دوسری بیوی ہے چار سال پہلے ہوئی تھی شادی۔ اولاد نہیں ہے اس بیوی سے اور نہ صمدانی کو ضرورت ہے۔ اس نے جوان عورت سے شادی اس لیے کی ہے کہ وہ جو اب بڑھاپے کی وجہ سے اتنا ایکٹو نہیں رہا ہے تو بیوی سے کام لے سکے اور صمدانی کی بیوی واقعی بڑے بڑے "کام" انجام دے رہی ہے۔" یوسف نے "کام" پر زور دیتے اسے اطلاعات فراہم کیں۔

"اف خدا ...... یہ سیاست دان اپنی پرسنل لائف میں بھی سیاسی مفاد دیکھتے ہیں۔"

"اور ہمارا کام ہے ان کی ہر طرح کی سرگرمیوں سے واقف رہنا اور عوام کو مطلع

کرنا‘ اسی لیے میں تم لوگوں سے کہتا ہوں ایکٹو رہو۔ اردگرد پر نظر رکھو۔ اگر باخبر نہیں رہیں تو تمہاری افادیت اور اہمیت دونوں کم ہو جائیں گی۔ یہ صمدانی جو ہر جگہ تک چڑھا مشہور ہے‘ دیکھا تھا میرے ساتھ کتنا اخلاق برت رہا تھا۔ صرف اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ میں ”باخبر“ ہوں۔ اگر وہ ٹیڑھا ہوا تو مجھے بھی دیر نہیں لگے گی اس کے چہرے سے نقاب ہٹانے میں۔“ غنوئی کے تبصرے پر گرفت کرتے ضیاء نہایت سنجیدگی سے اسے صحافت کے اسرار و رموز سمجھا رہا تھا۔

”ضیاء! اگلے چوک پر گاڑی روک دینا مجھے آرٹس کونسل جانا ہے۔ وہاں سے ٹیکسی لے لوں گا۔“

”او کے۔“ یوسف کے کہنے پر اس نے اثبات میں سر ہلایا اور چوک پر پہنچتے ہی گاڑی روک دی۔

”مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنا تھی۔ آفس میں موقع نہیں ملا‘ سوچ رہا ہوں‘ ابھی کر لوں۔“ یوسف کے اترنے کے بعد گاڑی آگے بڑھاتے اس نے غنوئی سے کہا تو اس کی حسیات بیدار ہو گئیں۔

”ہاشمی صاحب کے بیٹے کے ولیمہ پر امی ملی تھیں تم سے۔ آج کل ان کے دماغ میں میری شادی کا سودا سمایا ہوا ہے۔ تم سے ملیں تو تم انہیں اچھی لگیں۔ وہ کسی دن تمہارے گھر آنا چاہ رہی ہیں لیکن میں نے سوچا کہ پہلے تم سے اجازت لے لوں۔ ہوسکتا ہے‘ تم پہلے سے کہیں انگیج ہو یا پھر کوئی دوسرا مسئلہ ہو تو تمہیں امی کے آنے سے پریشانی نہ اٹھانا پڑے۔“ وہ بہت ٹھہرے ہوئے اور سنجیدہ لہجے میں اسے آگاہ کر رہا تھا۔

”تمہاری امی نے مجھے پسند کیا ہے اور خود تمہاری کیا رائے۔“ وہ بہت اعتماد سے پوچھ رہی تھی۔

”ایکچوئلی میں نے اس بارے میں کچھ سوچا نہیں۔ سارا اختیار امی کو دے رکھا ہے وہ کسی بھی سلجھی ہوئی اور تعلیم یافتہ لڑکی کو میرے لیے منتخب کرتیں مجھے انکار نہیں ہوتا۔“ ضیاء نے نہایت صاف گوئی سے کہا تو غنوئی نے اطمینان کا سانس لیتے پوری توجہ سے اس



کی طرف دیکھا۔

گندمی رنگت‘ ذہانت سے بھرپور آنکھیں‘ مناسب قد و قامت‘ خوشحال اور مہذب فیملی کا وہ لڑکا کسی طور رد کیے جانے کے لائق نہیں تھا۔

”تم بہت اچھے ہو ضیاء! لیکن میں ابھی تم سے تو کیا کسی بھی شخص سے شادی نہیں کر سکتی میں نے جاب کسی شوق کے تحت نہیں بلکہ خود کو ہونے والے اس ادراک کے بعد کی ہے کہ میری فیملی کو میری ضرورت ہے اور میں اپنی ذمہ داریوں کو پورا کیے بغیر اپنے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ البتہ اگر آنٹی چاہیں تو مجھ سے چھوٹی سونیا سے مل لیں۔ وہ میری بہن ہے اس لیے مجھ جیسی ہی ہے۔ اگر آنٹی اور تم نے پسند کیا تو ہمیں تم سے رشتہ جوڑ کر خوشی ہوگی لیکن یہ بات ذہن میں رکھنا کہ ابھی چھ سات ماہ تک ہم لوگ شادی کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔“ اس نے پوری وضاحت سے ضیاء کو بتایا تو وہ اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

”قربانی دینے کی کوشش کر رہی ہو۔“

”نہیں۔ بلکہ اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔“ اس نے تردید کی۔

”تو ایک اچھے دوست کی طرح میں کوشش کروں گا کہ تمہاری کوشش کامیاب رہے۔“ وہ مسکرایا تو غنوئی کے ہونٹوں پر بھی چمکیلی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆☆☆

”کیا ہوا اماں! خیریت تو ہے۔“ وہ کاغذ قلم لیے کمرے سے نکل کر لاؤنج میں بیٹھنے کے ارادے سے آئی تھی اسے ایک اہم آرٹیکل لکھنا تھا لیکن اسے لگا کہ روشنی سے باقی لوگ ڈسٹرب ہو رہے ہیں اس لیے لائٹ آف کر کے خود باہر نکل آئی لیکن اتنی رات کو اماں کی لاؤنج میں موجودگی نے اسے پریشان کر دیا۔

”اسریٰ کو چیک اپ کے لیے لے گئی تھی آج۔ ڈاکٹر نے کہا ہے میجر آپریشن کرنا پڑے گا۔“ انہوں نے بتایا۔

”آپ فکر نہ کریں ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم آپی کا آپریشن کسی

بڑے ہسپتال سے کروائیں گے۔‘‘ اس نے ماں کو تسلی دی۔

’’اور وہ جو بڑے ہسپتال والے لمبے چوڑے بل بنا کر دے دیتے ہیں۔‘‘ اماں کی فکر اور تشویش اپنی جگہ تھی۔

’’آپ اس دن کہہ تو رہی تھیں کہ میری سیلری سے آپ نے بڑی کمیٹی ڈالی ہے۔ کمیٹی والی سے کہیں کہ آپ کو ضرورت ہے وہ ارینج کر دے گی۔‘‘ غنویٰ نے مشورہ دیا۔

’’ہاں اب یہی کرنا پڑے گا۔ اس کے سسرال والے پلٹ کر پوچھنے تک نہیں آئے مزید ان سے کیا امید رکھوں۔ اسریٰ کی زندگی کا مسئلہ ہے ورنہ سوچا تھا تمہارے لیے ایک سیٹ اور سونے کی چوڑیاں لے لوں گی۔‘‘ اماں نے سرد آہ بھری۔

’’میری فکر مت کیا کریں اماں! میں نے اب بہادری سے جینے کا ڈھنگ سیکھ لیا ہے۔ میں نوکری اپنا جہیز بنانے کے لیے نہیں اپنی بہنوں کے لیے کر رہی ہوں۔ ابھی آپ آپی کا خیال کریں بعد میں کچھ رقم بچ جائے تو سونیا کے لیے کچھ لے لیجیے گا۔‘‘ وہ نہایت رسان سے بولی تھی لیکن اماں ہول گئیں۔

’’تو اپنے بارے میں کیا سوچ رہی ہے غنویٰ۔‘‘

’’اپنے بارے میں کہاں اماں! میں تو اپنے گھر والوں کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔‘‘ اس کا اطمینان اپنی جگہ قائم تھا۔

’’تمہارے ایک فیصلے نے تمہارے باپ کو تم سے دور کر دیا ہے۔ اب ایسا کچھ مت سوچو جو تم سے تمہاری زندگی کی خوشیاں چھین لے جائے۔‘‘ وہ اسے سمجھا رہی تھیں۔

’’ہم اپنوں کے لیے سوچیں اور خوشی ہم سے دور رہے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ابا ایک دن مجھے معاف کر دیں گے اس بات کا مجھے یقین ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں میں غلط نہیں ہوں۔ بس کچھ وقت لگے گا انہیں اس بات کو ماننے میں۔‘‘ اس کی پلکیں بھیگنے لگیں تو اماں نے بے ساختہ ہی اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

’’اللہ نے مجھے تم جیسی بیٹی دے کر بیٹے کی کمی کا احساس مٹا دیا۔ بیٹی کتنی پیاری



نعمت ہے یہ تو میں نے اب اتنے برسوں بعد جانا ہے۔‘‘ وہ اس کی پلکوں کے موتی چنتے خود بے تحاشا آنسو بہا رہی تھیں۔

☆☆☆

’’اس کی آئیز کتنی خوبصورت ہیں بالکل اسریٰ آپی کی طرح۔‘‘

’’اور سوتے میں یہ بالکل میری مانو کی طرح لگتی ہے۔ کیوٹ اینڈ انوسینٹ۔‘‘

یہ آراء صدیق ماموں کے سپوتوں آذر اور فیصل کی تھیں۔ آج آٹھواں دن تھا اسریٰ کی گود میں بیٹی آئے لیکن وہ دونوں جب بھی آتے نئے نئے زاویوں سے بچی پر تبصرہ کرتے۔

’’ماما! منی کو اپنے گھر لے کر چلیں نا۔ ہم اس کے ساتھ کھیلیں گے۔‘‘ چھوٹے آذر نے فرمائش کی۔

’’اور اسریٰ آپی کیا کریں گی وہ تو اداس ہو جائیں گی اپنی منی کے بغیر۔‘‘ ممانی نے سمجھایا۔

’’تو اللہ میاں نے ہمیں بہن کیوں نہیں دی۔‘‘ آذر سخت خفا تھا۔

’’ادھر آؤ کس نے کہا کہ اللہ میاں نے آپ کو بہن نہیں دی۔ یہ اسریٰ آپی، غنویٰ آپی، سونیا بجو، طوبیٰ، منی اور ہدیٰ آپ کی بہنیں نہیں ہیں تو کون ہیں۔‘‘ صدیق ماموں نے بیٹے کو قریب بلا کر دائیں بازو کے حصار میں لیتے پوچھا۔

’’ہاں وہ تو ہیں لیکن یہ لوگ اتنے اتنے دن بعد ہمارے گھر آتی ہیں۔‘‘ باپ کی بات تسلیم کرنے کے ساتھ اس نے شکوہ بھی کیا۔

’’تو بیٹا! ان کو پڑھنا بھی تو ہوتا ہے۔ جیسے آپ روز روز اسکول کی چھٹی کر کے پھپھو جان کے گھر نہیں جا سکتے۔ ایسے ہی بہنیں بھی تو اپنے اسکول اور کالج کی چھٹی نہیں کر سکتیں۔‘‘ انہوں نے اسے سمجھایا۔

’’لیکن غنویٰ آپی تو پڑھنے نہیں جاتیں۔ یہ تو ہمارے ساتھ ہمارے گھر چل سکتی ہیں۔‘‘ آذر کو نیا خیال سوجھا۔

"پڑھنے نہیں جاتیں تو کیا ہوا' آفس تو جاتی ہیں۔" ماموں نے پھر سمجھایا۔

"لیکن آفس تو ہمارے گھر سے بھی جاسکتی ہیں۔وہ کوئی چھوٹی بچی تو نہیں نا کہ انہیں ہمارے گھر سے آفس کا راستہ نہیں معلوم ہو۔" آذر باپ کی دلیل سے ہارنے لگا تھا کہ فیصل نے کہا اور سب ہنس پڑے۔

"بس بھئی غنویٰ !اب تمہیں اپنے بھائیوں کا مطالبہ ماننا پڑے گا۔ورنہ یہ شیطان دلیلیں دے دے کر ہمارا ناک میں دم کر دیں گے۔" ممانی نے کہا تو بچے اس کے سر ہو گئے۔

"او کے بابا !لیکن ابھی نہیں۔ابھی اسریٰ آپی ! ہسپتال میں ہیں۔نیکسٹ ویک جب میرا آف ڈے ہوگا تو میں تم لوگوں کے ساتھ رہنے آؤں گی۔" بالآخر اسے وعدہ کرنا پڑا۔

"اور بتائیں آپا !اسریٰ کے سسرال والے بچی کو دیکھنے آئے یا نہیں۔" ان کا مسئلہ حل ہوتے ہی ممانی حمیدہ بیگم سے مخاطب ہوئیں۔

"ہاں۔پرسوں شام تم لوگوں کے جانے کے بعد آئے تھے تھوڑی دیر کے لیے ہزاروں باتیں بنا کر گئے کہ ہم نے اسریٰ کا خیال نہیں رکھا اس لیے آپریشن کی نوبت آئی اور یہ کہ میکے میں رہنے کا اثر ہے کہ اسریٰ بھی بیٹی کی ماں بنی' ورنہ ان کے خاندان میں تو ہمیشہ پہلا بیٹا ہوتا ہے۔" انہوں نے دکھ سے بھاوج کو اسریٰ کی ساس کے الفاظ سنائے۔

"تو آپ کہتیں نا ان لوگوں سے کہ آپریشن کی نوبت میکے میں رہنے سے نہیں بلکہ سسرال میں دن رات گدھوں کی طرح کام کرنے اور ٹینشن برداشت کرنے کی وجہ سے آئی ہے۔" ممانی کو بھی سن کر غصہ آیا۔

"کیا کروں بیٹی والی ہوں' سہنا پڑتا ہے پھر آگے بھی بیٹیوں کی لائن لگی ہے خدانخواستہ بڑی کے ساتھ کچھ اونچ نیچ ہو گئی تو باقی کے لیے بھی مشکل ہو جائے گی پہلے ہی غنویٰ نے جب سے اپنی پھپھو کو جواب دیا ہے انہوں نے خاندان بھر میں میری بچیوں کو زبان دراز اور منہ زور مشہور کر ڈالا ہے۔" انہوں نے ایک سرد آہ بھری۔



"فکر مت کریں آپا !آپ کی ساری بیٹیاں بہت سمجھ دار اور نیک سیرت ہیں۔ اللہ وقت آنے پر سب کے نصیب کھول دے گا آپ یہ بتائیں کہ اسریٰ کے دیور کی شادی کب ہے۔" ممانی نے انہیں تسلی دیتے ہوئے پوچھا۔

"آج سے آٹھ دن بعد ہے۔کارڈ دے گئے ہیں وہ لوگ۔اسریٰ کے آنے کا پوچھ رہے تھے۔میں نے صاف کہہ دیا کہ گھر بھیجنے کا تو فی الحال سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شادی والے دن اگر اس کی حالت بہتر ہوئی تو تھوڑی دیر کے لیے وقت شادی ہال میں لے آؤں گی۔"

"اچھا کیا' فی الحال اسریٰ کو آرام کی ضرورت ہے۔وہ لوگ تو عام دنوں میں اسے نوکرانی بنائے رکھتے ہیں۔شادی والے گھر میں تو حشر ہی بگاڑ کر رکھ دیں گے۔"

اماں اور ممانی گفتگو میں مصروف تھیں جبکہ اسریٰ بظاہر بچی میں مگن خود کو بے نیاز ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔غنویٰ اور صدیق ماموں بھی بے بس سے چپ بیٹھے تھے۔ یہ اسریٰ کی زندگی کے وہ حقائق تھے جنھیں وہ لوگ چاہتے ہوئے بھی بدلنے کی قدرت نہیں رکھتے تھے۔

☆☆☆

"غنویٰ آپی !چلیں نا' کرکٹ کھیلتے ہیں۔" اس نے پڈنگ بنا کر فریج میں رکھا تو بڑی دیر سے اس کی فراغت کے منتظر فیصل اور آذر اس کے سر ہو گئے۔وہ رات سے ماموں کے گھر رہنے آئی ہوئی تھی تاکہ اپنا وعدہ ایفا کر سکے صبح اتفاق سے ماموں کے کسی آفس کولیگ کے انتقال کی خبر آگئی تو ماموں ممانی وہاں چلے گئے۔اب گھر میں بچے تھے اور ان کی غنویٰ آپی جو ان کا فرمائشی کھانا تیار کرنے کے بعد اب نئی فرمائش سن رہی تھیں۔

"لیکن مجھے کرکٹ کھیلنی نہیں آتی۔" اس نے عذر پیش کیا۔

"تو کوئی بات نہیں' ہم لوگ جو ہیں' ہم سکھا دیں گے۔" وہاں ہر مسئلے کا حل تیار تھا۔چار و ناچار غنویٰ کو ان کے ساتھ باہر چھوٹے سے لان میں آنا پڑا۔

"ویری گڈ آپی !ایک اور زور دار شارٹ لگائیں۔اس بار سکس ہونا

چاہیے۔'' کھیل پوری شدومد سے جاری تھا۔آذر باؤلنگ کروا رہا تھا کہ وہ اونچے اونچے شارٹس کھیلے۔فیصل کی فرمائش پر اس نے ایک زور دار شارٹ لگایا اور بال دیوار کو کراس کرتی برابر والے گھر کے لان میں جا گری۔

''اوئو! آپ تو آؤٹ ہو گئیں۔'' فیصل کو افسوس ہوا۔

''اور اس کے ساتھ ہی کھیل بھی ختم کیونکہ بال تو گئی۔'' غنویٰ نے اطمینان سے بیٹ گھاس پر ڈالا۔

''جی نہیں' ابھی میری بیٹنگ تو آئی نہیں۔'' آذر صاحب منہ پھلا کر رونے کی تیاری کرنے لگے۔

''لیکن بغیر بال کے ہم کیسے کھیل سکتے ہیں۔'' اس نے اسے سمجھانا چاہا۔

''مجھے کچھ نہیں پتا' بس مجھے اپنی بیٹنگ لینی ہے۔'' آذر کسی طور سمجھوتے پر راضی نہیں تھا۔

''تم بتاؤ فیصل! کیا کریں؟'' مجبور ہو کر اس نے فیصل کی طرف رجوع کیا۔

''ہم جب باہر دوستوں کے ساتھ کھیلتے ہیں نا تو جس کے شارٹ سے بال جاتی ہے وہی لے کر آتا ہے۔'' فیصل نے گویا اسے مسئلے کا حل بتایا۔

''مگر یہ تمہارے برابر والا گھر تو خالی ہے نا' وہاں سے بال کیسے آسکتی ہے۔'' اس نے عذر پیش کیا۔

''اسٹول کو چیئر پر رکھ کر دیوار پر چڑھیں اور چھلانگ لگا کر ادھر چلی جائیں واپسی میں ان کے چھوٹے والے گیٹ کو کھول کر آجایئے گا۔'' ادھر پورا پلان تیار تھا جس پر عمل کرنے میں غنویٰ شدید تذبذب کا شکار تھی لیکن آذر میاں کے منہ کے مسلسل بگڑتے زاویوں نے اسے مجبور کر دیا۔فیصل کی بتائی ہوئی ترکیب پر عمل کرتے اس نے برابر والے گھر کے لان میں چھلانگ لگائی سامنے ہی ہری بھری گھاس پر بال پڑی تھی۔

''بڑے قاعدے کے لوگ ہیں گھر میں کوئی نہیں رہتا پھر بھی لان کو اتنا مین ٹین کر رکھا ہے۔'' کیاریوں میں کھلکھلاتے پھولوں کے پودوں کو دیکھتے ہوئے اس نے سوچا



اور جھک کر بال اٹھانے لگی یکدم ہی اپنے پیچھے سنائی دینے والی غراہٹ پر وہ اچھل کر سیدھی ہوئی۔سامنے ہی بڑا سا سیاہ کتا موجود تھا دہشت سے بال اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور اگلے ہی لمحے وہ فلک شگاف چیخیں مار رہی تھی جن کا مقابلہ کتا اپنی زور دار بھوں بھوں سے کر رہا تھا۔

''سنی ...... واٹ آر یو ڈوئنگ ...... جاؤ یہاں سے۔'' تیز مردانہ آواز میں دیے گئے احکامات نے کتے اور غنویٰ دونوں کو چپ ہونے پر مجبور کیا۔کتا تو فرماں برداری سے سر جھکا کر ایک طرف چل پڑا جبکہ غنویٰ نے خوف کے باعث بند کی جانے والی آنکھیں کھول کر اپنے سامنے کھڑے اجنبی کو دیکھا۔

''آپ کون ہیں؟'' سوال خود بخود ہونٹوں پر چلا آیا۔

''ویری گڈ......! جو بات مجھے پوچھنا چاہیئے وہ آپ مجھ سے پوچھ رہی ہیں۔یہ میرا گھر ہے۔اس لئے سوال پوچھنے کا حق بھی مجھے ہے۔بتائیں کون ہیں آپ......؟'' وہ ڈپٹ کر پوچھ رہا تھا۔

''میں غنویٰ ہوں غنویٰ نصیر۔'' کتے کی دہشت ابھی تک حواسوں پر چھائی ہوئی تھی۔اپنے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیرتے اس نے جواب دیا تو سامنے والے کو مزید طیش آگیا۔

''کون غنویٰ ......اس ملک کی پرائم منسٹر یا پریذیڈنٹ۔جنہیں میں نام سنتے ہی پہچان جاؤں گا۔''

''نہیں' اصل میں' برابر والے گھر سے آئی ہوں۔وہ میرے ماموں کا گھر ہے میں اپنے کزنز کے ساتھ لان میں کرکٹ کھیل رہی تھی تو شارٹ ذرا زیادہ زور سے لگ گیا اور بال ادھر آپ کے لان میں آگری۔یہ گھر پچھلے تین سال سے خالی تھا اس لیے بجائے بیل بجا کر دروازے سے آنے کے میں دیوار پھلانگ کر یہاں آگئی مگر وہ کتا......'' اس نے ایک بار پھر خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔

''تین سال سے گھر خالی تھا' یہ تو آپ کو معلوم ہے لیکن تین ماہ سے یہاں رہ

رہا ہوں یہ آپ نہیں جانتیں ماشاءاللہ آپ خود کو حسینہ معین کی ہیروئن سمجھ رہی تھیں جو اوٹ پٹانگ حرکتیں کر کے دوسروں کو متاثر کرنے کی کوشش کرتی ہے۔"

"آپ حد سے بڑھ رہے ہیں مسٹر!" اس کے طنزیہ لہجے نے اسے غصہ دلایا۔

"حد سے میں نہیں' آپ بڑھی ہیں۔ کسی کے گھر یوں چوری چھپے داخل ہونا جرم ہے۔ ابھی چاہوں تو پولیس کو کال کر کے آپ کو گرفتار بھی کروا سکتا ہوں"۔

"تو بلا لیجیے' دیکھتی ہوں کیا بگاڑ لیتی ہے پولیس میرا۔" اپنی اخبار کی نوکری کا زعم خود بخود ہی لہجے میں آ گیا۔

"صدیق صاحب کی کوئی عزیز اتنی بدتمیز اور قانون شکن ہو سکتی ہیں مجھے نہیں معلوم تھا۔ شکر کریں کہ میں اس وقت اپنے کسی کام سے گھر آیا ہوا تھا' ورنہ میری غیر موجودگی میں یہ کتا جو میں گھر کی حفاظت کے لیے کھلا چھوڑ کر جاتا ہوں آپ کا حشر نشر کر دیتا۔" غزنوی نے دیکھا۔ بائیں کاندھے پر کوٹ لٹکائے دائیں ہاتھ میں فائل تھامے وہ یقیناً آفس کے لیے نکل رہا تھا اسے یکدم ہی اپنی غلطی اور پوزیشن کا احساس ہوا۔

"سوری۔" یک لفظی معذرت کرتی وہ جھپاک سے گیٹ سے باہر نکل گئی۔

سامنے ہی فیصل اور آذر اپنے گیٹ کے سامنے کھڑے تھے۔

"سوری آپی!" اسے دیکھتے ہی ان دونوں نے کان پکڑ لیے لیکن وہ سخت خفا تھی سوان سنی کرتی گھر میں گھس گئی۔

"پلیز آپی! معاف کر دیں ورنہ پاپا ہم پر سخت غصہ ہوں گے۔" وہ دونوں بھی اس کے پیچھے پیچھے تھے۔

"سوری آپی! وہ میں نے سوچا کہ نن بھائی تو اس وقت گھر پر نہیں ہوتے اگر آپ جا کر بال لے آؤ گی تو کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا لیکن وہاں ڈاگ بھی ہوتا ہے مجھے نہیں معلوم تھا۔ پلیز آپ یہ سب پاپا کو مت بتایئے گا ورنہ وہ ہمیں سخت سزا دیں گے۔" وضاحت پیش کرتے اس نے ایک بار پھر ماموں سے شکایت نہ کرنے کی استدعا کی۔

"او کے' اب جا کر منہ ہاتھ دھوؤ میں کھانا لگاتی ہوں۔" وہ دونوں بھائی اس



قدر شرمندہ اور خوفزدہ تھے کہ غزنوی کو تھوڑی دیر پہلے اٹھائی جانے والی بے عزتی کو بھول کر اپنا موڈ ٹھیک کرنا پڑا۔

☆☆☆

"وقت دیکھو' کتنا ہو رہا ہے اور ابھی تک تم لوگ نہانے دھونے سے ہی فارغ نہیں ہوئیں۔ کیا رات بارہ بجے پہنچو گی شادی میں۔"

منی کو تولیہ اٹھائے غسل خانے کی طرف جاتے دیکھ کر حمیدہ بیگم نے شور مچایا۔

'اوہو اماں! بس ابھی پانچ منٹ میں نہا لوں گی۔ ابھی تو طوبیٰ بجو بھی نہیں آئیں اکیڈمی سے۔" منی نے انہیں جواب دے کر غسل خانے کا دروازہ بند کر لیا۔

"اس طوبیٰ کو بھی آج ضرور جانا تھا اکیڈمی ایک دن کی چھٹی کر لیتی تو کوئی غضب تو نہیں ہو جاتا وہاں تمہارے ابا بیٹھے ہوں گے انتظار میں۔ دیر تم لوگ کرواؤ گی اور سارے خاندان کے سامنے باتیں مجھے سننا پڑیں گی۔"

اماں مزید فکر مند ہوئیں۔ اصل میں آج نوشابہ کی شادی تھی۔ ابا اور چھوٹی ہدیٰ تو پہلے سے ہی وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ اماں بیٹیوں کی نوکری پڑھائی اور دیگر مسائل میں ابھی ان کے ساتھ ہی گھر پر رکی ہوئی تھیں لیکن لحہ بہ لحہ گزرتا وقت انہیں ہولا رہا تھا۔ جانتی تھیں شوہر اپنے بہن بھائی کے معاملے میں ہونے والی کوتاہیوں کو معاف کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔

"آپ پریشان نہ ہوں اماں! پہنچ جائیں گے ہم لوگ وقت پر۔ آج کل باراتیں گیارہ ساڑھے گیارہ سے پہلے کب آتی ہیں اور ابھی تو صرف پونے آٹھ ہی ہوئے ہیں۔ طوبیٰ بھی بس آتی ہی ہو گی۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کے پیپرز نزدیک ہیں پھر آج اکیڈمی میں ٹیسٹ بھی تھا تو وہ بے چاری چھٹی کیسے کر سکتی تھی۔ کپڑے وغیرہ تیار ہیں اس کے بس آتے ہی تیار ہو جائے گی۔" غزنوی نے ان کی گھبراہٹ کو دیکھتے ہوئے تسلی دی۔ وہ خود آفس سے کچھ دیر پہلے ہی آئی تھی اور نہا دھو کر ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیض میں بڑے ریلیکس انداز میں بیٹھی ٹی وی پر کوئی ٹاک شو دیکھ رہی تھی۔ دیگر بہنوں کی طرح اماں نے

اسے یوں آرام سے بیٹھنے پر اس لیے نہیں ٹوکا تھا کہ جانتی تھیں وہ منٹوں میں تیار ہو جاتی ہے۔

''اسریٰ آپی نے کیا کہا تھا۔ آئیں گی شادی میں یا نہیں......؟'' ٹی وی کا والیوم کم کرتے اس نے اماں کا دھیان بٹانا چاہا۔

''دیکھو، ویسے تو کہہ رہی تھی کہ مشکل ہے۔ ابھی ہفتہ بھر تو ہوا ہے اسے واپس سسرال گئے۔ وہ لوگ پوری کسر نکالیں گے اتنے دن میکے میں گزارنے کی۔'' اسریٰ کا ذکر انہیں مزید پریشان کر گیا۔

''ویسے عادت ہو گئی تھی اتنے دنوں میں ان کی۔ خاص طور پر ان کی بیٹی سے بڑی رونق تھی۔ اب تو آفس سے واپس آؤ تو گھر خالی خالی لگتا ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔ یہ سب بھی اُداس ہو رہی تھیں۔ کھلونا ہاتھ لگا ہوا تھا سب کے۔ روز تو نئی فراک سلتی تھی بھانجی کے لئے۔ میرا بھی دل بہلا رہتا تھا۔'' نواسی کا ذکر آتے ہی ان کے چہرے پر مسکراہٹ چلی آئی جسے ڈور بیل کی مسلسل آواز نے غصے میں بدل دیا۔

''لو آگئیں تمہاری بہنا۔ جا کر دروازہ کھول دو۔ ان سے تو ایک پل بھی لگ رہا ہے صبر نہیں ہو رہا۔ میں جا کر سونیا کو دیکھتی ہوں۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی بیٹیوں کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

''کیا بدتمیزی ہے طوبیٰ! تھوڑا سا صبر نہیں کر سکتیں......؟'' دروازہ کھولتے اس نے طوبیٰ کو ڈپٹا مگر پھر اس کے چہرے پر چھائے خوفزدہ سے تاثرات کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

''کیا ہوا......؟'' اس نے پوچھا تو طوبیٰ نے بے ساختہ ہی گردن موڑ کر باہر کی طرف دیکھا۔

''کون ہے باہر......؟'' غنویٰ نے پوچھتے ہوئے باہر گلی میں جھانکا تو دو لڑکے گھر سے کچھ فاصلے پر جاتے ہوئے دکھائی دیئے۔

''طوبیٰ! اماں کہہ رہی ہیں، جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے



اور آپی! اب آپ بھی تیاری پکڑ لیں، ورنہ اماں کا ٹینشن سے برا حال ہو جائے گا۔''

سونیا کی آمد پر وہ طوبیٰ سے مزید کچھ نہ پوچھ سکی جبکہ گھبرائی گھبرائی سی طوبیٰ نے فوراً ہی اندر کی راہ پکڑی تھی۔

''ہوں گے محلے کے کوئی آوارہ، جنہیں دیکھ کر طوبیٰ ڈر گئی ہے۔'' اس نے دروازہ بند کرتے خود ہی نتیجہ اخذ کیا اور تیار ہونے چل پڑی۔

☆☆☆

''کیسی ہو غنویٰ نصیر......!'' سیڑھیاں چڑھتے عباس اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''بہت اچھی۔'' خاندان کی شادی تھی، سو عباس کی وہاں موجودگی غیر متوقع نہیں تھی۔ غیر متوقع تھی اس کی جرأت جس کا مظاہرہ کرتے وہ غنویٰ سے مخاطب تھا۔

''اس میں تو خیر کوئی شک نہیں کہ تم بہت اچھی ہو۔'' فیروزی اور پرپل امتزاج کے سوٹ پر لائٹ سا میک اَپ کئے غنویٰ کا اس نے بغور جائزہ لیا۔

''راستہ چھوڑو میرا۔'' دوپٹہ سنبھالتے اس نے عباس کو ڈپٹا۔ ٹیکسی والے کے پاس چینج نہیں تھا۔ اس سے باقی رقم کا حساب کتاب کرتے غنویٰ کو ذرا دیر لگ گئی تھی جبکہ اماں اور بہنیں آگے جا چکی تھیں اور وہ تنہائی کا فائدہ اٹھا رہا تھا۔ مایوں مہندی میں تو وہ اپنی مصروفیت کی وجہ سے شریک ہی نہیں ہو سکی تھی اور اب شادی میں آئی تھی تو پہلے ہی مرحلے پر ناخوشگوار صورت حال کا سامنا تھا۔

''میں نے کہا۔ میرا راستہ چھوڑو۔'' عباس کو ڈھٹائی سے جمے دیکھ کر اس نے ایک ایک لفظ چباتے ہوئے اپنی بات دُہرائی۔

''جب بھی کرتی ہو، چھوڑنے کی ہی بات کرتی ہو۔ تمہاری اس عادت نے تو ہمیں برباد ہی کر دیا۔'' جانے وہ دل گرفتہ تھا یا صرف دکھائی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اب ان باتوں کا کیا مقصد؟ آخر کیا چاہتے ہو۔'' اس نے بیزاری سے پوچھا۔

جہاں پھولوں کو کھلنا تھا، وہیں کھلتے تو اچھا تھا
تم ہی کو ہم نے چاہا تھا، تم ہی ملتے تو اچھا تھا

''شٹ اپ......!'' عباس کے بے حد اسٹائل سے شعر پڑھنے پر وہ مشتعل ہو کر غرائی اور ایک ہاتھ سے اسے دھکا دیتی راستہ بنا کر سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔ یہ تو شکر تھا کہ ابھی بارات نہیں آئی تھی اور خاندان کے بھی گنے چنے لوگ پہنچے تھے، ورنہ کسی کی نظر پڑ گئی ہوتی تو غنویٰ کو مزید پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا۔ ویسے یہ بھی حیرت کا ہی مقام تھا کہ اس دوران کوئی بھی سیڑھیوں کی طرف نہیں آیا تھا اور اوپر پہنچتے ہی اسے اس کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی۔ ایک ٹیبل کے گرد لوگوں کا رش لگا تھا اور وہاں سب سے نمایاں اماں کا آنسوؤں سے تر چہرہ تھا۔

''کیا ہوا اماں......!'' وہ ہر ایک شخص کو نظر انداز کرتی تیزی سے اماں کی طرف بڑھی۔

''بیٹی......! ہم لوگ چاہتے ہیں بہن بھائی میں صلح ہو جائے۔ ناخنوں کو ماس سے جدا کرو تو تکلیف برداشت نہیں ہوتی۔ بہتر ہے آج اس خوشی کے موقع پر تم لوگوں کا ملاپ ہو جائے۔ خدانخواستہ کل کو کسی بری گھڑی پر ملنا پڑا تو شرمندگی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔'' خاندان کے ایک بزرگ نے سمجھایا تو اس نے اماں کی طرف دیکھا۔

''مجھے اللہ نے بیٹا نہیں دیا تھا لیکن میں نے ہمیشہ ''ان'' کے بھانجوں، بھتیجوں کو اپنے بیٹے سمجھا۔ مجھے بھی تکلیف ہوتی ہے، یوں سب سے جدا ہونے پر۔'' اماں نے روتے ہوئے ان بزرگ سے کہا تو غنویٰ بے بسی سے انہیں دیکھ کر رہ گئی۔ وہ ہزار اسے اپنے بیٹوں جیسا کہتیں لیکن پھر بھی ان کی تشنگی سامنے آ ہی جاتی تھی۔

''غنویٰ......! جھگڑے کی ابتداء تم سے ہوئی تھی۔ اس لئے تم اپنی پھپھو سے اپنی بدتمیزی کی معافی مانگو۔'' اسے ملنے والا یہ حکم بہت کڑا تھا۔ حق پر ہوتے ہوئے بھی اسے معتوب ٹھہرایا جا رہا تھا۔ اس کا دل چاہا چیخ کر انکار کر دے لیکن اماں کے برستے آنسو اور ابا کا سپاٹ چہرہ اسے مجبور کیے دے رہے تھے۔



''سوری پھپھو......!'' اس نے خود پر جبر کرتے کرسی پر بیٹھی پھپھو سے جھک کر کہا تو انہوں نے فوراً ہی اسے گلے لگا لیا۔

''میری قسمت خراب تھی کہ میں اپنی پھولوں جیسی بھتیجی کو چھوڑ کر وہ ببول کا جھاڑ اپنے گھر لے آئی۔ دن رات کانٹوں پر تڑپا رہی ہے ہمیں۔'' پھپھو کی بے تکی بات نے اسے جزبز سا ہو کر ان سے دور ہونے پر مجبور کیا۔

''شروع ہو گئے بڑی بی کے ڈرامے، ارے میں تو کہتی ہوں بھتیجی عقل مند تھی۔ ان کی فطرت پہچان گئی اور اپنا دامن بچا لیا۔ نصیب تو میرا خراب تھا جو میں ان کے چنگل میں پھنس گئی۔''

پھپھو کی بہو کے بارے میں جیسا سنا تھا، وہ اس سے کچھ بڑھ کر ہی تھی۔ بے ادب اور بدلحاظ۔ خاندان والوں کی موجودگی کا لحاظ کیے بغیر جو عورت اتنا بول سکتی ہو وہ بھلا گھر کے اندر کیسے کیسے تماشے نہ لگاتی ہوگی۔

تھوڑی دیر پہلے عباس کے رویے سے ہونے والی کوفت خود بخود ہی ختم ہو گئی کیونکہ عباس کے اپنے حصے میں زندگی بھر کی کوفت آئی تھی۔

پھپھو، اماں ابا سے گلے ملنے کے بعد اب باقی بھتیجیوں کو گلے لگا رہی تھیں۔ غنویٰ اس منظر سے نکل کر ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گئی تاکہ نوشابہ سے مل سکے۔

☆☆☆

''آج حسنین حیدر کے تھیٹر گروپ کا ڈرامہ ہے۔ شام میں آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا غنویٰ۔'' ضیاء نے اسے مطلع کیا تو اپنے کام کو جاری رکھتے اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''آپ انٹرویو کے لئے آؤٹ لائن بنا لیجئے گا۔ ہم پروگرام شروع ہونے سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے۔ میں نے حسنین حیدر سے فون پر ٹائم لے لیا ہے۔ ڈرامے کی کوریج کے ساتھ ساتھ اگر اس کا انٹرویو بھی چھپ جائے تو اچھا ہے۔''

''اوکے......! میں کر لوں گی۔'' اس نے ضیاء کو تسلی دی۔ سنجیدہ تھیٹر کے حوالے

سے کچھ عرصے سے حسنین حیدر کے نام کی بازگشت بہت تسلسل سے سنائی دے رہی تھی۔
اس نے اپنے تھیٹر گروپ کا نام ایم(Aim) رکھا تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ Aim کے ہر ڈرامے کے پیچھے یہ Aim (مقصد) ہوتا ہے کہ لوگوں کو کوئی اچھا میسج دیا جا سکے۔ اب سے پہلے وہ لاہور کے تھیٹرز میں کام کرتا رہا تھا۔ کراچی میں اس کا یہ پہلا تھیٹر تھا۔ اسی لئے ضیاء اس کی کوریج پر خصوصی زور دے رہا تھا۔

غنویٰ نے اپنے سامنے پھیلے کام کو سمیٹتے ضیاء کی ہدایت کے مطابق حسنین حیدر کے انٹرویو کی تیاری شروع کر دی۔ اس سلسلے میں اسے کچھ پرانے ریکارڈز بھی دیکھنا پڑے تھے کیونکہ وہ چاہتی تھی کہ جب وہ حسنین حیدر کے سامنے پہنچے تو اس کے پاس اس کے کام کے حوالے سے ٹھیک ٹھاک انفارمیشن موجود ہو، ورنہ ضیاء سے جھاڑ پڑنے کا خدشہ تھا۔ گھر فون کر کے اس نے اپنی دیر سے واپسی کے بارے میں اماں کو مطلع کر دیا تھا۔ اس کی جاب کی نوعیت ایسی تھی کہ کبھی کبھار ہی سہی لیکن اسے دیر تک باہر رُکنا پڑتا تھا۔ ایسے میں اگر اماں کو قبل از وقت آگاہ نہ کیا جاتا تو وہ اس کے گھر واپس آنے تک ہولتی ہی رہتی تھیں۔

''ہوں......! اچھے سوالات ہیں۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ روٹین سے ہٹ کر ذرا کام کا انٹرویو ہو۔ خود حسنین بھی چڑتا ہے اس قسم کے سوالوں سے جس میں اس سے اس کے پسندیدہ رنگ، غذا، ڈریس وغیرہ کے بارے میں پوچھا جائے۔ اس کا کہنا ہے کہ میرا حوالہ میرا کام ہے اس لیے بات بھی اسی حوالے سے ہونا چاہیے۔''

روانگی سے قبل ضیاء نے اس کے تیار کردہ سوال نامہ کو دیکھتے ہوئے اسے سراہنے کے ساتھ ساتھ حسنین حیدر کے بارے میں بھی بتایا۔ اس کے لہجے میں حسنین حیدر کے لیے ایک خاص قسم کی ستائش تھی۔

''لگتا ہے تمہاری حسنین حیدر سے اچھی خاصی واقفیت ہے۔'' غنویٰ نے اندازہ لگایا۔

''بہت زیادہ نہیں لیکن اکثر لاہور کے دورے میں میری اس سے ملاقات ہوتی



رہی ہے۔ بہت بریلینٹ شخص ہے۔ اپنے لکھے ہوئے کو خود ڈائریکٹ کرتا ہے۔ ساتھ کام کرنے والے کہتے ہیں حسنین حیدر کی پرفکشن کے معیار پر پہنچنے میں دانتوں پسینہ آجاتا ہے۔''

ساتھ ساتھ باہر نکلتے ضیاء نے مزید بتایا اور غنویٰ بغیر ملے ہی حسنین حیدر سے مرعوب ہونے لگی۔ ضیاء کی زبان سے کسی شخص کی تعریف نکلنے کا مطلب تھا وہ شخص حقیقتاً بہت زبردست ہے۔ ضیاء یونہی کسی عام شخص کو گھاس نہیں ڈالتا تھا۔

''حسنین صاحب اسٹیج کے پیچھے والے روم میں آپ لوگوں کا انتظار کر رہے ہیں۔'' تھیٹر پہنچنے پر ایک آدمی نے انہیں خوش آمدید کہتے ہوئے ان کی رہنمائی بھی کی۔

اسٹیج کے پیچھے لائن سے تین چار رومز تھے کاریڈور میں لوگوں کا آنا جانا لگا ہوا تھا۔ ضیاء نے ایک شخص کو روک کر حسنین حیدر کا روم پوچھا۔

''یس کم ان۔'' دروازے پر دستک دینے پر فوراً ہی جواب ملا۔

''ضیاء! آؤ یار' بیٹھو۔'' اندر داخل ہوتے ہوئے وہ ضیاء سے دو قدم پیچھے تھی اس لیے اس کی نگاہ صرف ضیاء پر ہی پڑی۔

''اسٹیج کے لیفٹ سائیڈ پر تیسری لائٹ کچھ ڈسٹرب ہے۔ تم اسے دیکھو ابھی پندرہ منٹ میں مجھے اسٹیج بالکل ریڈی ملنا چاہیے۔''

وہ اپنے سامنے کھڑے شخص کو ہدایات دے رہا تھا اور غنویٰ حیرت سے اس شخص کو دیکھ رہی تھی۔ ابھی کچھ دن پہلے اس شخص کو اس نے ٹو پیس سوٹ میں بہت نک سک سے تیار دیکھا تھا جس کی ڈریسنگ سے لے کر بارعب انداز تک آج بالکل بدلا ہوا تھا۔ جینز کی پینٹ پر ڈھیلی ڈھالی ٹی شرٹ قدرے بکھرے ہوئے بالوں کے ساتھ وہ ایک لاابالی سا لڑکا لگ رہا تھا۔

''سوری یار! چاہے پہلے سے کتنی ہی تیاری رکھو لیکن عین وقت تک کچھ نہ کچھ پرابلم رہتا ہی ہے اور پھر یہاں سارا سیٹ اپ بھی نیا ہے وہاں کے لوگوں کو میری عادت اور کام کرنے کے اسٹائل کا معلوم تھا یہاں ایڈجسٹ کرنے میں تھوڑی وقت ہو رہی

ہے۔'' ان لوگوں کی طرف رخ کرتے اس نے ضیاء کو مخاطب کرتے ہوئے معذرت خواہانہ لہجے میں وضاحت دی۔

''ضیاء کا تو مجھے معلوم ہے کہ یہ کافی پیئے گا مس! آپ بتائیں کہ آپ کیا لینا پسند کریں گی۔'' اس بار اس نے براہ راست غنویٰ کو مخاطب کیا۔

''میں بھی کافی ہی لے لوں گی۔'' اس کے طرز تخاطب اور آنکھوں کی اجنبیت سے غنویٰ کو سکون ہوا کہ وہ اسے پہچان نہیں سکا ورنہ اسے بہت شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔

''لاہور میں اچھے خاصے سیٹ اپ کو چھوڑ کر کراچی شفٹ ہونے کے پیچھے کوئی خاص وجہ؟'' وہ خود باہر تک جا کر کافی کا آرڈر دے کر آیا تھا واپس آ کر سیٹ پر بیٹھا تو غنویٰ نے سوال داغا۔

''وجہ میرے والد محترم ہیں انہوں نے کہا۔ بیٹا! کھیل تماشے بہت ہو گئے اب کراچی جا کر وہاں کا آفس سنبھالو اور یوں ہم آپ کے شہر میں گزشتہ تین ماہ سے قیام پذیر ہیں۔''

''یعنی آپ کے والد کو آپ کا تھیٹر کرنا پسند نہیں۔''

''نہیں' یہ بات نہیں لیکن اکلوتا بیٹا ہونے کی حیثیت سے وہ مجھ سے یہ امید رکھتے ہیں کہ میں ان کے بزنس میں انہیں سپورٹ کروں۔'' اس کے خیال کی تردید کرتے حسنین نے وضاحت دی۔

''اور آپ اب پھر تھیٹر کی دنیا میں لوٹ آئے ہیں۔''

''میں تھیٹر کی دنیا سے کبھی نکلا ہی نہیں۔ تین مہینے کا عرصہ جو بظاہر میں نے خاموشی سے گزارا ہے اصل میں بے حد مصروف تر تھا۔ اسکرپٹ تیار کر کے اس کے حساب سے اداکاروں کی تلاش ہال کی بکنگ' ریہرسل' پبلسٹی اور انویٹیشنز وغیرہ کے مسائل سے نمٹنا جبکہ میں اپنے بزنس کو بھی ٹائم دے رہا ہوں کافی محنت طلب کام ہے۔'' وہ بہت سنجیدگی سے اس کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا جبکہ ضیاء اس دوران خاموشی سے بیٹھا



تھا۔

''آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ اپنے تھیٹر کے ذریعے لوگوں کو صحت مند رجحانات دیتے ہیں تو کیا آپ کے خیال میں ڈرامہ لوگوں کی سوچ اور ویلیوز پر اثر ڈال سکتا ہے؟'' غنویٰ کا سوال کافی بہ چبھتا ہوا تھا۔

''اصل بات یہ ہے مس کہ میں اپنے حصے کا کام پوری دیانت داری سے انجام دے رہا ہوں میرے پاس ایک پلیٹ فارم ہے جہاں سے میں لوگوں کو میسج دے سکتا ہوں۔ اب چاہے چند افراد ہی اس میسج کو ریسیو کر کے معاشرے میں پوزیٹوری ایکشن دیں۔ میرا مقصد بہر حال پورا ہو جاتا ہے اور کچھ نہیں تو مجھے کم از کم یہ اطمینان تو ضرور ہے کہ میں لچر اور بیہودہ فقرے بول کر لوگوں کو ہنسانے یا دیوار پھلانگ کر گھر میں گھسنے کا والی لڑکی کے عشق میں ہیرو کو مبتلا کرنے جیسے ڈرامے نہیں لکھ رہا۔''

اس کے جواب نے غنویٰ کی قوت گویائی سلب کر لی۔ اس کا دیا ہوا حوالہ ایسا تھا کہ غنویٰ کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ اتنی دیر سے ناشناسائی کا جو مظاہرہ کر رہا تھا وہ سراسر اداکاری تھی۔

''فیملی تمہاری لاہور میں ہی ہے تو یہاں اکیلے گھر میں کیسا فیل کرتے ہو؟'' غنویٰ کو خاموش دیکھ کر ضیاء نے سوال و جواب کا سلسلہ آگے بڑھایا۔ ''فیملی کو مس کرنا نیچرل بات ہے البتہ اکیلے گھر کے حوالے سے کوئی فیلنگز نہیں کیونکہ گھر جانے کا موقع بہت مشکل سے ملتا ہے اور جب جاتا ہوں تو اتنی شدید تھکن کے ساتھ کہ کچھ سوچنے سے پہلے ہی نیند دبوچ لیتی ہے۔''

''گھر کے انتظام کو کون مین ٹین کرتا ہے؟'' گفتگو پروفیشنل باتوں سے ہٹ کر پرسنل ایشوز کی طرف جا رہی تھی۔

''پہلے جز وقتی ملازمہ صفائی وغیرہ کر جاتی تھی حفاظت کے لیے کتا رکھ چھوڑا تھا لیکن پھر احساس ہوا کہ یہ کچھ مناسب نہیں اس لیے اب ایک میاں بیوی کو رکھ لیا ہے دونوں مل کر سب کچھ دیکھ لیتے ہیں۔'' غنویٰ کی طرف بطور خاص دیکھتے اس نے جواب

دیا۔ چہرے پر چھائی سنجیدگی کے باوجود غنوی کو اس کی آنکھوں میں شرارت کی جھلک دکھائی دی۔

"آج کے ڈرامہ کے حوالے سے کیا کہو گے؟" ضیاء کو شاید کچھ احساس ہوا تھا سو اس نے گفتگو کا رخ واپس اس کے کام کی طرف کیا۔

"یہ ڈرامہ ہمارے معاشرے میں رائج غیر ضروری رسومات اور فرسودہ عقائد پر ضرب لگانے کی ایک کوشش ہے کیونکہ ان رسومات اور عقائد نے لوگوں کو اس بری طرح جکڑ رکھا ہے کہ ان کی زندگیاں ایک دائرے میں محدود ہو کر رہ گئی ہیں یہ رسومات غیر ضروری اخراجات سے لے کر جرم کے ارتکاب تک کے مراحل کو کیسے جنم دیتی ہیں ہم نے اپنے ڈرامے میں دکھانے کی کوشش کی ہے۔"

"اب وہ بہت سنجیدگی اور بردباری سے ڈرامہ کے موضوع کی وضاحت پیش کر رہا تھا۔ اس کی گفتگو میں کئی ایسے مقامات آئے کہ غنوی کو اپنی خاموشی توڑ کر اس کے ساتھ شامل ہونا پڑا۔

"واقعی Aim (ایم) والوں کا کام مختلف اور بامقصد ہے۔" حسنین حیدر کے انٹرویو کے بعد اس نے ضیاء کے ساتھ ڈرامہ بھی دیکھا تھا۔ ہال سے باہر نکلتے ہی بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا تھا۔

"ہاں' یہ لوگ واقعی چونکا دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اصل تو حسنین کی محنت ہے لاہور سے یہاں آنے کی وجہ سے اس کے ساتھ کام کرنے والے بہت سے لوگ چھوٹ گئے ہیں لیکن نئے لوگوں کے ساتھ بھی اس نے اپنا معیار برقرار رکھا' یہ بہت بڑی بات ہے۔" ضیاء نے تائید کی۔

"تمہیں گھر چھوڑ دیتا ہوں۔ انٹرویو کو فائنل کر کے اسی سنڈے کے میگزین میں لگا دینا میں واپسی میں آفس جاؤں گا۔ کل صبح کے اخبار میں حسنین کے ڈرامے پر چھوٹی سی خبر تو کم از کم لگنی ہی چاہیے۔"

ضیاء نے اسے ہدایت دینے کے ساتھ اپنا پروگرام بھی بتایا۔



"صدیق صاحب سے آج کل ملاقات نہیں ہوتی۔ کہاں مصروف ہیں وہ۔؟"

گاڑی روڈ پر ڈالتے اسے خیال آیا تو پوچھنے لگا۔

"ماموں آج کل جاپان جانے کی تیاریوں میں لگے ہیں۔" ان کی کمپنی انہیں پانچ سال کے لیے وہاں بھیج رہی ہے۔" غنوی نے بتایا۔

"پانچ سال ...... پھر تو فیملی کو بھی ساتھ لے جا رہے ہوں گے۔"

"بالکل اتنا عرصہ بیگم اور بچوں کے بغیر کہاں رہ سکتے ہیں وہ۔" غنوی نے ہنس کر بتایا۔

"ابھی تو کچھ عرصہ ہیں ناوہ یہاں۔ اصل میں امی ایک دو دن میں تمہاری طرف آنے والی ہیں۔ سونیا کے حوالے سے میں نے ان کو قائل کر لیا ہے۔ اس موقع پر صدیق صاحب بھی اگر موجود ہوں تو امی کو سپورٹ مل جائے گی۔" ضیاء نے کہا۔

"تم فکر مت کرو' ماموں کو تمہارے حق میں ووٹ ڈالنے سے پہلے پاکستان کی حدود سے نکلنے نہیں دوں گی میں۔" غنوی نے نہایت جوش سے اسے تسلی دی۔ اس دن کے بعد سے ضیاء کی طرف سے پہلی پیش رفت ہوئی تھی۔ سو اس کا خوش ہونا فطری تھا۔

☆☆☆

بیٹا! چاول بڑھا لینا تمہاری پھپھو کا فون آیا ہے کہ وہ لوگ پہنچ رہے ہیں۔" وہ یخنی کے لیے پیاز براؤن کر رہی تھی کہ اماں نے کچھ الجھے الجھے سے تاثرات کے ساتھ اسے ہدایت دی۔

"اف ...... انہیں بھی آج ہی آنا تھا۔" اپنی عادت کے برعکس وہ کچھ جھنجلا گئی۔ ضیاء کی فیملی آج ان کے گھر آ رہی تھی' ایسے میں پھپھو کا اپنی فیملی کے ساتھ آنا اسے تشویش میں مبتلا کر رہا تھا۔

"اب جو بھی ہو لیکن میں انہیں آنے سے منع تو نہیں کر سکتی۔ تعلقات بحال ہونے کے بعد پہلی بار آ رہی ہیں۔" اماں بھی اپنی جگہ مجبور تھیں۔

"اسریٰ آپی کو آنے کے لیے کہا آپ نے؟"

"نہیں فون پر تمہیں معلوم ہے کہ بات نہیں ہوتی۔تمہارے ابا کو ہی جا کر اسے لانا پڑتا میں نے کہا۔رہنے دیں ابھی تو وہ لوگ سونیا کو دیکھنے آرہے ہیں۔کون سا منگنی یا شادی ہو رہی ہے۔کوئی رسم کرنے کی نوبت آئے تو پھر دیکھیں گے۔"

"ان شاء اللہ وہ وقت بھی آئے گا' آپ فکر نہ کریں اور طوبیٰ صفائی سے فارغ ہوگئی ہو تو یہاں میرے پاس بھیج دیں۔" اس نے کہا تو وہ پرامید سی کچن سے باہر نکل گئیں۔

"جی آپی! کیا کام ہے؟" تھوڑی دیر میں طوبیٰ اس کے سامنے تھی۔

"یہ ہرا مسالہ ملا کر کبابوں کی ٹکیاں بنا لو۔بعد میں تل لیں گے تا کہ گرم رہیں۔" اس نے اپنے کام میں مصروف رہتے طوبیٰ کو ہدایت دی۔چھوٹے چھوٹے کام تو منی اور ہدیٰ دیکھ ہی رہی تھیں۔چنانچہ جب پھپھو اور ضیاء کی فیملیز آگے پیچھے پہنچیں تو ہر چیز تیار تھی۔

"دیکھیں بھائی صاحب! ضیاء کی کوئی بات ایسی نہیں کہ غنویٰ سے چھپی ہو۔ساتھ کام کرتے ہیں ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔سچ پوچھیں تو ہم بھی غنویٰ کو ہی دیکھ کر آپ کے گھر آئے ہیں۔اس نے کہا کہ میری بہن میری طرح ہے تو ہم نے یقین کر لیا۔شکل صورت کو ہم اتنی اہمیت نہیں دیتے۔اصل چیز سیرت ہے اور غنویٰ کو دیکھ کر ہمیں آپ کی ہر بیٹی کی سیرت کا اندازہ ہو گیا۔آپ نے یقیناً اپنی سب بیٹیوں کو ایک جیسی تربیت دی ہوگی' اس لیے ہماری طرف سے ہاں ہے۔آپ اجازت دیں تو ہم ابھی سونیا بیٹی کا منہ میٹھا کر جائیں ورنہ جیسی آپ کی مرضی۔" امی نہایت سبھاؤ سے بات کر رہی تھیں۔

"یہ بات تو آپ نے سولہ آنے سچی کہی بہن کہ میری ہر بھتیجی سیرت میں یکتا ہے۔سچ ہے ہیرے کی پہچان جوہری کو ہی ہوتی ہے ورنہ ہم جیسے تو چمکتی دمکتی چیزوں کو ہیرا سمجھ کر کنکر پتھر اپنے دامن میں جمع کر لیتے ہیں۔" ان لوگوں کے اندیشوں کے برعکس پھپھو ضیاء کی فیملی سے بہت اچھی طرح ملی تھیں اور اب بھی بھتیجیوں کی تعریف میں رطب



اللسان تھیں۔

"سچ تو یہ ہے کہ بیٹیوں کے معاملات میں بہت چھان بین کی ضرورت ہوتی ہے لیکن آپ کا معاملہ مختلف ہے جیسے آپ میری بیٹی پر اعتماد کر کے میری گھر تک آئے ہیں ویسے ہی مجھے بھی اعتبار ہے کہ اس نے اپنی بہن کے لیے بہترین شخص منتخب کر کے ہی آپ کو یہاں آنے کی دعوت دی ہوگی اس لیے میری طرف سے ہاں ہے۔آج سے سونیا مجھ سے زیادہ آپ کی بیٹی ہے۔"

ابا کے الفاظ امرت بن کر غنویٰ کے کانوں میں ٹپکے تھے۔اس نے بے یقینی سے ابا کے چہرے کی طرف دیکھا۔وہاں بہت مان بھری خوبصورت مسکراہٹ تھی۔اپنی سزا کے خاتمے کی نوید پر غنویٰ کی پلکیں بھیگنے لگیں لیکن وہ سب کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی اس لیے خاموشی سے اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔

"آپی! میں کر لوں گی سب آپ رہنے دیں۔" طوبیٰ اسے دیکھ کر دوڑی آئی۔

ڈرائنگ روم میں ضیاء کی فیملی کی ساتھ صرف بزرگ موجود تھے پھپھو کی آل اولاد اور غنویٰ سے چھوٹی بہنیں دوسرے کمرے میں سونیا کے ساتھ چھیڑ چھاڑ میں لگی تھیں۔

"نہیں' تم سونیا کو دیکھو۔اس کا ہلکا پھلکا میک اپ کروا دو اور کیمرے میں رول چیک کرو۔ضیاء کے پیرنٹس ہلکی پھلکی رسم کا ارادہ کر رہے ہیں۔"

"واقعی!" طوبیٰ خوش ہو کر اندر سب کو بتانے کے لیے بھاگی۔

"اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے آج میرے باپ کی نظروں میں میری عزت بحال کر دی۔" دل ہی دل میں اللہ سے مخاطب وہ اپنے رخساروں پر بہتے آنسوؤں کو انگلی کی پور سے صاف کرتی پلٹی ہی تھی کہ کیمرے کا فلیش چمکا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" سامنے کیمرہ لیے کھڑے عباس کو دیکھ کر اس کا خون کھولا۔

"شبنم کے موتی پھول پر۔یہ تو وہی قصہ ہوا۔" اس کے بھیگے رخساروں کی طرف اشارہ کرتے وہ مسکرایا۔

"تم اپنی حدود میں رہو تو بہت اچھا ہوگا۔" آواز دھیمی کرتے ہوئے اس نے عباس کو تنبیہہ کی۔

"محبت کسی حد کو نہیں مانتی۔"

"شٹ اپ۔" اس کی ڈھٹائی غنوی کو جھلسا رہی تھی۔

"سنا ہے تم شادی کے لیے راضی نہیں ہوتیں۔ یہ جوگ یونہی تو نہیں۔ یقیناً ہماری محبت نے تمہارا دامن تھام کر روک رکھا ہوگا۔" وہ بہت ادا سے بولا تو غنوی کے لیے اپنے غصے پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔

"یہ صرف اور صرف تمہاری خوش فہمی ہے۔"

"میں تمہارے جھوٹ کو سچ مان لوں گا' یہ تمہاری نادانی ہے۔"

"بھائی جان! آپ کو بھابھی صاحبہ یاد کر رہی ہیں۔" اچانک ہی شمس وہاں چلا آیا عباس جو تھوڑی دیر پہلے عشق بھگار رہا تھا تیزی سے واپس پلٹا۔

"ارے یہ کیمرا تو دیتے جائیں۔ طوبیٰ نے کہا کہ تصویریں میں کھینچوں۔" شمس کے ٹوکنے پر اس نے کیمرا اسے تھمایا اور وہاں سے چلا گیا۔

"میں آپ کی ہیلپ کروں غنوی آپی!"

"نہیں اور پلیز اندر جا کر بیٹھو میرا موڈ پہلے ہی بہت خراب ہو رہا ہے۔" عباس کی گفتگو کا نتیجہ تھا کہ اس کے لہجے میں شمس کے لیے بھی تلخی در آئی۔

"اوکے۔ میں جا رہا ہوں مگر میری اتنی بات یاد رکھیے گا کہ ہر شخص ایک جیسا نہیں ہوتا۔ عباس بھائی جیسے بھی ہیں اور جو بھی کرتے ہیں میں نہ اس کا ذمہ دار ہوں اور نہ حصہ دار۔" وہ بہت سرعت سے پلٹ گیا۔ غنوی کو اپنے رویے پر افسوس ہونے لگا۔

☆☆☆

"اف...... اتنی جلدی کیسے ہوگی ساری تیاری۔ سونیا بجو کا جہیز ہمارے کپڑے جیولری سینڈلیں۔ صرف ایک مہینے میں یہ سب کیسے ہوگا؟" ضیاء کی امی بصد اصرار ایک ماہ بعد شادی کی ڈیٹ لے گئی تھیں اور اب چھوٹی منی اور ہدیٰ بے حد خوش ہونے کے ساتھ



ساتھ پریشان بھی تھیں کہ اتنی جلدی تیاری کیونکر ممکن ہو سکے گی۔

"تم لوگوں کو فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں' جہیز لینے سے ضیاء اور اس کے گھر والوں نے سختی سے منع کر دیا ہے۔ مایوں مہندی جیسی فضول رسومات کے بھی وہ لوگ مخالف ہیں۔ لے دے کر ایک شادی اور ولیمہ کی تقریبات ہی ہونی ہیں اس کے لیے بنا لینا دو دو جوڑے۔" غنوی نے انہیں ٹوکا۔

"پھر بھی سوچنا تو پڑے گا۔ آخر ہم دلہن کی بہنیں ہیں۔ کیوں طوبیٰ بجو!" ہدیٰ نے بڑے مدبرانہ انداز میں کہتے طوبیٰ کی رائے جاننی چاہی۔

"آں...... ہاں کیا کیا......؟" وہ بری طرح چونکی۔

"ایک تو یہ طوبیٰ بجو آج کل جانے کن خیالوں میں رہنے لگی ہیں۔ جب بھی بات کرو کہیں گم ملتی ہیں۔" منی ہنسی۔

"کیا بات ہے طوبیٰ! کوئی پریشانی ہے کیا؟" منی کی بات پر غنوی نے بھی اس کی کیفیت کو نوٹ کرتے اس سے پوچھا۔

"نہیں آپی! بس وہ امتحانوں کی ٹینشن ہے۔ سوچ رہی تھی کہ شادی کے چکر میں پڑھائی ڈسٹرب ہوگی۔" نظریں جھکائے جھکائے اس نے وجہ بیان کی۔

"تم بے فکر ہو کر اپنی پڑھائی کرو ہم لوگ ہیں نا۔ سارے کام سنبھال لیں گے ویسے بھی کوئی بہت زیادہ دھوم دھڑکا تو کرنا نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ تمہارے تین چار دن کا حرج ہوگا۔" غنوی نے تسلی دی۔

"ضیاء کے گھر والے تو خیر بہت اچھے لوگ ہیں ان کی تسلیوں اور اصرار کے آگے مجبور ہو کر میں نے شادی کی تاریخ دے بھی دی ہے لیکن پھر بھی سوچ رہی ہوں کہ سونیا کے بھی کچھ ارمان ہوں گے۔ کچھ نہیں تو آٹھ دس جوڑے اور تھوڑا سا زیور ہی اس کی پسند بنوا دوں۔" بڑی دیر سے خاموش بیٹھی اماں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"کیوں نہیں اماں! اب اتنا تو ہم کر ہی سکتے ہیں بلکہ آج میں فارغ ہوں۔ ایسا کرتی ہوں سونیا کو لے کر بازار چلی جاتی ہوں۔" اماں کی تائید کرتے اس نے فوراً ہی

پروگرام بھی سیٹ کرلیا۔

''ٹھیک ہے چلی جاؤ پھر ایک آدھ دن میں اسریٰ کی طرف بھی چلیں گے ابھی تک اسے کوئی خبر نہیں جانے کو تمہارے ابا کے ساتھ بھی جاسکتی ہوں لیکن اس کے سسرال والوں کا پتا ہے کہ بنا لحاظ بولتے ہیں۔اب بھی اچانک شادی طے ہو جانے پر یقین نہیں کریں گے۔یہی سمجھیں گے کہ ہم نے جان بوجھ کر انہیں نہیں بتایا۔سُنی تو بہر حال ہیں ہی ان کی باتیں پرسوں تک کارڈ چھپ کر آجائیں تو پھر ہی جاؤں گی ان کی طرف۔''وہ اسریٰ کے سسرالیوں سے نالاں بھی تھیں اور ان کے ردعمل کا سوچ کر پریشان بھی۔

''آپ فکر نہیں کریں' سب ٹھیک ہو جائے گا۔جاؤ منی سونیا سے کہو تیار ہو جائے ہم بازار جائیں گے۔''اس نے اماں کو تسلی اور منی کو ہدایت دینے کے کام بیک وقت انجام دیے۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ اور سونیا شاپنگ کے لیے روانہ ہو چکی تھیں۔

''ارے آپ لوگ ......السلام علیکم کیا حال چال ہیں۔''وہ ابھی بوتیک میں داخل ہوئی تھیں کہ عرشی سے سامنا ہو گیا۔ضیاء بھی اس کے ساتھ تھا۔

''کیا لینے آئے ہیں آپ لوگ یقیناً شادی کی ہی تیاری ہو رہی ہوگی۔''عرشی نے سونیا کو دیکھتے ہوئے شرارت سے کہا۔

''کچھ خاص نہیں بس سونیا کے لیے اس کی پسند کے کچھ ڈریسز لینے تھے تم لوگوں نے جہیز پر پابندی لگا رکھی ہے مگر میں نے سوچا کہ چلو کم از کم کچھ ڈریسز ہی لے لیں۔''غنویٰ نے مسکراتے ہوئے وضاحت دی سونیا تو ضیاء کو سامنے پا کر بالکل ہی خاموش تھی۔

''تم لوگ ڈریسز پسند کرو میں انتظار کر رہا ہوں۔''ضیاء نے سنجیدگی سے کہا تو وہ لوگ آگے کی طرف بڑھ گئیں۔باہمی مشورے سے انہوں نے چھ سات سوٹ پسند کیے تھے جن میں سے دو سوٹ عرشی کے تھے۔

''ان سب کا بل ایک ساتھ بنا دیں۔''وہ لوگ کاؤنٹر پر پہنچیں تو ضیاء نے سیلز



گرل کو ہدایت دی۔

''مگر یہ شاپنگ ہم نے کی ہے اس کے پے منٹ ہم خود کریں گے۔''غنویٰ نے احتجاج کیا۔

''تم چپ رہو اس موضوع پر ہم یہاں سے نکل کر بات کریں گے۔''اسے ڈپٹتے ہوئے ضیاء نے سیلز گرل کی طرف رخ کیا اور ذرا دیر میں وہ لوگ اس کے ساتھ ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔

''جب میں نے کہہ دیا تھا کہ جہیز کے نام پر ہمیں کچھ نہیں چاہیے تو یہ کپڑوں کی خریداری کس سلسلے میں ہو رہی تھی؟''اس سے پہلے کہ غنویٰ کچھ کہتی وہ اس سے باز پرس کرنے لگا۔

''جہیز کہاں ضیاء......!یہ تو بس میں سونیا کو اس کی پسند کے چند جوڑے دلا رہی تھی اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''وہ وضاحت دینے لگی۔

''فرق پڑتا ہے بہت فرق پڑتا ہے۔میں معاشرے میں رائج فرسودہ رسومات کے خلاف باتیں کروں اور خود میرے ساتھ یہ ہو کہ میری بیوی اپنی پسند کے کپڑے اپنے جہیز میں لے کر آئے۔کیوں؟ کیا میں اسے اس کی پسند کے چند جوڑے نہیں دلا سکتا یا پھر وہ اپنی خواہشات پوری کرنے کے لیے ساری زندگی میکے والوں کی طرف دیکھتی رہے گی۔جب میں ساری زندگی کے لیے اس کی ذمہ داریاں اٹھانے کا عہد کر رہا ہوں تو پھر یہ کہیں اور کسی اور کی طرف کیوں دیکھے۔میں نے امی سے بھی کہہ رکھا ہے کہ سونیا کو ساتھ لے جا کر اس کی پسند کے زیور کپڑے بنوایئے گا اور دو چار دن میں امی تمہاری طرف آنے بھی والی ہیں بلکہ میں نے تو ان سے کہا تھا کہ بیڈ روم کے لیے فرنیچر اور کلر اسکیم کے سلسلے میں بھی سونیا کی پسند نا پسند معلوم کر لیجیے گا۔وہ سب چیزیں جو اس نے استعمال کرنا ہیں یا میرے ساتھ شیئر کرنا ہیں اس میں اس کی پسند بھی شامل ہونا چاہیے لیکن افسوس غنویٰ تم اتنے دن سے میرے ساتھ ہو پھر بھی مجھے نہیں سمجھ سکیں۔''اس کا غصہ آہستہ آہستہ افسوس میں ڈھلنے لگا۔

"سوری ضیاء! آئی ایم رئیلی سوری۔ آئندہ تمہیں کوئی شکایت نہیں ہو گی۔"

غنویٰ نے اس سے معذرت کرنے کے ساتھ ساتھ وعدہ بھی کیا تو آہستہ آہستہ اس کا موڈ بحال ہونے لگا۔

"ویسے تم سا گاؤدی بھی میں نے کہیں نہیں دیکھا جس کی ہونے والی نصف بہتر سامنے بیٹھی ہو اور وہ بجائے اس پہ توجہ دینے کے "مسائل جہیز" اور "معاشرہ سدھار" جیسے موضوعات پر تقریریں کر رہا ہو۔" ضیاء کا مزاج معمول پر آتے دیکھ کر غنویٰ نے اسے چھیڑا۔

"اتنا احمق نہیں ہوں کہ نصف بہتر کے لیے جذبات کا اظہار بھرے مجمع میں بیٹھ کر کروں۔ وہ سب میں نے مناسب وقت کے لیے اٹھا رکھا ہے۔" وہ مسکرایا تو اس کی نظر خاموش اور حیران سی بیٹھی سونیا کی نظر سے جا ملی۔ سونیا نے گھبرا کر نظر جھکالی۔ نظروں کے معمولی تصادم نے اس کے رخساروں پر سرخی دوڑا دی تھی۔

"کیا کہا آپ نے۔ ہم دو نازک سی لڑکیاں آپ کو مجمع دکھائی دیتی ہیں۔ اپنی آنکھوں کا علاج کروائیں۔" عرشی نے ایک نیا جھگڑا شروع کر دیا اور یوں ہی لڑتے جھگڑتے' ہنستے بولتے جب وہ لوگ وہاں سے نکلے تو دلوں میں بھرپور اطمینان تھا۔

"یہ تو بہت اچھے ہیں ورنہ یاسر بھائی کو دیکھ کر تو لگتا تھا کہ شاید داماد ہوتے ہی سسرال والوں کو نوچنے کھسوٹنے کے لیے ہیں۔" ان لوگوں کے رخصت ہوتے ہی سونیا نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"اپنی تقدیر پر شکر کرو اور اسریٰ آپی کے لیے دعا کرو کہ اللہ ان کی آزمائش کی یہ گھڑیاں جلد از جلد ختم کر دے اور یاسر بھائی کو عقل دے کہ وہ برے بھلے کا فرق جان سکیں۔" جہاں وہ سونیا کی طرف سے بے حد مطمئن تھی وہیں اسریٰ آپی کے لیے بے حد تشویش کا شکار۔ خوشی کی گھڑیوں میں ان کی تکلیفوں کا خیال خوشی کو ماند کر دیتا تھا۔

☆☆☆

"سچ! سونیا کی شادی ہو رہی ہے یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔" اسریٰ کی خوشی



کا اظہار بہت بے ساختہ تھا۔

"یہ اتنی اچانک رشتہ کہاں سے نکل آیا۔ اس پر سے شادی بھی اتنی جلدی۔" اسریٰ کی ساس مشکوک تھیں۔

"غنویٰ کے ساتھ نوکری کرتا ہے۔ بڑا بیٹا ہے' ماں باپ کی خواہش تھی کہ جلد سے جلد شادی کر دیں پھر کوئی مطالبہ بھی نہیں تھا ان کی طرف سے اس لیے ہم نے ہامی بھر لی۔" اماں نے اطمینان سے بتایا۔

"خیر...... جو دیتا ہے' اپنی ہی بیٹی کو دیتا ہے۔ کون سا سسرال والے حصہ دار بن جاتے ہیں۔" اماں کی بات سے ان پر پانی پڑا۔ سو فوراً ہی تنک کر بولیں اور پھر پینترا بدل کر حملہ کیا۔

"بڑی کو چھوڑ کر چھوٹی کو کیوں پسند کر لیا ان لوگوں نے۔ بڑی بیٹھی ہو اور چھوٹی کی شادی ہو جائے یہ تو کوئی اچھی بات نہیں۔"

"جب اس کا وقت آئے گا سو اس کی بھی ہو جائے گی۔ یہ تو ساری نصیب کی بات ہے۔" اماں بھی جیسے ان کے ہر سوال کے لیے تیار ہو کر آئی تھیں۔

"ارے بیٹا! یاسر! یہاں آؤ۔ دیکھو تمہاری ساس اور سالی آئی ہیں سونیا کی شادی کا کارڈ لے کر۔" یاسر کمرے کے سامنے سے گزرا تھا کھلے دروازے سے اسے جاتے دیکھ کر انہوں نے پکارا۔

"سونیا کی شادی...... اچانک...... وہ بھی ہم سے کوئی رائے مشورہ لیے بغیر۔" وہ فوراً ہی ماں کی پکار پر اندر آیا تھا۔ بنا سلام دعا کیے شروع ہو گیا۔

"یہ تو آنٹی! آپ لوگوں کی زیادتی ہے۔ بڑا داماد ہونے کے ناتے میرا حق تھا کہ آپ مجھ سے مشورہ لیتیں یا کم از کم اطلاع تو دے دیتیں۔ یوں اچانک شادی کارڈ لے کر آجانے کا مطلب تو یہ ہے کہ آپ ہمیں غیر سمجھتی ہیں۔" وہ بری طرح بھڑک رہا تھا۔

"نہیں بیٹا! ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ سب تو بالکل اچانک ہی ہو گیا وہ لوگ تو

صرف سونیا کو دیکھنے آئے تھے مگر تاریخ ہی پکی کر کے چلے گئے اچھا رشتہ تھا اس لیے ہم نے دیر مناسب نہیں سمجھی فون پر تم لوگوں سے کوئی رابطہ نہیں ہوتا اور اب وقت تھوڑا ہے اس لیے تمہارے ابا نے کہا یاسر گھر کا بچہ ہے اور اس کے گھر والے بھی اپنے ہی لوگ ہیں ایک بار رشتہ طے ہونے کی اطلاع دینے جاؤ گی اور پھر دعوت دینے دوبارہ اس لیے اچھا ہے کہ ایک ساتھ ہی دونوں کام نمٹا دو رہی تمہارے مشورے کی بات تو اگلے اتوار کو اسریٰ کو لے کر آجاؤ ہم ضیاء کو بھی بلوالیں گے۔تم دونوں ملاقات کر لینا اتنا اچھا لڑکا ہے وہ کہ تم بھی پسند کیے بغیر نہیں رہو گے۔'' اماں کو یاسر کے اعتراضات کا اندازہ تھا اس لیے بہت دھیمے انداز میں اسے سمجھا رہی تھیں۔

''خیر ملنا ملانا کیا۔فیصلہ تو آپ لوگ کر ہی چکے ہیں۔جیسے غیروں کی طرح کارڈ لے کر آپ ہمارے گھر آئی ہیں ہم بھی کھڑے کھڑے شادی میں شرکت کر لیں گے۔''

''اپنا فیصلہ سنا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔وہ لوگ ہکا بکا بیٹھی ایک دوسرے کی صورت دیکھ رہی تھیں کہ چھوٹے بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔

''مہر اٹھ گئی۔'' اسریٰ چونک کر کھڑی ہو گئی۔

''تمہاری بیٹی کو تو بچی بھی سنبھالنا نہیں آتی۔آج صبح سے بچی نے ریں ریں لگا رکھی ہے جانے کیا تکلیف ہے۔'' اسریٰ کی ساس نے طعنہ دیا۔

''میں دیکھتی ہوں۔'' اماں تڑپ کر کھڑی ہوئیں۔غنویٰ بھی ان کے ساتھ ہی تھی۔

''کیا ہوا اسریٰ؛بچی اتنا بلک بلک کر کیوں رو رہی ہے؟''

''پتہ نہیں اماں!'' اسریٰ نے بچی کے منہ میں پانی کی بوتل دینے کی کوشش کرتے ہوئے آہستہ سے جواب دیا۔بچی نے پانی کی ایک دو چسکیاں لینے کے بعد ہی بوتل منہ سے نکال دی تھی اور بری طرح رونے لگی تھی۔

''کیوں رلا رہی ہو میری بیٹی کو۔'' یاسر اسریٰ پر بگڑتا اندر آیا اور بچی کو گود میں



اٹھالیا۔

''میری گڑیا......میری شہزادی......اپنے بابا کو یاد کر رہی تھی۔مہر کی مما گندی ہیں......مہر اپنے بابا کے ساتھ کھیلے گی......'' بچی کو بانہوں میں جھلاتے وہ اسے چپ کروانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ بدستور رو رہی تھی۔

''خالی خولی پیار سے پیٹ نہیں بھرتا اسے دودھ چاہیے۔کب سے پانی پلا پلا کر بہلا رہی ہوں آخر بچی کب تک صبر کرے گی؟'' اسریٰ نے تلخی سے کہا تو وہ بولا۔

''کس نے کہا ہے تم سے یہ ظلم کرنے کو۔بچی کے لیے دودھ لے کر کیوں نہیں آتیں۔''

''دودھ فریج میں ہے اور فریج کو ناصر کی بیوی تالا لگا کر گئی ہے۔''

''کیوں اس کا باپ دودھ لے کر آتا ہے ہمارے گھر۔'' وہ طیش میں آیا۔

''وہ بھی یہی کہتی ہے کہ کیا مہر کا باپ دودھ لے کر آتا ہے جو مہر گھڑی گھڑی پیئے۔اس کے میاں کی کمائی ہے وہ کیوں ہر ایک کو اس پر عیش کرنے دے۔'' اسریٰ کے جواب نے یاسر کو بالکل خاموش کر دیا۔

''تم پکڑو اسے میں ابھی دودھ لے کر آیا۔'' تھوڑی دیر پہلے مشتعل لہجہ پست ہو گیا تھا۔

یہ سب کیا ہے آپی!'' اماں اور غنویٰ کب سے لب سیئے یہ تماشہ دیکھ رہی تھیں۔

اماں تو اب بھی مارے صدمے کے کچھ نہ کہہ سکیں غنویٰ ہی نے زبان کھولی۔

''اب حالات پہلے سے بھی بدتر ہو گئے ہیں غنویٰ! پہلے اکیلی ساس تھیں اب ناصر کی بیوی بھی ہے جو اپنے میاں کی کمائی پر اپنے سوا کسی کا حق نہیں سمجھتی۔اس نے صاف کہہ دیا ہے کہ ہم نے مفت خوروں کو پالنے کا ٹھیکا نہیں اٹھا رکھا۔زیور کا تمہیں پتا ہی ہے کہ یاسر پہلے ہی ٹھکانے لگا چکے ہیں۔دو چار جو چھوٹی موٹی چیزیں بچی تھیں انہیں بیچ باچ کر اتنے دنوں سے گزارا ہو رہا تھا۔اب اس میں سے بھی کچھ نہیں بچا۔'' بہت ضبط کی کوشش میں بھی آنسو بہہ نکلے تھے۔

"آپ نے مجھ سے تو کہا ہوتا۔ایسی بھی کیا غیریت کہ نوبت فاقوں تک آ پہنچی اور آپ نے ہمیں خبر ہی نہیں دی۔" غنویٰ بے حد دکھی ہو رہی تھی۔

"نہیں غنویٰ! نہیں۔آخر کب تک تم لوگ مجھے بھرتے رہو گے۔یوں بھی اب میں یاسر کی ڈھٹائی کو آخری حد تک آزمانا چاہتی ہوں۔مہر سے بہت پیار کرتے ہیں۔ ابھی دیکھا نہیں کہ اس کے رونے پر کس بری طرح بے تاب ہوئے تھے میں جانتی ہوں مہر ہی کی تکلیف وہ کاری ضرب ہے جو ان کو کچھ کرنے پر مجبور کر سکتی ہے اور اگر وہ اس امتحان میں بھی فیل ہو گئے تو میں خود کو اور اپنی بیٹی کو فاقوں سے مرنے کے لیے یہاں نہیں چھوڑوں گی۔میں یاسر سے اپنے راستے جدا کر لوں گی۔اگر اماں ابا مجھے رکھنے کو تیار ہو گئے تو ٹھیک' میں مہر کو اماں کے پاس چھوڑ کر خود کوئی نوکری کر لوں گی۔یہاں رہ کر تو میں یہ بھی نہیں کر سکتی کہ میرے پیچھے کوئی میری بچی کو سنبھالنے والا بھی نہیں ہوتا اور اگر ماں باپ کا در بھی بند ملا تو شہر میں بہت یتیم خانے اور دارالامان ہیں۔کہیں نہ کہیں تو ہم ماں بیٹی کو پناہ مل ہی جائے گی۔"

وہ اس عرصے میں جانے کتنی تکلیفوں سے گزری تھی کہ لہجہ زخم زخم ہو رہا تھا اماں بیٹی کی کیفیت پر تڑپ اٹھیں۔

"بس کر میری بچی! بس کر۔میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔ہم نے تجھے سسرال میں ہر حال میں نباہ کرنے کا درس دیا۔ہم معاشرے کے طعنوں سے ڈرتے تھے ہمیں خدشہ تھا کہ تو میکے لوٹ آئی تو تیری باقی بہنوں کا کیا ہو گا لیکن ہم اتنے سخت دل بھی نہیں کہ تجھے اور تیری اولاد کو یوں زندہ درگور ہوتے دیکھ سکیں۔بس اب ایک پل میں تجھے یہاں نہیں چھوڑوں گی اٹھ اپنا سامان سمیٹ۔" اماں جوش میں آ گئی تھیں۔

"نہیں' اسریٰ اور مہر کہیں نہیں جائیں گی۔" اچانک ہی یاسر لوٹ آیا۔

"کہیں نہیں جائیں گی تو کیا اس دوزخ میں جلتی رہیں گی۔" اماں نے زندگی میں پہلی بار داماد کو یوں جواب دیا تھا۔

"آنٹی! مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔آپ ماں ہیں' میری کیفیت کو سمجھ



سکتی ہیں۔جیسے آپ اپنی اولاد کی تکلیف پر تڑپ رہی ہیں ویسے ہی میں بھی اپنی بیٹی کو بھوک سے بلکتے دیکھ کر ہوش میں آ گیا ہوں۔" وہ اعتراف کر رہا تھا اپنی کوتاہیوں کا۔ اسریٰ ان سب سے لاپرواہ یاسر کے لائے خشک دودھ کے ڈبے کو کھول کر مہر کے لیے دودھ بنا رہی تھی۔

"آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا' یہ بہت اچھی بات ہے لیکن فی الحال ہم اسریٰ آپی کو اپنے ساتھ لے کر جائیں گے کیونکہ انہیں اور مہر کو زیادہ دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔سونیا کی شادی تک آپ کوئی نوکری ڈھونڈ لیں۔گھر کو چلانے کے لیے اشیائے ضرورت کا بندوبست کریں۔ہم لوگوں سے کہہ دیں گے کہ آپی سونیا کی شادی کے سلسلے میں ہمارے گھر رکی ہوئی ہیں اس دوران آپ نے اگر ڈھنگ سے کوئی انتظام کر لیا تو ہم اسریٰ آپی کو آپ کے ساتھ واپس بھیج دیں گے۔بصورت دیگر آپی نے کیا فیصلہ کر رکھا ہے یہ آپ جان ہی چکے ہیں۔" غنویٰ نرم لیکن بہت واضح الفاظ میں یاسر کو آئندہ کا لائحہ عمل بتا رہی تھی۔

"میں اس دوران اسریٰ اور مہر سے ملنے تو آ سکتا ہوں نا۔" کچھ اولاد کی محبت نے اور کچھ سسرال والوں کے سخت انداز نے یاسر کے کس بل نکال دیے تھے یہ وہ لوگ تھے جو ہمیشہ اس کی ناجائز فرمائشوں پر سر جھکاتے آئے تھے اور آج جب ایک حق بات کے لیے ڈٹ کر کھڑے ہوئے تھے تو یاسر کو ان سے آنکھ ملانا مشکل ہو رہا تھا۔

"ہم سب کو آپ کا انتظار رہے گا۔" غنویٰ نے مسکراتے ہوئے کہا۔بہت دنوں بعد امید کی کوئی کرن جاگی تھی جسے وہ بجھنے نہیں دینا چاہتی تھی۔

☆☆☆

"غنویٰ! ذرا یہ دو کارڈز لکھ دو۔ایک اپنے پھپھا کے نام اور دوسرا عباس کے نام کا۔" ناشتے پر حسب معمول دیگر افراد خانہ کی روانگی کے باعث وہ اکیلی تھی۔جیسے ہی اس نے چائے کا آخری سپ لیا اماں دعوت نامے ہاتھ میں لیے چلی آئیں۔

"پھپھا اور عباس کے الگ الگ کارڈز کیوں؟" اسے اچنبھا ہوا۔

"تم اپنے کاموں میں مصروف' تمہیں کیا خبر۔ عباس تو کب کا ماں باپ سے الگ ہو گیا۔ جب سے ہمارے تمہاری پھپھو سے تعلقات استوار ہوئے ہیں عباس کی بیوی نے واویلا مچا رکھا ہے تنگ آ کر تمہاری پھپھو نے عباس سے کہا کہ وہ علیحدہ گھر لے لے کم از کم روزانہ کی کل کل سے تو نجات ملے۔"

"تو یہ ہے تمہاری حقیقت عباس! مجھ سے چھپ چھپ کر عشق کے دعوے کرتے ہو اور بیوی کی مرضی پر دم ہلاتے پھرتے ہو۔" شادی کارڈ پر نام لکھتے وہ سوچ رہی تھی۔

"اماں! دوپہر کے لیے دال چاول بنا دیتی ہوں جلدی فراغت ہو جائے گی پھر میں اور آپ چلیں گے کارڈز بانٹنے۔" اسریٰ مہر کو گود میں لیے وہاں چلی آئی۔

"ٹھیک ہے۔" اماں نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا۔

"اچھا بھئی، میں چلتی ہوں۔ اللہ حافظ۔" اماں اور اسریٰ آپی کو مصروف چھوڑ کر وہ باہر نکلی۔ دروازہ کھولتے ہی اس کی نظر دہلیز پر پڑے ایک لفافے پر پڑی اس نے جھک کر لفافہ اٹھا لیا بغیر کسی نام کے خوشبوؤں میں بسا یہ لفافہ اسے حیرت میں مبتلا کر رہا تھا جو شاید کسی نے دروازے میں موجود دراز سے اندر ڈالا تھا۔ غنویٰ نے وہیں کھڑے کھڑے لفافہ چاک کر لیا۔

کب تک آخر ہم سے اپنے دل کا بھید چھپاؤ گی
تمہیں راہ پہ اک دن آنا ہے تم راہ پہ آ ہی جاؤ گی

اے ہرنی جیسی آنکھوں والی لڑکی!

میں تمہاری راہوں میں کتنے روز سے کھڑا ہوں اور تم ہو کہ ایک نظر بھی مجھ پر ڈالنا گوارا نہیں کرتیں۔ آخر تمہاری بے رخی کب تک سہوں۔ اگر دنیا سے ڈرتی ہو تو بے فکر ہو جاؤ میرے بازوؤں میں بہت دم ہے۔ سالے دنیا والے دم دبا کر بھاگ جائیں گے' بس تم ایک بار کہہ دو کہ تم میری ہو پھر دیکھنا کیسے کیسے عیش کرواتا ہوں تمہیں۔ جو فرمائش کرو گی' پوری کروں گا۔ بس تمہارے اشارے کی دیر ہے۔ رانی! اب مزید نہ تڑپاؤ۔ اب تو





یار دوست بھی میرا مذاق اڑانے لگے ہیں۔"

فقط

تمہارا دیوانہ

خط میں لکھا ہر جملہ لکھنے والے کی ذہنی سطح اور آوارہ مزاجی کا پتہ دے رہا تھا۔ غنویٰ کو تشویش نے گھیر لیا۔ طوبیٰ منی ہدیٰ تینوں میں سے جانے کس کے نام یہ پیغام تھا جو اس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر خط کے الفاظ کو پڑھا۔

"کم از کم میری کوئی بہن خود سے اس شخص کے ساتھ انوالو نہیں' جب دیکھے گا کہ اس کو کوئی رسپانس نہیں مل رہا تو خود ہی پیچھے ہٹ جائے گا۔" وہ خود کو تسلیاں دینے لگی اور لفافے سمیت خط پھاڑ کر ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔

"لیکن میں اس خط کی حقیقت جاننے کی کوشش ضرور کروں گی۔"

وہ سوچوں میں ڈوبی گھر سے باہر نکل گئی اور آنے والے دنوں میں اسے اس بارے میں سوچنے کی بھی مہلت نہیں ملی تھی۔ اخبار کی ذمہ داریاں اور ساتھ میں شادی کا بکھیڑا اگرچہ ضیاء کی طرف سے سادگی پر زور تھا پھر بھی بے شمار کام نکلتے چلے آ رہے تھے۔ ایسے میں اس خط کا ذہن سے نکل جانا کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔

☆☆☆

"ہیلو ضیاء! ہاں تم سے ضروری کام تھا اس لیے فون کیا ہے۔" بہت عجلت میں کام نمٹاتے وہ کافی دیر سے ضیاء کو کانٹیکٹ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ چنانچہ جیسے ہی رابطہ ہوا جلدی سے بولی۔

"شرم تو نہیں آتی نا تم کو ایک دن کے دولہا سے کام کرواتے۔" دوسری طرف سے ضیاء کی بہت فریش آواز سنائی دی۔

"دولہا کو مارو گولی اور مجھے یہ بتاؤ کہ جلالی صاحب کے انٹرویو کے ساتھ جو فوٹو گرافس لگنے ہیں وہ کہاں ہیں؟" وہ واقعی بے حد مصروف تھی سو اس کی لن ترانیوں پر قدرے جھنجلا کر پوچھا۔

"مجھے کیا معلوم غنوئی بی بی! میں نے تو پچھلے تین دن سے آفس میں قدم نہیں رکھا۔"

"ضیاء! تنگ مت کرو تمہیں معلوم ہے میں بہت جلدی میں ہوں گھر واپس جا کر بھی بہت کچھ دیکھنا ہے۔ ہم لوگ تمہارے ولیمے پر پہنچنے میں لیٹ ہو جائیں گے تو پھر شکوہ مت کرنا۔"

ضیاء کے انداز سے وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ صرف اور صرف اسے تنگ کرنے کے لیے لاعلمی کا اظہار کر رہا ہے۔

"ایک شرط پر بتاؤں گا؟"

"پھوٹو" دوست ہونے کے ساتھ ساتھ قریبی رشتے داری کا بھی مان تھا جو وہ ضیاء سے یوں بے تکلفی برت رہی تھی۔

"مان لو کہ میرے بغیر تم لوگ کچھ نہیں کر سکتے۔"

"بالکل مان لیا ویسے بھی میں نے پہلے بھی کب انکار کیا ہے۔" وہ صلح جو انداز میں بولی۔

"وہ جو تمہارے سامنے تمہاری دوست سمیرا بیٹھی ہے، اسے بھی اس مثالی بیان میں شامل کرو۔" ایک نئی شرط۔

"سمیرا ٹھیک کہتی ہے ضیاء! تم بہت بکواس کرتے ہو۔" وہ قدرے ناراض لہجے میں بولی تو ضیاء قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"اتنی دیر بکواس اس لیے کی ہے تا کہ تمہیں یاد آ جائے کہ میں اپنی ٹیبل کی تمام درازوں کی چابیاں تمہارے حوالے کر کے آیا ہوں اور تم چاہو تو خود بھی تھوڑی سی زحمت کر کے اپنی مطلوبہ شے تک پہنچ سکتی ہو۔" بالآخر وہ سنجیدہ ہو ہی گیا۔

"اوہ...... سوری...... مجھے بالکل یاد نہیں رہا۔" خود کو دل ہی دل میں کوستے اس نے ضیاء سے معذرت کی اور پھر فون بند کر کے اپنی مطلوبہ شے کی تلاش کے ساتھ ساتھ سمیرا کو بھی مخاطب کیا۔



"آ رہی ہو نا رات میں۔"

"آف کورس۔ چاہے اس نان سینس سے کتنی بھی لڑائیاں ہوں، فنکشن مجھے نہیں چھوڑنا۔" سمیرا کا بات کرنے کا اپنا اسٹائل تھا۔ غنوئی نے مسکراتے ہوئے تصویروں کا لفافہ نکالا اور کام میں منہمک ہو گئی۔

ضیاء کی غیر موجودگی میں کام کا بوجھ کافی بڑھ گیا تھا۔ غنوئی کو آفس سے نکلتے نکلتے کافی وقت لگا چنانچہ گھر پہنچ کر آرام کرنے کا کوئی موقع نہیں ملا اور وہ جلدی جلدی تیار ہو کر سب کے ساتھ روانہ ہو گئی۔

"اخبار والوں کو لیٹ نہیں ہونا چاہیے ورنہ بہت سے اہم واقعات رپورٹ ہونے سے رہ جاتے ہیں۔" ضیاء نے اسے چھیڑا۔ ڈارک بلو تھری پیس سوٹ میں وہ بہت اسمارٹ لگ رہا تھا۔

"تمہارا ولیمہ اتنا اہم واقعہ نہیں کہ اس کی کوریج مجھ جیسے اے کلاس صحافی کریں۔" اسے دوبدو جواب دیتی وہ اندر چلی گئی۔ بارات میں ضیاء کی طرف سے چیدہ چیدہ افراد ہی آئے تھے لیکن آج کا فنکشن نسبتاً بڑے پیمانے پر ارینج کیا گیا تھا غنوئی اپنی بہنوں کے ساتھ سونیا سے ملنے اسٹیج کی طرف بڑھ گئی آسمانی کامدار غرارے میں وہ بے حد پیاری لگ رہی تھی فوٹو گرافر اس کے کلوز اپ بنا رہا تھا اسے ڈسٹرب نہ کرنے کے خیال سے وہ لوگ اسٹیج سے نیچے ہی رک گئیں۔

"طوبیٰ! ضیاء اور سونیا کے لیے جو گفٹس لیے تھے کہاں ہیں؟"

"اوہ...... وہ تو گاڑی میں ہی رہ گئے۔" اماں نے آ کر پوچھا تو طوبیٰ نے کہا۔

"ابھی لے کر آ جاتی ہوں۔"

"نہیں تم رہنے دو میں لے آتی ہوں۔" طوبیٰ کو روک کر وہ خود باہر کی طرف بڑھ گئی اس بات سے بے خبر کہ اس کے تعاقب میں نگاہیں جمائے رکھنے والا شخص بھی پیچھے پیچھے ہی باہر آیا تھا۔

"تم...... گاڑی سے مطلوبہ اشیاء نکال کر وہ واپس پلٹی تو اسے سامنے پا کر

حیرت سے صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

''تمہیں میری طرف نگاہ ڈالنے کی فرصت نہیں اور مجھے تم پر سے نگاہ ہٹانے کی۔''

''تمہاری یہ باتیں مجھے بھی خوش نہیں کر سکتیں۔''اس نے منہ بنایا۔اس پل پارکنگ میں ایک آلٹو داخل ہوئی۔

''اتنی کٹھور نہ بنو غنوئی! میں آج بھی تم سے محبت کرتا ہو اور اس محبت کے بدلے تم سے فقط تھوڑی سی توجہ کا ہی تو طلب گار ہوں۔''

''شٹ اپ عباس۔تم نہ صرف اپنی بیوی کے ساتھ خیانت کر رہے ہو بلکہ اپنا وقت بھی برباد کر رہے ہو۔''اس نے وہاں سے جانے کے لیے قدم اٹھائے۔

''کچھ دیر تو رکو میں تمہیں اچھی طرح دیکھ تو لوں نہایت جرأت سے کام لیتے اس نے غنوئی کی کلائی تھام کر اسے روکا۔

''اچھا تو یہ گل چھرے اڑائے جا رہے ہیں۔پھپھی کو فرصت نہیں ملتی دن رات بھتیجی کے گن گا گا کر میرا خون جلانے سے اور یہ پارسائی بی بہن کے ولیمے کو چھوڑ چھاڑ کر میرے میاں کو ورغلانے میں لگی ہیں۔ابھی بلاتی ہوں سب کو تاکہ تمہارے ''اصلی گن'' کھل کر سب کے سامنے آئیں۔''وہ عباس کی حرکت پر ہی سن ہو گئی تھی اس کی بیوی کو سامنے پا کر اور سب سے بڑھ کر اس کے عزائم جان کر سخت سراسیمہ ہونے لگی حالت تو عباس کی بھی کم خراب نہیں تھی بیوی سے چھپ چھپ کر دل لگی کرنا اور بات تھی اور یوں رنگے ہاتھوں پکڑے جانا اور بات۔

''میرا دل چاہ رہا ہے تمہارا قتل کر دوں۔عباس تو چلو مرد ہے لیکن تم ایک لڑکی ہوتے ہوئے میرے حق پر ڈاکہ ڈالنے کی کوشش کر رہی ہو ویسے تو اخبار میں عورت کی حمایت میں بڑی بڑی باتیں لکھتی ہو اور خود اتنی گھٹیا اور ذلیل عورت ہو۔''عباس کی بیوی کسی خطرناک ارادے سے اس کی طرف بڑھی تھی۔

اپنی سگی بہن کے ولیمے میں 'عزیز و اقارب کے سامنے بے عزت ہونے کے



خیال سے ادھ موئی ہوتی غنوئی میں اپنا دفاع کرنے کی بھی جرات نہیں تھی۔

''رک جائیں محترمہ! عباس کی بیوی کا ہاتھ غنوئی کے چہرے تک پہنچا ہی تھا کہ ایک آواز نے ان تینوں کو چونکایا۔غنوئی نے نظر اٹھا کر سامنے موجود ہستی کو دیکھا اور اس کا دل چاہا کہ زمین میں سما جائے اپنی اس قدر رسوائی کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

''میں بہت دیر سے یہاں ہونے والا تماشا دیکھ رہا ہوں اس لیے آپ کو یقین دہانی کروا سکتا ہوں کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی ذمہ دار یہ لڑکی نہیں بلکہ آپ کے شوہر صاحب ہیں آپ کو اگر گریبان پکڑنا ہے تو ان کا پکڑیں۔جو پہلے ہی مظلوم ہو اس پر ظلم کر کے آپ کو کیا حاصل ہوگا۔''اس کی مخاطب عباس کی بیوی تھی۔

''اسے تو میں چھوڑوں گی نہیں اب کے کرتوت خاندان بھر کو بتاؤں گی۔''اس نے دانت کچکچائے۔

''جی ضرور' کرتوت آپ اپنے شوہر کے بتائیں گی اور بدنامی اس لڑکی کے حصے میں آئے گی۔''وہ تھوڑا تلخ ہوا۔

''پلیز رابی! مجھے معاف کر دو آئندہ ایسی غلطی کبھی نہیں کروں گا۔''حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے عباس اپنی بیوی کے آگے گڑگڑانے لگا۔

''میں ابھی اور اسی وقت گھر جانا چاہتی ہوں۔''وہ بے حد خراب موڈ کے ساتھ آگے بڑھ گئی عباس دم دبائے اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

''اپنے آنسو صاف کر لیں۔''حسنین حیدر نے ٹشو پیپر اس کے ہاتھ میں تھمایا۔

''م......م......میرا کوئی قصور نہیں۔''اس کی ہدایت پر عمل کرنے کے بجائے نہ جانے کیوں وہ اسے وضاحت دینے لگی۔

''میں جانتا ہوں کہ آپ کا کوئی قصور نہیں اور اگر نہ بھی مانوں تو آپ کو کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے کسی غیر متعلقہ شخص کے لیے خود کو ہلکان کرنا بے کار عمل ہے۔''وہ نپے تلے انداز میں کہہ کر آگے بڑھا اور پھر دو قدم ہی چل کر گردن موڑ کر اس سے بولا۔

"آنسو بہانے کے لیے نہ تو یہ جگہ مناسب ہے اور نہ موقع اتفاق سے اگر اب تک یہاں کوئی نہیں آیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آئے گا بھی نہیں اور پھر شاید آپ کو ان آنسوؤں کی وضاحت دینا مشکل ہو جائے۔"

ایک عام مرد کی طرح اس نے اس کی کیفیت کا فائدہ اٹھا کر اشک شوئی کے بہانے وہاں رکنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ ایک عقل کی بات سمجھا کر آگے بڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

"ضیاء......کہاں ہو تم......پلیز فوراً یہاں پہنچو۔" بڑی کوششوں کے بعد اس کا ضیاء کو ٹیکٹ ہو سکا تھا۔

"میں حسنین کے ساتھ ہوں لیکن تم کہاں ہو؟" ضیا اس کی رندھی ہوئی آواز پر چونکا تھا۔"

"میں ہاسپٹل میں ہو طوبیٰ کے ساتھ وہ بہت سیریس ہے۔کسی نے اس پر تیزاب پھینک دیا ہے۔" غنویٰ کی سنائی خبر ضیاء کے لیے بے حد شاکنگ تھی۔

"مجھے ہاسپٹل کا نام بتاؤ۔" ضیاء کے لہجے میں موجودہ پریشانی پر ڈرائیو کرتے حسنین نے رخ موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

"خیریت ہے؟ کس کا فون تھا؟"

"نہیں خیریت نہیں۔غنویٰ کا فون تھا تم مجھے ہاسپٹل ڈراپ کر دو۔" ضیاء نے موبائل آف کرتے اس سے کہا اور پھر حادثے کے بارے میں بتانے لگا لاہور سے شروع ہونے والے اچھے تعلقات اب ان کے مابین دوستی میں ڈھل چکے تھے۔حسنین حیدر کی اپنے ہم مزاج وہم خیال ضیاء سے گاڑھی چھننے لگی تھی اور آج وہ اصرار کر کے ضیاء کو اپنے ساتھ ایک ڈرامے کی ریہرسل دکھانے لے جا رہا تھا۔

"کیسے ہوا یہ سب کچھ؟" ہاسپٹل میں پریشان حال اماں ابا بھی غنویٰ کے ساتھ موجود تھے۔

"کچھ پتا نہیں۔بس کچھ لوگوں نے آ کر بتایا کہ دو لڑکے طوبیٰ پر تیزاب پھینک



کر بھاگ گئے اور وہ گلی میں بے ہوش پڑی ہے۔غنویٰ بالکل اسی وقت گھر پہنچی تھی ہم نے فوراً ایمبولینس بلوائی اور طوبیٰ کو لے کر یہاں آ گئے۔کب کیوں اور کیسے خود ہمیں بھی خبر نہیں؟" جواب ابا نے دیا تھا جبکہ اماں تو مسلسل رونے اور دعائیں کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔غنویٰ بھی نم آنکھوں کے ساتھ ایک طرف چپ چاپ کھڑی تھی اس اچانک ہونے والے حادثے نے اس کا دماغ ماؤف کر دیا تھا وہ بہن پر ہونے والے اس ظلم پر غم زدہ تھی ابھی چند دن تو ہوئے تھے چین کی نیند سوتے سونیا کی اچھے گھرانے میں شادی اور یاسر بھائی کے بدلے ہوئے طرز عمل کے نتیجے میں اسریٰ آپی کی زندگی میں آنے والے سکون کی خوشی کو وہ ابھی پوری طرح محسوس بھی نہیں کر سکے تھے کہ اس حادثے نے ہلا کر رکھ دیا۔

"تھینک یو حسنین! تم جاؤ تمہاری ٹیم ریہرسل پر تمہارا انتظار کر رہی ہوگی۔" ضیاء نے چپ چاپ کھڑے حسنین سے کہا۔

"اگر کوئی ضرورت ہو تو میں رک جاتا ہوں ضیاء!" اس نے آفر کی۔

"نو تھینکس۔میں دیکھ لوں گا سب۔"

"او کے میں چلتا ہوں۔گاڑی یہیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ہو سکتا ہے تمہیں ضرورت پڑ جائے اپنے آفس فون کر دوں گا تمہاری گاڑی وہاں سے کوئی یہاں پہنچا دے گا اور میری لے جائے گا۔" وہ ضیا سے ہاتھ ملا کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

"وہ لڑکا مجھے بہت دنوں سے تنگ کر رہا تھا اکیڈمی آتے جاتے اکثر اپنے دوستوں کے ساتھ میرے راستے میں آ کر کھڑا ہو جاتا فقرے کستا بے ہودہ گانے گاتا یہ ان لوگوں کا روزانہ کا معمول تھا لیکن میں نے کبھی پلٹ کر انہیں جواب نہیں دیا۔میں سمجھتی تھی میری خاموشی سے بیزار ہو کر وہ اپنی حرکتیں چھوڑ دیں گے لیکن ان لوگوں کی جرات بڑھتی ہی چلی گئی۔وہ گھر تک میرا پیچھا کرنے لگے پھر بات خطوں تک پہنچی لیکن میں چپ چاپ برداشت کرتی رہی اگر گھر میں ذکر کرتی تو اماں میرا اکیڈمی جانا بند کروا دیتیں کل بھی اکیڈمی سے واپس آ رہی تھی تو وہ لوگ میرے پیچھے لگ گئے اور اس لڑکے نے میرا

ہاتھ پکڑ کر زبردستی مجھے اپنی بائیک پر بٹھانے کی کوشش کی تو مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا اور میں نے اسے ایک زوردار تھپڑ دے مارا مجھ سے تھپڑ کھا کر وہ لوگ بائیک پر بیٹھ کر فوراً وہاں سے چلے گئے تھے میں بھی گھر کی طرف آنے لگی۔ اپنی گلی تک پہنچی تھی کہ وہ ایک بار پھر بائیک پر آتے دکھائی دیے اور مجھ پر کچھ پھینکا بس پھر تکلیف اور اذیت سے بے ہوش ہونے کے سوا مجھے کچھ یاد نہیں۔"

طوبیٰ پولیس والے کو اپنا بیان ریکارڈ کروا رہی تھی۔

"اچھا جناب! ہم چلیں گے۔" "ان شاء اللہ جلد از جلد لڑکے گرفتار کر لیے جائیں گے۔" بیان پر طوبیٰ کے دستخط لے کر پولیس انسپکٹر ضیاء سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔ ضیاء کی موجودگی کے باعث اس کا رویہ بہت شائستہ تھا پولیس والوں کی مخصوص فطرت کے مطابق اس نے طوبیٰ سے کوئی بے ہودہ سوال نہیں کیا تھا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا گڑیا! تم پریشان مت ہو۔" ضیاء طوبیٰ کے سر پر ہاتھ پھیر کر باہر نکلا۔ غنویٰ بھی اس کے ساتھ ساتھ تھی۔

"ابھی گھر واپس جا کر سونیا کو لے کر آؤں گا بلکہ ایسا کروں گا کہ اسے چند دنوں کے لیے گھر پر چھوڑ دوں گا اماں اور تم مصروف رہو گے تو ہدیٰ اور منیٰ گھر پر اکیلی پریشان ہوتی رہیں گی۔"

ضیاء کل رات سے ہاسپٹل سے نہیں ہلا تھا۔ طوبیٰ کے ہوش میں آنے کے بعد آئی سی یو سے روم میں شفٹ ہونے تک کے یہ مراحل بہت دشوار تھے خصوصاً پولیس والوں سے ڈیل کرنے کے خیال سے ابا ہر شریف آدمی کی طرح بے حد گھبرا رہے تھے۔ یہ مشکل مرحلہ ضیاء کی موجودگی کی وجہ سے باخیر و خوبی انجام پا گیا تھا۔

"اسریٰ آپی کو خبر کی تھی تم نے؟"

"نہیں وہ بے چاری چھوٹی بچی کے ساتھ کہاں خوار ہوتی پھرتیں۔"

اس کے ساتھ چلتے ہاسپٹل کے لان کی طرف بڑھتے غنویٰ نے جواب دیا۔

"ہاں، یہی سوچ کر میں نے سونیا کو بھی نہیں بتایا کہ رات بھر پریشان رہے



گی۔" وہ ایک بینچ پر بیٹھ گیا تھا۔ رات اپنے گھر واپس نہ آنے کی اطلاع دیتے ہوئے اس نے سونیا سے ٹی وی کے ایک نائٹ شو کی رپورٹنگ کے لئے جانے کا بہانا بنا دیا تھا۔

"تم مجھے بہت زیادہ چپ لگ رہی ہو۔" ضیاء جو رات سے اسے نوٹ کر رہا تھا اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"بس، مجھے لگ رہا ہے کہ طوبیٰ کے ساتھ ہونے والے حادثے میں کہیں نہ کہیں میری بھی کوتاہی ہے، کاش میں ان چھوٹے چھوٹے واقعات کو معمولی نہ جانتی۔" وہ ضیاء کو تفصیلات بتانے لگی۔

"کوتاہی صرف تمہاری نہیں پورے معاشرے کی ہے۔ ایک اسلامی معاشرے میں عورت کو جو تحفظ حاصل ہونا چاہئے، وہ اس سے محروم ہے۔ اکثر لڑکیاں صرف اس لئے حادثات کا شکار ہو جاتی ہیں کہ وہ اپنے ہی گھر والوں کو اپنے ساتھ باہر ہونے والے سلوک کے بارے میں نہیں بتا سکتیں، کیونکہ انہیں ڈر ہوتا ہے کہ اس صورت میں گھر والے ان کے ساتھ موجود مسئلے کو ختم کرنے کے بجائے خود انہیں پابند کر دیں گے جیسا کہ طوبیٰ نے سوچا کہ اماں اس کے اکیڈمی جانے پر پابندی لگا دیں گی اور اس کی پڑھائی کا حرج ہوگا۔ پھر ہمارے معاشرے کی بے حسی ہے۔ کتنے لوگ ہوں گے جو روزانہ ان لڑکوں کو طوبیٰ کو پریشان کرنے پر دیکھتے ہوں گے لیکن کسی نے کچھ نہیں کہا، ایسے معاملات میں سب اپنی اپنی فکر میں مبتلا نظریں چرا لیتے ہیں۔ حالانکہ اگر دس پندرہ آدمی اکٹھا ہو کر کھڑے ہو جائیں تو کیا ایسی سچویشن سے نمٹنا کچھ مشکل ہے۔ پھر کچھ قصور تربیت کا ہے۔ نہ جانے کیوں ہم اپنے بچوں کو دوسروں کی ماں بہن کی تعظیم کا سبق یاد نہیں کروا پاتے۔" وہ خود بے حد دکھی تھا۔

"میں گھر پہنچ کر صدیق ماموں اور اسریٰ وغیرہ کو اطلاع دیتا ہوں، بتانا تو بہرحال پڑے گا۔ یہ بات چھپنے والی تو بالکل نہیں۔"

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ تھکا تھکا سا بولتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اسریٰ نے بینچ پر بیٹھے بیٹھے آنکھیں موند لیں۔ ضیاء کو پہچاننے میں اس سے کوئی غلطی نہیں ہوئی تھی

وہ بہنوئی سے بڑھ کر بھائی ثابت ہو رہا تھا۔

☆☆☆

"میں گھر نہیں جاؤں گی میں گھر نہیں جاؤں گی۔" زارو قطار روتی طوبیٰ کی زبان پر فقط ایک ہی فقرہ تھا۔

"وہاں جانا اور رہنا تو خود ہمارے لیے بھی عذاب بنتا جا رہا ہے لوگ یوں سوال جواب کرتے ہیں جیسے سارا قصور ہمارا ہو لیکن کیا کریں مجبوری ہے اتنی جلدی کسی اور گھر کا بندوبست بھی نہیں ہو سکتا۔"

اماں اس سے زیادہ دل چھوڑے بیٹھی تھیں۔طوبیٰ کے ساتھ ہونے والے حادثے نے ان سب پر خوف کا عالم طاری کر دیا تھا مُنی اور ہدیٰ گھر سے باہر نکلتے ڈرتی تھیں۔ابا کے کاندھے ایک ناکردہ جرم کے بوجھ سے جھکے جا رہے تھے اسریٰ آپی اپنے سسرالیوں کے طعنوں کی لپیٹ میں تھیں۔یاسر بھائی پہلے سے کافی سدھر گئے تھے لیکن ان جیسے شخص کی بالکل کایا پلٹ بھی ممکن نہیں تھی۔اس واقعے کو انہوں نے اپنے حساب سے لیا تھا اسریٰ آپی کو میکے میں چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا البتہ سونیا اس دن سے مستقل چھوٹی بہنوں کے پاس رکی ہوئی تھی ضیاء کے ساتھ ساتھ اس کے والدین بھی روشن خیال اور کھلے ذہن کے لوگ تھے جنہوں نے طوبیٰ کے ساتھ ہونے والے حادثے کو پوری ہمدردی کے ساتھ محسوس کیا تھا۔

"طوبیٰ! گڑیا ماں کو پریشان نہیں کرو۔ ھاسپٹل سے چھٹی مل گئی ہے۔اگر گھر نہیں جاؤ گی تو پھر کہاں جاؤ گی۔پر اس میں بہت جلد کوئی دوسرا گھر ڈھونڈ لوں گی۔" غنویٰ نے اس کے قریب آتے ہی اسے پیار سے سمجھایا۔

"آپی! مجھے ڈر لگ رہا ہے بہت زیادہ ڈر۔" اس کے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

"اب کیسا ڈر جان! تمہیں بتایا تھا ناں کہ ضیاء نے ان لڑکوں کو گرفتار کروا دیا ہے۔اب تم دیکھنا وہ اپنے کیے کی کتنی سخت سزا بھگتیں گے۔" غنویٰ اس کے بالوں کو پیار



سے سہلاتے سمجھا رہی تھی۔

"بھائی صاحب! میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ میرے گھر میں شفٹ ہو جائیں مجھے تو یوں بھی تین دن بعد روانہ ہی ہو جانا ہے اچھا ہے کہ بجائے گھر بند رہنے کے آپ لوگ وہاں رہ لیں۔آپ کی پریشانی بھی دور ہو جائے گی اور میرے گھر کی حفاظت بھی ہوتی رہے گی۔" صدیق ماموں جو اتنی دیر سے خاموش بیٹھے تھے ابا کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

"پھر آپ راضی ہیں ناں بھائی صاحب!" ابا کی خاموشی پر انہوں نے دوبارہ پوچھا تو ابا ایک گہرا سانس لے کر رہ گئے۔

"تمہاری بات نہیں مانوں گا صدیق تو کس کی مانوں گا۔تم تو مجھ سے بھی زیادہ میری بچیوں کے مزاج آشنا ہو۔"

"غنویٰ بیٹا! ضیاء کو بتا دیا تھا ناں کہ طوبیٰ کو آج ھاسپٹل سے ڈسچارج کر رہے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ لاعلمی میں یہاں ہی چلا آئے۔" معاملات کو طے پاتے دیکھ کر اماں نے غنویٰ سے پوچھا۔

"جی اماں! اسے معلوم ہے۔آج اسے کسی بہت ضروری کام سے جانا تھا اس لیے میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ پریشان نہ ہو ہم خود ہی کوئی بندوبست کر کے واپس گھر چلے جائیں گے۔"

"السلام علیکم" غنویٰ کی بات ابھی ختم ہی ہوئی تھی کہ شمس زور دار سلام کرتا کمرے میں داخل ہوا جب سے طوبیٰ کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا تھا وہ بلاناغہ ہاسپٹل آ رہا تھا پھپھو اور پھپھا بھی چند بار آئے تھے عباس اور اس کی بیوی نے بھی ایک چکر لگایا تھا۔اس کی بیوی نے چند شکوک بھرے سوال کر کے ان لوگوں کو پریشان بھی کرنا چاہا تھا لیکن شمس نے دخل اندازی کر کے اس کی زبان کو لگام دے دی تھی اور اب غنویٰ نوٹ کر رہی تھی کہ شمس کی روز روز کی آمد کے پیچھے رشتہ داری کے سوا بھی کوئی اور جذبہ کارفرما تھا۔

"ہاسپٹل سے پروانہ آزادی ملنے کی خوشی میں میری طرف سے یہ قبول کرو۔"

شمس نے ایک خوبصورت بکے طوبیٰ کے ہاتھ میں تھمایا جسے اس نے بے نیازی سے ایک طرف ڈال دیا غنویٰ اپنا دل مسوس کر رہ گئی وہ جانتی تھی کہ اس کی بہن پر جو کچھ بیتی ہے وہ اتنی جلدی نارمل زندگی کے احساسات وجذبات کو محسوس کرنے کے قابل نہیں ہوسکے گی۔

"ویسے میں تو سوچ رہا تھا کہ میں لیٹ ہو گیا ہوں اور آپ لوگ شاید اب تک ہاسپٹل سے نکل چکے ہوں' بس یہ تو احتیاطاً میں یہاں آ گیا کہ اگر آپ لوگ موجود ہوئے تو گھر پر ڈراپ کر دوں گا۔" شمس جو طوبیٰ کے ردعمل پر لمحہ بھر کو شاکڈ ہوا تھا سنبھل کر مخاطب ہوا۔

"ہاں بس نکلنے ہی والے تھے ہاسپٹل والے حساب کتاب بنا رہے ہیں ڈیوز کلیئر کرتے ہی نکل جائیں گے۔" غنویٰ نے اسے طوبیٰ کی ماموں کے گھر روانگی کے فیصلے سے بھی آگاہ کیا۔

"یہ تو بہت مناسب فیصلہ ہے۔" شمس نے سن کر تائید کی۔

"میں شفٹنگ میں آپ لوگوں کی ہیلپ کروادوں گا اور بھی کوئی ضرورت ہو تو مجھ سے ضرور کہیے گا۔" طوبیٰ اور اماں ماموں کے ساتھ ان کے گھر چلی گئی تھیں شمس نے اسے اور ابا کو اپنی گاڑی میں گھر ڈراپ کرتے وقت آفر کی۔

"ضرور۔" پھپھو کی فیملی سے خود اس کی ذات کو کتنی ہی تکلیف پہنچی ہو وہ شمس کے خلوص کو ٹھکرا نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

"حسنین ایک ٹی وی سیریل پروڈیوس کر رہا ہے۔"

"یقیناً تحریر اور ڈائریکشن بھی ان کی اپنی ہوگی۔" ضیاء کی اطلاع پر اس نے اندازہ لگایا۔

"آف کورس' کسی دوسرے کے آئیڈیے پر اس نے کبھی کام نہیں کیا۔" ضیاء نے اس کے اندازے کی تصدیق کی۔



"آج اس کے ڈرامے کی شوٹنگ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم سیٹ پر چلی جاؤ فنکاروں سے ہلکے پھلکے انٹرویوز اور سیریل کے بارے میں انفارمیشنز لے لینا۔"

ضیاء کی ہدایت پر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اب اکثر جگہ وہ ضیاء کے بغیر بھی جانے لگی تھی رفتہ رفتہ اس میں اعتماد پیدا ہو رہا تھا اور اس کے قدم اس فیلڈ میں جمتے جا رہے تھے۔ البتہ لیٹ نائٹ کسی پروگرام میں ضیاء اس سمیت کسی بھی خاتون صحافی کو تنہا نہیں بھیجتا تھا۔ عموماً وہ خود یا کوئی دوسرا میل جرنلسٹ اس کام کو نمٹاتا تھا۔

"یار! جا رہی ہو تو ذرا حسنین حیدر کو میرا حال دل سنا دینا کم بخت جتنا ہینڈسم ہے اتنا ہی روکھا ہے۔ اس پر سے یہ تمہارے بہنوئی صاحب ظالم سماج ہیں کیا تھا جو مجھے اس اہم کام کے لیے بھیج دیتے لیکن یہ شخص تو چاہتا ہی نہیں کہ میں کسی اسمارٹ بندے کو پٹا کر اپنی لائف بنا سکوں۔" شام میں جب وہ آفس سے نکلنے لگی تھی سمیرا نے اپنے مخصوص انداز آہیں بھرتے ہوئے کہا۔

"تم بھی ناں سمیرا!" غنویٰ ہنس پڑی۔ "یہ تو میں ہوں جسے تمہاری عادت کا اندازہ ہے ہونہ کوئی اور ہو تو تم پر شک کرنے لگ جائے۔"

"تو ڈیئر! مجھے بھی تمہاری فطرت کا اندازہ ہے جب ہی تمہارے سامنے ایسا مذاق کر لیتی ہوں۔" سمیرا اطمینان سے بولی تو غنویٰ اس کے شانے پر ایک دھپ رسید کرتی آفس سے نکل گئی۔

رکشہ میں بیٹھ کر ضیاء کی بتائی ہوئی لوکیشن کی مطابق ایڈریس تلاش کرنے میں اسے تھوڑی مشکل پیش آئی تھی چنانچہ سیٹ پر پہنچنے میں قدرے تاخیر ہوگئی۔

"ضیاء نے مجھے آپ کے بارے میں انفارم کر دیا تھا آپ ایسا کریں کہ میرے اسسٹنٹ سے اسٹوری وغیرہ کے بارے میں ڈسکس کر لیں۔

فنکاروں میں سے بھی جو جو فارغ ملتا جائے اس سے بات چیت کر لیجیے گا آخر میں کوئی وضاحت طلب بات ہوئی تو میں جواب دہی کے لیے حاضر ہوں گا۔"

سلام دعا کے مراحل سے گزر کر حسنین نے اس سے یہ چند جملے کہے اور پھر

غنوی نے دیکھا کہ وہ پورے انہماک سے اپنے کام میں مصروف ہو چکا تھا۔

''آپ کا اس ڈرامے میں کیا رول ہے؟'' ایک مشہور اداکارہ سے اس نے اپنے سوالات کا آغاز کیا۔

''میں اسے ڈرامے میں ایک مڈل کلاس فیملی کی لڑکی کا کردار ادا کر رہی ہوں جسے معاشرے میں مختلف قسم کے رویوں تنگی اور مسائل کا سامنا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ اس وقت اپنی نیچرل لکس کے ساتھ موجود ہیں۔ آج کل کے ٹرینڈ کے مطابق نہ بھاری بھرکم زیورات ہیں نہ قیمتی لباس کپڑے اور زیور نہ سہی لیکن آج کل ٹھیک ٹھاک قسم کا میک اپ تو ہر قسم کا رول کرنے والی اداکارہ کا کیا جا رہا ہے۔ تو آپ کو یہ سب عجیب نہیں لگ رہا؟''

''نہیں، بلکہ مجھے تو خوشی ہو رہی ہے کہ مجھے کردار کو اس کی ڈیمانڈ کے مطابق کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ کوئی مصنوعی پن نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حسنین حیدر کا کام اوروں سے مختلف ہے۔ وہ، وہ نہیں بنا رہا جو آجکل ''ان'' ہے بلکہ وہ بنا رہا ہے جو کہانی کی ڈیمانڈ ہے۔''

غنوی نے سیٹ پر موجود جتنے لوگوں سے بات کی اسے اسی طرح کی آراء سننے کو ملیں یہ سچ تھا کہ آرٹسٹ پیسے کمانے کی لگن میں بھیڑ چال کا شکار ہو رہے تھے لیکن اچھے معاوضے کے ساتھ اچھا کام کرنے میں وہ زیادہ خوش تھے غنوی نے دیکھا تھا کہ ڈرامے کی کہانی اداکاری کا معیار، منظر نامہ سب کچھ بہت عمدہ تھا۔ یقیناً اسٹیج کے بعد اب ٹی وی کی دنیا میں بھی حسنین حیدر کچھ خاص کرنے جا رہا تھا۔

''اب آخر میں، میں آپ سے کچھ سوالات کرنا چاہوں گی، حسنین صاحب!'' بہت سارا وقت مختلف فنکاروں کے ساتھ گفت وشنید میں گزار کر وہ حسنین کے پاس چلی آئی۔

''ضرور لیکن تھوڑی دیر رک جائیں۔'' وہ میک اپ کروا رہا تھا غنوی نے کچھ



مضطرب ہو کر اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سیٹ پر موجود گہما گہمی کم ہو چکی تھی۔ آرٹسٹس اپنے اپنے حصے کا کام نمٹا کر روانہ ہو گئے تھے اور اب وہاں زیادہ تر ٹیکنیکل اسٹاف اور اسپاٹ بوائے وغیرہ رہ گئے تھے۔

''ذاکر! تم پیک اپ کروالو۔ میں چلتا ہوں۔'' حسنین حیدر نے اس کی پریشانی کو نوٹ کیا تھا اور ایک دم ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''چلیں، جو کچھ پوچھنا ہو، راستے میں پوچھ لیجئے گا۔ میری ضیاء سے بات ہوئی تھی اس نے مجھے ہدایت دی تھی کہ آپ کو گھر تک ڈراپ کروں ویسے بھی ہم دونوں کا راستہ ایک ہی ہے۔''

وہ ضیاء اور اسٹاف کے چند قابل اعتماد افراد کے سوا کبھی تنہا کسی کے ساتھ نہیں گئی تھی اس لیے تھوڑا سا جھجک گئی لیکن ضیاء کے حسنین پر اعتماد کرنے کا مطلب تھا کہ وہ بھی اس پر اعتبار کر سکتی ہے۔

''آپ تھیٹر سے یکدم ٹی وی کی طرف کیسے آ گئے؟'' اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر اپنا اعتماد بحال کرنے میں غنوی کو چند لمحے لگے تھے اور پھر وہ اپنے اصل مقصد کی طرف آ گئی تھی۔

''یکدم تو نہیں بہت سوچ سمجھ کر آیا ہوں۔ اصل میں تھیٹر ایک محدود چیز ہے دیکھنے بھی کوئی نہیں آتا جب کہ ٹیلی ویژن آج ہر گھر میں موجود ہے۔ کسی کونے کھدرے میں بیٹھ کر معاشرے کی برائیوں پر کڑھتے چند دوستوں کے ساتھ تقریریں کرنے سے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ اس کے لیے کسی مضبوط ذریعہ ابلاغ کی ضرورت ہے اور آج کل ٹی وی سے بڑھ کر ابلاغ کا پاورفل میڈیم کوئی دوسرا نہیں۔''

''تو کیا آپ کو لگتا ہے کہ آپ کا ڈرامہ مسائل کو حل کر دے گا؟'' اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

''پہلا مرحلہ تو مسائل کے ادراک کا ہے ہمارے لوگ تو یہ ہی نہیں جانتے کہ انہیں کس قسم کے مسائل درپیش ہیں۔ مسائل اور حقائق پر مبنی سنجیدہ قسم کے ٹاک شوز وغیرہ

دیکھنے کو غیر اہم جان کر لوگ صرف اور صرف انٹرٹینمنٹ میں مصروف ہیں۔ ایسے میں ڈرامہ ہی وہ واحد ذریعہ رہ جاتا ہے جس کے ذریعے ایک عام شخص کو ہلکے پھلکے انداز میں پیغام پہنچایا جائے۔ یقین کریں جب لوگ مسائل کو سمجھنے لگیں گے تو ان کے حل کے بارے میں بھی کوشاں ہوں گے میں جانتا ہوں میں اپنے کام کے ذریعے معاشرے میں کوئی انقلاب برپا نہیں کروں گا لیکن پھر بھی لوگوں میں احساس جگانے کی کوشش تو کی جاسکتی ہے۔"

سست رفتار گاڑی کی طرح اس کا لہجہ بھی بہت ہموار اور ٹھہرا ہوا تھا جانے کیوں غنویٰ کو اس کے لہجے کی گمبھیرتا نے اپنے حصار میں لینا شروع کر دیا اور ان دونوں کے درمیان چپ کی دیوار حائل ہوگئی۔

"آپ کی بہن کیسی ہیں اب؟" خاموشی کے ان لمحات میں حسنین حیدر کے سوال نے دراڑ ڈالی۔

"فزیکلی بہت بہتر زخم بھر گئے ہیں اس کے لیکن مینٹلی وہ اب بھی ڈسٹرب ہے۔ اکثر راتوں کو سوتے میں ڈر جاتی ہے۔ بول چال بھی بہت کم کردی ہے۔ سب کے درمیان بیٹھنے اور بات کرنے سے گھبرانے لگی ہے۔" غنویٰ نے دکھ سے بتایا۔

"ظاہر ہے جو کچھ اس پر بیتا ہے اسے بھلانے میں وقت تو لگے گا۔" حسنین نے مختصراً تبصرہ کیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ معاشرے میں عورت پر ظلم کب بند ہوگا کب تک وہ مردوں کی بربریت کا شکار ہوتی رہے گی۔" غنویٰ جو سارا وقت گھر والوں کو حوصلہ دیتی تھی خود اپنے اندر کے شکوے بیان کرنے لگی۔

"ایک بات کہوں غنویٰ! میں نے یہ جملہ بہت سنا ہے کہ عورت پر ظلم کا ذمہ دار مرد ہے لیکن مجھے لگتا ہے حقیقت یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں مرد اور عورت دونوں ظلم کا شکار ہیں۔ اگر عورت پر تیزاب پھینکنے، اسے جلانے، مارنے پیٹنے، قتل کرنے جیسے ظلم ہوتے ہیں تو مرد کون سا محفوظ ہے۔ راہ چلتے اغوا اور قتل جیسی وارداتوں کا شکار بنانا یا خود شکار کرنا



دونوں اس کی زندگی تباہ کر دیتے ہیں۔ ہمارا اصل مسئلہ مرد یا عورت نہیں "انسان" ہے۔ انسان جو تربیت کے مراحل سے گزرے بغیر ہی وحشی جانوروں کی طرح اس معاشرے میں پھیلتے جا رہے ہیں۔ اور موقع ملنے پر ایک دوسرے کو چیر پھاڑ دیتے ہیں اس انسان کو ہر مذہب اور قوم سے بالاتر ہو کر "احساس" کی دولت کی ضرورت ہے۔ اگر انسان کے اندر کی سچائی اور احساس بیدار ہو جائیں تو وہ کبھی وہ سب نہ کرے جس نے ہمارے معاشرے کو عدم تحفظ کا شکار بنا رکھا ہے۔"

"آپ کی سوچ بہت اچھی ہے۔" غنویٰ نے متاثر ہو کر کہا۔

"ہاں، لیکن کبھی کبھی مجھے لگتا ہے میں جس دنیا کے خواب دیکھتا ہوں، وہ بس میرے تصور میں ہی آباد ہو سکتی ہے۔" وہ اداسی سے مسکرایا۔

"اپنی تصوراتی دنیا کو قائم کرنا چاہے آپ کے بس میں نہ ہو مگر اس کو قائم کرنے کی جدوجہد کرنا تو آپ کے بس میں ہے نا!" غنویٰ نے اسے تسلی دی۔

"یہ تو ہے۔" وہ کھل کر مسکرایا اور گاڑی ان کے گھر کے گیٹ کے سامنے لے جا کر روک دی۔

"آپ کے کتے کے بھونکنے کی آواز آرہی ہے۔" گاڑی سے اترتے غنویٰ نے بھوں بھوں کی آواز سن کر کہا۔

"جی وہ میری گاڑی کی آواز پہچانتا ہے۔" اس کے لب خفیف سا مسکرائے۔ یقیناً اسے اپنی اور غنویٰ کی پہلی ملاقات یاد آگئی۔

☆☆☆

"طوبیٰ! یہاں اکیلی کیوں بیٹھی ہو۔ وہاں باہر سونیا، اسریٰ آپی اور پھپھو وغیرہ آئے ہوئے ہیں ان کے ساتھ جا کر بیٹھو طبیعت بہل جائے گی۔" وہ کپڑے استری کرنے کے ارادے سے کمرے میں آئی تھی۔ بیڈ پر چپ چاپ اپنی ہتھیلیوں پر نگاہ جمائے بیٹھی طوبیٰ کو دیکھ کر اس کے قریب چلی آئی۔

"میرا دل نہیں چاہ رہا آپی! میں یہیں ٹھیک ہوں۔" طوبیٰ کے انداز سے گریز

نمایاں تھا۔" زندگی اس طرح تو نہیں گزر سکتی جانو! سب سے کٹ کر اور چھپ کر پھر تم کسی سے چھپو ہی کیوں؟ آخر تم نے کیا ہی کیا ہے جو تم لوگوں کا سامنا نہیں کر سکتیں۔" غنویٰ نے اسے سمجھایا۔ جب سے طوبیٰ گھر سے واپس آئی تھی وہ وقتاً وقتاً یہ کام کرتی رہتی تھی ماموں کا گھر ان کے پرانے گھر کی نسبت کافی بڑا تھا اور افراد خانہ کو کمرے شیئر کرنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن غنویٰ نے طوبیٰ کی ذہنی حالت کے پیش نظر اسے علیحدہ کمرے میں رکھنے کے بجائے اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا لیکن پھر بھی مجھے لگتا ہے کہ لوگوں کی نگاہیں مجھے مجرم قرار دے رہی ہوں۔ میرے اندر کسی کا سامنا کرنے کا حوصلہ ہی نہیں ہوتا۔" طوبیٰ نے اپنے لب کچلتے بے بسی سے کہا۔

"ہیلو لیڈیز! کیا ہو رہا ہے؟" غنویٰ کچھ کہتی اس سے پہلے ہی دروازے پر دستک دیتے شمس اندر آ گیا۔

"بس طوبیٰ کو سمجھا رہی تھی کہ جو ہوا اسے بھول جائے۔" غنویٰ کے کہنے پر شمس نے غور سے طوبیٰ کی طرف دیکھا۔ اداس تنہا اور خوف زدہ لڑکی جس کے ساتھ گزرے حادثے کی نشانی اس کی گردن پر پڑے بدنما داغ کی صورت میں بہت واضح تھی تیزاب نے طوبیٰ کا دایاں کندھا اور گردن بری طرح متاثر کی تھی البتہ چہرے پر چند چھینٹے آئے تھے جس کے نشان ابھی تک موجود تھے شمس نے دل ہی دل میں کوئی فیصلہ کرتے گلا صاف کیا۔

"جو بات میں اس وقت کرنے جا رہا ہوں وہ بہت عرصے سے میرے دل ہے لیکن میں نے کسی مناسب اور اچھے وقت کے لیے سنبھال کر رکھی تھی مگر مجھے لگتا ہے کہ مجھے آج ہی یہ بات کر لینی چاہیے غنویٰ آپی! میں آپ کو گواہ بنا کر طوبیٰ کو ایک بات بتانا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ مجھے اس سے بے حد محبت ہے۔ آج سے نہیں بہت دنوں سے' اور اگر یہ نارمل زندگی کی طرف نہیں لوٹی تو میرے لیے زندگی بے معنی ہو جائے گی۔ اب فیصلہ کرنا اس کا کام ہے کہ یہ اپنے ساتھ ساتھ میری زندگی بھی ایک معمولی حادثے کی وجہ



سے ضائع کرتی ہے یا خود مسکرا کر میری زندگی کو خوشیوں کا عنوان دیتی ہے۔"

شمس اپنی بات کہہ کر رکا نہیں تھا جب کہ طوبیٰ ہونق سی منہ کھولے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں سے گزر کر شمس ابھی ابھی باہر نکلا تھا۔

"احمق' مسکراؤ' وہ تمہیں زندگی کا پیغام دے کر گیا ہے۔" غنویٰ نے اسے جھنجھوڑا تو وہ بے ساختہ ہنستے ہوئے اس کے گلے سے لگ گئی۔

"مگر آپی! کیا پھپھو مان جائیں گی؟" ایک خوف اس کی ہنسی ہڑپ کرنے آگے بڑھا تھا۔

"بالکل مان جائیں گی۔ کیونکہ رابی بھابھی کے رویوں نے انہیں انسانوں کی پہچان خوب اچھی طرح سکھا دی ہے۔" شمس ایک بار پھر کمرے میں تھا۔

"تم گئے نہیں یہاں سے۔" غنویٰ نے اسے گھورا۔

"جا ہی رہا تھا۔ لیکن کسی کی مدھر ہنسی نے پیروں میں زنجیر ڈال کر روک لیا۔"

اس نے شرارت سے طوبیٰ کی طرف دیکھا تو وہ یکدم ہی غنویٰ کی آڑ میں چھپ گئی۔ اس کی اس ادا پر شمس اور غنویٰ کا قہقہہ بہت بے ساختہ تھا۔

☆☆☆

"غنویٰ! اٹھو بیٹا! دیکھو تمہارے ابا کو کیا ہو رہا ہے؟" رات کو جانے کون سا پہر تھا جب اماں نے اس کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے اسے جگایا۔ وہ بہت گہری نیند سے جاگی تھی لیکن پھر بھی اس کی ساری حسیات بیدار ہو گئیں اور وہ اماں کے ساتھ تقریباً دوڑتے ہوئے ان کے کمرے تک پہنچی ابا سینے پر ہاتھ رکھے دوہرے ہوئے جا رہے تھے پسینہ گویا ان کے ہر مسام سے پھوٹ رہا تھا۔

"ہارٹ اٹیک۔" اس کے ذہن میں فوری طور پر یہ لفظ گونجا۔

"ابا...... ابا......! کیا ہوا ابو کو؟" طوبیٰ جو اماں کے غنویٰ کو بیدار کرنے کے عمل میں شاید جاگ گئی تھیں ان لوگوں کے پیچھے پیچھے وہاں چلی آئی اور اب ابا کی حالت دیکھ کر اس کی چیخیں نکل رہی تھیں۔

''ریلیکس طوبیٰ' ریلیکس' کچھ نہیں ہو گا ابا کو۔'' غنویٰ اسے دائیں بازو کے حصار میں لیے بائیں ہاتھ سے موبائل پر ضیاء کا نمبر پش کر رہی تھی۔

''خیریت غنویٰ! اتنی رات کو کیسے فون کیا؟'' ضیاء نے موبائل کی اسکرین پر اُبھرنے والے غنویٰ کے نمبر کو دیکھ کر اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی تشویش سے پوچھا۔

''ضیاء ابا کی طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے انہیں فوری طور پر ہاسپٹل لے جانا ہو گا۔ اور میری سمجھ نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں؟'' وہ جو خود کو بہادر ظاہر کر رہی تھی یکدم ہی سسکنے لگی۔

''ڈونٹ وری غنویٰ! میں ابھی آ رہا ہوں۔'' ضیاء فوراً ہی الرٹ ہو گیا تھا۔

''آپی! ابا کو کچھ ہو گا تو نہیں۔'' طوبیٰ شدت سے روتے ہوئے اس سے لپٹی جا رہی تھی۔

''کچھ نہیں ہو گا گڑیا تم حوصلہ کرو۔'' غنویٰ اسے تسلی دیتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئی۔ ابا کی لحہ بہ لحہ بگڑتی حالت سے وہ مزید ڈسٹرب ہو رہی تھی۔ پیچھے اماں ابا کو سنبھالنے میں لگی ہوئی تھیں۔

''غنویٰ! میں نے حسنین کو فون کر دیا ہے۔ وہ گاڑی نکال رہا ہے تم ابا کو اس کے ساتھ ہاسپٹل لے جاؤ۔ میں بھی وہیں پہنچ رہا ہوں۔'' صرف دو منٹ بعد ہی ضیاء نے اسے فون پر ہدایت دی تھی۔ یقیناً اس نے یہ قدم وقت کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اٹھایا تھا۔ غنویٰ نے بھاگ کر بیرونی گیٹ کھولا برابر والے گیٹ سے حسنین کی گاڑی باہر نکلی اور پھر وہ بہت تیزی سے گاڑی کا دروازہ کھول کر اس تک آیا۔

''اماں! آپ ان لوگوں کو سنبھالیں۔ میں حسنین کے ساتھ ابا کو ہاسپٹل لے جاتی ہوں۔''

طوبیٰ کی غیر ہوتی حالت کے پیش نظر اس نے اماں سے کہا تھا جب کہ حسنین اس دوران ابا کو بازوؤں میں اٹھا کر باہر کی طرف بڑھ گیا تھا غنویٰ بھی بھاگتے ہوئے اس کے پیچھے باہر نکلی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ابا کو سر گود میں رکھے بیٹھی غنویٰ کا روم روم دعا کر



رہا تھا۔ آنسو بہت تیزی سے آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ لیکن اسے خبر نہیں تھی ہاسپٹل پہنچ کر ابا کو طبی امداد دی جانے لگی۔ لیکن وہ خود پر قابو نہیں کر پا رہی تھی حسنین حیدر کو اس کے آنسو ڈسٹرب کر رہے تھے۔ ڈاکٹرز کی ہدایت کے مطابق بھاگ دوڑ کرتے بھی اس کا دھیان اس کی طرف چلا جاتا تھا۔

''کیا حال ہے ابا کا؟'' ضیاء بھی جلد ہی پہنچ گیا تھا۔

''ڈاکٹرز دیکھ رہے ہیں ان کا خیال ہے بہت شدید اٹیک تھا لیکن بروقت ہاسپٹل پہنچنے کی وجہ سے یقیناً وہ سنبھل جائیں گے۔'' جواب غنویٰ کے بجائے حسنین نے دیا تھا۔

''تھینک یو حسنین! میں نے اسی لیے تمہیں کال کی تھی کہ وقت ضائع نہ ہونے پائے۔'' ضیاء نے ممنونیت سے کہا۔

''تھینکس کی کوئی بات ہی نہیں پڑوسی ہونے کی وجہ سے یہ میرا فرض تھا۔ بلکہ خود غنویٰ کو چاہیے تھا کہ تمہارے بجائے مجھے کال کرتیں۔'' اس نے ایک نظر اس کی طرف ڈالتے ہوئے کہا جواب دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو خشک کر رہی تھی۔ یقیناً ضیاء کی آمد اور حسنین کے امید افزا جملوں نے اسے قدرے اطمینان دلایا تھا۔

''میں ڈاکٹر سے مل کر آتا ہوں۔'' کچھ پل خاموشی سے کٹے اور پھر ضیاء اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں نے ضیا سے ہمیشہ آپ کی ہمت اور حوصلے کی تعریف سنی ہے لیکن عجیب اتفاق ہے کہ میں نے آپ کو اکثر اس کے برعکس ہی پایا ہے۔'' بینچ پر قدرے فاصلے سے بیٹھی غنویٰ کی طرف دیکھتے اس نے کہا۔

''میں بہت عام سی لڑکی ہوں' میں نے کبھی بہادری کا دعویٰ نہیں کیا لیکن میں حالات سے لڑنے کی کوشش کرتی ہوں صرف اور صرف اپنے گھر والوں کی خاطر اور جب ان ہی لوگوں کی عزت یا جان خطرے میں دکھائی دے تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔'' اس نے بہت سادگی سے اپنی مجبوری بیان کی۔

حسنین خاموشی سے اسے دیکھنے لگا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا کر ٹھوڑی پر رکھے وہ یقیناً زیرِ لب دعاؤں میں مصروف تھی۔

"میری بات ہوئی ہے۔ ڈاکٹرز کہہ رہے ہیں کہ ابا اب خطرے سے باہر ہیں۔" تھوڑی ہی دیر میں ضیاء واپس لوٹ آیا۔

"حسنین یار! اب تم گھر جاؤ مجھے معلوم ہے کہ آج کل تم بہت بزی ہو۔ جا کر تھوڑی دیر ریسٹ کر لو یہاں پر اب میں موجود ہوں صبح یاسر بھائی اور شمس وغیرہ کو کال کر کے بلالوں گا۔" ضیاء نے اصرار کیا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"جب بھی ضرورت پڑے مجھے کال کر لینا کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔"

ضیاء سے ہاتھ ملاتے اس نے زور دے کر کہا اور واپسی کے لیے مڑ گیا مگر ہاسپٹل کی بینچ پر بیٹھی لڑکی، جو بہادر نہ ہونے کے باوجود بہت مخلص تھی اس کے تصور کے پردے پر لہراتی اس کے ساتھ ساتھ تھی۔

☆☆☆

"یہ لو چابی! آج سے تم گاڑی کی مالک ہوئیں۔" ضیاء نے اسے چابی تھمائی تو وہ خوش ہو گئی۔

"سچ تھینک یو ضیاء!"

"لیکن آپی! آپ گاڑی کا کریں گی کیا آپ کو ڈرائیونگ تو آتی نہیں۔" ہُدیٰ نے اعتراض کیا۔

"گاڑی لی ہے تو ڈرائیونگ بھی سیکھ لوں گی۔" جس دن سے ابا کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا اس پر اپنی ذاتی گاڑی لینے کی دھن سوار ہو گئی تھی اور آخر کار کافی جوڑ توڑ کے بعد یہ سیکنڈ ہینڈ ایف ایکس خریدنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

"اچھا بھئی میں تو چلا آج سونیا کو شاپنگ پر لے جانے کا وعدہ تھا۔ بہت دن سے اسے ٹائم نہیں دے پا رہا۔" ضیاء ان بہنوں کو مگن چھوڑ کر چلا گیا۔

"آپی! ہم آپ کی گاڑی میں خوب گھومیں گے۔ بس آپ جلدی سے



ڈرائیونگ سیکھ لیں۔" منی نے فرمائشی پروگرام شروع کیا۔

"ضرور!" اس نے منی کو تسلی دی لیکن خود اس کے ذہن میں بھی یہ مسئلہ تھا کہ اسے ڈرائیونگ سیکھنے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ اپنی جاب کو نوعیت کی وجہ سے کسی مخصوص ٹائم میں کوئی ڈرائیونگ انسٹیٹیوٹ جوائن کرنا بھی ممکن نہیں لگ رہا تھا اس کی اس سوچ بچار میں نوشابہ کی آمد نے خلل ڈالا تھا جب سے ابا ہاسپٹل سے گھر شفٹ ہوئے تھے روزانہ کوئی نہ کوئی ان کی خیریت معلوم کرنے آ ہی جاتا تھا۔

"مبارک ہو بھئی گاڑی لے لی۔" نوشابہ نے گلے ملتے اسے مبارک باد دی۔

"تھینک یو۔" غنویٰ بھی مسکرائی۔

"تایا جان! اب کس بات کی ٹینشن ہے آپ کو ماشاء اللہ دو بیٹیوں کی شادی ہو گئی ہے۔ طوبیٰ کے لیے بھی میں نے سنا ہے پھپھو نے شمس کا رشتہ دیا ہے۔ غنویٰ بھی خوب ترقی کر رہی ہے اب تو آپ کو خوش ہونا چاہیے اور آپ ہیں کہ بستر سنبھال کر بیٹھ گئے۔" تھوڑی دیر میں وہ ابا کے سامنے بیٹھی کہہ رہی تھی۔

"یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو بیٹا! لیکن بس دل ہی کچھ کمزور ہو گیا ہے۔" ابا نے مسکرا کر جواب دیا۔

"دل کو فکروں سے آزاد کر دیں۔ ہر چیز خود بخود ٹھیک ہو جائے گی۔ جس اللہ نے اب تک ساتھ دیا ہے۔ آگے بھی وہ انتظام کرتا جائے گا۔"

شادی کے بعد نوشابہ میں واضح تبدیلی آئی تھی۔ غنویٰ اسے ابا کے ساتھ چھوٹی چھوٹی باتیں کرتا دیکھ کر محسوس کر رہی تھی۔

"سنا ہے عباس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔" ابا سے فارغ ہو کر اس نے غنویٰ کو سرگوشی میں بتایا۔

"یہ تو بہت برا ہوا پھپھو تین چار دن پہلے آئی تھیں۔ لیکن انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں بتائی۔" غنویٰ کو حیرت کے ساتھ افسوس بھی تھا۔

"ہو سکتا ہے، ابا کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے نہ بتایا ہو۔" ساتھ ہی اس نے

اندازہ بھی لگایا۔

''آپی !حسنین بھائی اور ان کے پیرنٹس آئے ہیں ابا کو دیکھنے ۔میں نے فی الحال انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے ۔''طوبیٰ نے آکر اطلاع دی تو موضوع گفتگو بدل گیا۔

''انہیں یہیں لے آؤ طوبیٰ !ابا ڈرائنگ روم تک نہیں جا سکتے ۔''

اس نے کمرے میں گنجائش کا اندازہ لگا کر طوبیٰ کو ہدایت دی۔

''اچھا بھئی میں چلتی ہوں میرے میاں صاحب نے جلدی واپس آنے کا آرڈر دیا تھا۔''نوشابہ جانے کے لیے تیار ہوگئی۔

''رک جاؤناں' رات کا کھانا کھا کر جانا۔''

''نہیں بھئی وہ بڑے نازک مزاج ہیں اتنی دیر میں تو پارہ ہائی ہو جائے گا موصوف کا۔''وہ ایک پل بھی رکنے کو تیار نہیں تھی ۔یقیناً میاں کی نازک مزاجی ہی اس کے مزاج کی تبدیلی کا باعث بنی تھی۔

''السلام علیکم !''غنویٰ کو نوشابہ کے بارے میں زیادہ سوچنے کا موقع نہیں ملا حسنین اپنے والدین کے ساتھ وہاں آچکا تھا۔

''ممی اور ڈیڈی آج دوپہر لاہور سے یہاں پہنچے ہیں ۔میں نے آپ کی طبیعت کی خرابی کا بتایا تو آپ کی مزاج پرسی کے لیے چلے آئے ۔''ابا سے ملتے حسنین نے بتایا۔

''بہت نیک اور سمجھ دار ہے آپ کا بیٹا ۔بڑا ساتھ دیا اس نے میری بیماری میں۔''ابا حسنین کے والد سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس کی تعریفیں کرنے لگے۔

''یہ تو اس کا فرض تھا ۔پڑوسیوں کے بڑے حقوق ہوتے ہیں ۔اگر یہ کبھی کوتاہی کرے تو مجھے اطلاع دے دیجیے گا کان پکڑ کر سیدھا کردوں گا۔''حسنین کے والد کے لہجے میں بیٹے کے لیے محسوس کیا جانے والا مان تھا۔

☆☆☆





''اچھی ڈرائیونگ کے لیے سب سے ضروری چیز اعتماد ہے ۔اگر آپ میں خوداعتمادی نہیں تو آپ نہ صرف اپنی بلکہ دوسروں کی زندگی بھی خطرے میں ڈال سکتے ہیں۔''حسنین نے غنویٰ کو گاڑی سکھانے کی آفر کی تھی جو اس نے قدرے ہچکچاہٹ کے بعد قبول کر لی تھی۔

غنویٰ کے کپکپاتے وجود کو دیکھتے اس نے نصیحت کی ۔اتنے دنوں کی پریکٹس کے بعد وہ ٹھیک ٹھاک ڈرائیونگ کرنے لگی تھی ۔صبح صبح کے وقت خالی اسٹریٹس پر گاڑی چلانا کافی آسان لگتا تھا مگر آج جوں ہی اس نے اپنی اسٹریٹ سے گاڑی نکالی سامنے سے ایک دوسری گاڑی آگئی غنویٰ اس سچویشن پر گھبرا کر ہاتھ پاؤں چھوڑ بیٹھی تھی۔اگر حسنین بروقت کارروائی نہ کرتا تو حادثہ ہو جاتا تھا۔

''میں اس وقت ڈرائیو نہیں کر پاؤں گی۔''وہ بے بسی سے بولی تو حسنین خاموشی سے اپنی سائیڈ کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آگیا۔

غنویٰ نے برابر والی سیٹ پر کھسک کر اس کے لیے جگہ خالی کی۔

''آپ کو بھی بے حد شوق ہے بڑے بڑے بوجھ اپنے نازک شانوں پر اٹھانے کا ۔مان لیں کہ آپ لڑکیوں کی اس قسم سے تعلق نہیں رکھتیں جو مردانہ وار ہر کام کر گزرتی ہیں ۔''وائٹ سوٹ میں تھوڑی دیر پہلے گزرنے والا واقعہ کے زیر اثر اس کا چہرہ بھی سفید پڑا ہوا تھا۔

''میں جانتی ہوں کہ میں لڑکیوں کی اس قسم سے تعلق نہیں رکھتی اور نہ مجھے ویسا بننے کا شوق ہے ۔لیکن ویسا بننا میری مجبوری ہے ۔بھائی کی کمی نے ہم بہنوں کو جس عدم تحفظ کا احساس دے رکھا ہے ۔میں اس سے نکل کر ان کا سہارا بننا چاہتی ہوں۔''پتہ نہیں کیوں وہ اس شخص سے اپنے اندر کے احساسات شیئر کر جاتی تھی۔

''سوری' شاید میں نے آپ کو ہرٹ کیا۔''وہ گاڑی اپنے گھر کے قریب لا چکا تھا ۔گیٹ پر کھڑے ڈیڈی صاف دکھائی دے رہے تھے ۔انہیں دیکھ کر حسنین کے ذہن میں ان کی کل کی کہی بات گونجی ۔''تم اور غنویٰ ساتھ ساتھ بیٹھے بہت اچھے لگتے ہو ۔ذرا

فرصت نکال کر اس بات پر غور کرنا۔" گاڑی رکنے پر غنویٰ اتر کر ڈیڈی کے پاس چلی گئی تھی اور وہ پرسوچ نگاہیں اس پر جمائے غور کر رہا تھا۔

مخلص حساس اور باصلاحیت لڑکی' جسے تحفظ کا احساس مل جاتا تو یقیناً بہت نکھر سکتی تھی۔

☆☆☆

"پھپھو باقاعدہ رسم کے لیے آنا چاہ رہی ہیں۔"

"ہاں تو ٹھیک ہے' لیکن ان پر واضح کر دیجئے گا کہ شادی کے لیے جلدی نہ مچائیں۔ طوبیٰ پہلے اپنا ایف ایس سی مکمل کرے گی۔ پہلے ہی بے چاری اس حادثے کی وجہ سے امتحان نہیں دے سکی۔" اسریٰ آپی کی اطلاع پر اس نے دوٹوک جواب دیا۔

"پھپھو کچھ اور بھی کہہ رہی تھیں غنویٰ۔"

"کیا؟" اسریٰ آپی کی جھجکنے نے اسے چونکایا۔

"وہ چاہتی ہیں کہ تمہارا اور عباس کا رشتہ پھر جڑ جائے عباس نے خود مجھ سے بات کی تھی وہ ماضی میں ہونے والی تلخیوں پر شرمندہ ہے اس کا کہنا ہے کہ وہ اپنی بیوی سے رشتہ اس لیے قائم نہیں رکھ سکا کہ اس ک دل میں صرف اور صرف تمہارا خیال ہے۔ وہ تمہیں بھلا نہیں پایا غنویٰ۔"

"آپی.....!" صدمے سے وہ کچھ کہہ نہیں سکی۔

"مجھے معلوم ہے تمہیں یہ بات سن کر صدمہ پہنچا ہے لیکن یہ کوئی اتنی معیوب بات بھی نہیں اگر عباس کو اپنی غلطی کا احساس ہے تو تمہیں بھی اس کے لیے معافی کی گنجائش نکال لینی چاہیے۔" اسریٰ آپی اسے سمجھا رہی تھیں۔

"وہ شخص جسے رشتے نبھانے نہ آتے ہوں میں اس سے کوئی رشتہ کیسے جوڑ سکتی ہوں۔ وہ ایک خودغرض اور غیر مستقل مزاج شخص ہے جو زندگی میں کبھی بھی کسی بھی رشتے سے انصاف نہیں کر سکتا میرے لیے اس جیسے شخص کے ساتھ زندگی گزارنا ممکن نہیں۔" غنویٰ نے انکار کیا۔



"سو فیصد تو کوئی بھی پرفیکٹ نہیں ہوتا۔ ہمیشہ ایڈجسٹ کرنا پڑتا ہے یاسر کتنے سدھر گئے ہیں لیکن نازک مزاجی اپنی جگہ ہے پھر بھی دیکھو میں ان کے ساتھ گزارا کر رہی ہوں ایسے ہی ضیاء ہے تو بہت اچھی نیچر کا مالک لیکن اس کے پاس سونیا کو دینے کے لیے وقت بہت کم ہوتا ہے پھر اس کا ہر وقت شوبز کے لوگوں میں میل ملاپ سونیا کو تشویش میں مبتلا نہیں رکھتا ہوگا کیا لیکن گزارا ہو رہا ہے ناں عباس کی خامیوں پر بھی تم اس کی محبت کو ترجیح دے کر دیکھنا تو تمہیں وہ اتنا برا نہیں لگے گا۔"

"اماں اور ابا کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟" اسریٰ کے اس قدر اصرار پر اس نے چونک کر پوچھا۔

"وہ خوش ہی لیکن تمہاری رائے بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ ابا نے مجھ سے کہا تھا کہ غنویٰ کی رائے معلوم کر لو غنویٰ کے سوا کسی اور بیٹی کا معاملہ ہوتا تو میں خود سے فیصلہ سنا دیتا لیکن وہ تم سے مختلف ہے۔"

اسریٰ آپی کی بات نے اسے پاتال میں دھکیل دیا وہ تو سمجھی تھی کہ ابا اسے معاف کر چکے لیکن اس کے معاملے میں خود سے کوئی فیصلہ کرنے سے گریز کر کے انہوں نے ثابت کر دیا تھا کہ انہیں غنویٰ پر باقی بیٹیوں جیسا اعتبار نہیں اور وہ اس کی خودسری سے ڈرتے ہیں۔

"آپی! ابا سے کہیے گا کہ غنویٰ بھی ان کی بیٹی ہے اور جس طرح وہ اپنی ساری بیٹیوں کے لیے فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتے ہیں میرے لیے بھی جو چاہیں فیصلہ کریں۔ مجھے منظور ہوگا۔" وہ فیصلہ سنا کر رکی نہیں تھی۔

☆☆☆

"عرشی کا میڈیکل میں ایڈمیشن ہو گیا ہے۔ اس خوشی میں ہم لوگ گھر پر چھوٹا سا ایک فنکشن کر رہے ہیں۔ اسریٰ آپی کے ہاں میں اور سونیا دعوت دے آئے تھے پھپھو کے ہاں کل جائیں گے۔ آج کچھ وقت بچ گیا ہے تو سوچ رہا ہوں کہ حسنین کی طرف چلا جاؤں ساتھ ساتھ تمہیں بھی ڈراپ کر دوں گا۔" وہ لوگ اپنا سامان سمیٹ کر آفس سے

اٹھنے کی کر رہے تھے جب ضیاء نے اس سے کہا۔

''ڈرائیونگ کہاں تک پہنچی تمہاری ؟'' گھر کی طرف جاتے ضیاء نے اس سے پوچھا۔

''بس ٹھیک ہی ہے۔'' اس کا جواب مختصر تھا۔

''حسنین سے بات ہوئی تھی میری تو کہہ رہا تھا کہ تم آج کل کچھ زیادہ انٹرسٹ شو نہیں کر رہیں کچھ الجھی الجھی سی ہو کیا بات ہے کوئی پرابلم ہے کیا ؟''

''نہیں بس ایسے ہی دل نہیں لگ رہا۔''

''اگر کوئی مسئلہ ہو تو ضرور بتانا۔ میں تمہارا دوست بھی ہوں اور سونیا کے رشتے سے بھائی بھی۔'' ضیاء نے اسے آفر کی لیکن وہ چپ رہی اسے کسی کی مدد نہیں چاہیے تھی وہ صرف ابا کی نظر میں سرخرو ہونا چاہتی تھی۔

''تم بھی میرے ساتھ چلو حسنین کے ممی ڈیڈی اتنی باتیں کرتے ہیں میں اکیلا دونوں کو نہیں نمٹا سکتا۔'' حسنین کے گھر کے آگے گاڑی روکتے ضیاء نے کہا تو وہ بے ساختہ مسکرا دی۔

''یہ آپ لوگ کپڑوں کی دکان لگائے کیوں بیٹھے ہیں۔''

ملازم نے انہیں لاؤنج تک پہنچایا جہاں حسنین کے ممی ڈیڈی کپڑوں کے ڈھیر کے سامنے بیٹھے تھے۔

''اپنی بہو کے لیے منگنی کے سوٹ کی سیلکشن کر رہے ہیں مگر کوئی فیصلہ ہی نہیں ہوتا۔'' حسنین کی ممی نے غنویٰ کو پیار کرتے ہوئے بتایا۔

''کیوں اس میں ایسی کیا مشکل ہے؟'' ضیاء حیران ہوا۔

''بھئی مجھے ریڈ کلر پسند ہے۔ حسنین اور حیدر میں پنک اور بلیو پر بحث ہے۔ حسنین کہتا ہے اس پر پنک کلر سوٹ کرتا ہے۔ تمہارے انکل کا کہنا ہے وہ بلیو میں بہت اچھی لگتی ہے۔ ادھر لاہور سے سبین افشین کے فون پر فون آ رہے ہیں کہ بھابھی کے لیے منگنی کا جوڑا میجنٹا کلر کا ہونا چاہیے آج کل یہ کلر ان ہے پھر تم بتاؤ کہ فیصلہ کرنا مشکل



ہو گا کہ نہیں۔'' آنٹی نے تفصیلات بتائیں۔

''کوئی مشکل نہیں ہے بس میری پسند سے بلیو کلر کا سوٹ پسند کر لو۔ صاحبزادے سے میں خود نمٹ لوں گا۔'' حیدر صاحب بڑے پرجوش تھے۔

''صاحبزادے بھی کوئی کم نہیں ہیں۔ اپنی پسند سے ایک انچ نہیں ہلیں گے۔'' حسنین کی ممی بیٹے کی مزاج آشنا تھیں۔

''چلو ایسا کرتے ہیں غنویٰ سے فیصلہ کروا لیتے ہیں جو یہ کہے گی وہی ہو گا۔'' حیدر صاحب کے یکدم کہنے پر وہ بوکھلا گئی۔

''انکل! میں کیسے آپ لوگ اپنی مرضی سے پسند کریں۔''

''نہیں غنویٰ! تمہارے انکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ تم ہی اس مسئلے کو حل کر دو ورنہ ہم سب تو یوں ہی آپس میں جھگڑتے رہیں گے۔'' آنٹی نے بھی زور دیا تو وہ کپڑوں کے ڈھیر پر نظر دوڑانے لگی۔ پنک کلر کا سوٹ جس پر فیروزی اور پنک کے امتزاج سے خوبصورت کام بنا ہوا تھا بہت جلد اس کی نظر میں آ گیا تھا۔

''یہ دیکھیں آنٹی! یہ سوٹ کیسا ہے۔''

''بہت خوبصورت حسنین بھی اسی پر زور دے رہا تھا۔'' انہوں نے اسے داد دیتے ہوئے بتایا۔

''کیوں حیدر صاحب! جچے گی نا ہماری بہو اس جوڑے میں۔'' ساتھ ہی حیدر صاحب کی رائے بھی مانگی۔

''کیوں نہیں! سارے رنگ بنے ہی ہماری بہو کے لیے ہیں۔'' حیدر صاحب کے لہجے میں بڑا پیار تھا۔

''حسنین جیسا نفیس شخص اور اتنے پیار کرنے والے سسرالی جس لڑکی کو ملیں وہ یقیناً بڑی خوش نصیب ہو گی۔'' غنویٰ نے دل میں سوچا۔

''یہ حسنین حیدر کی منگنی کب طے پائی انہوں نے مجھے نہیں بتایا حالانکہ ہم روزانہ ملتے ہیں۔'' واپسی میں وہ ضیاء سے پوچھ رہی تھی۔

''اچھا حالانکہ اسے تمہیں ہی سب سے پہلے بتانا چاہیے تھا۔'' ضیاء کے لہجے میں شرارت تھی۔

''اب میں نے یہ بھی نہیں کہا۔'' وہ خفا سی گھر میں گھس گئی۔ ضیاء ہنستے ہوئے اس کے پیچھے ہی تھا۔

☆☆☆

''ماموں جان! جلدی سے ہاں کریں تو ہمارے گھر میں بھی کوئی تقریب منعقد ہو جس میں تم ہماری خاطر بنو سنورو'' وہ کولڈ ڈرنک کی خالی بوتل ٹیبل پر رکھ کر پلٹ رہی تھی کہ عباس اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں عباس!'' ناگواری کے شدید احساس کو اپنے اندر چھپاتے اس نے عباس سے کہا۔

''زہے نصیب! چلو باہر چلتے ہیں۔ یہاں تو بہت لوگ ہیں سکون سے کوئی بات نہیں ہو سکتی۔'' عباس کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ غنوی نے نظر اٹھا کر اردگرد نظر اُٹھا کر اردگرد نظر ڈالی۔ ہر ایک خوش گپیوں میں مگن تھا۔ اپنی کامیابی پر نازاں عرشی باری باری سب کے ساتھ فوٹو گرافس بنوا رہی تھی۔

''میں چاہتی ہوں کہ ہماری انگیجمنٹ ہو جائے لیکن شادی چند سالوں بعد منی اور ہدیٰ کے کسی لائق ہونے کے بعد ہو۔'' ضیاء کے گھر کے سامنے نیم تاریک اسٹریٹ پر چلتے اس نے عباس سے کہا تھا۔

''میں تو سمجھا تھا کہ اتنے سالوں میں تم سدھر گئی ہو گی لیکن تمہاری تو وہی پہلے والی ضد ہے۔'' عباس نے ناگواری سے کہا۔

''یہ ضد نہیں ہے عباس! مجبوری ہے۔ اکیلے ابا کیا کچھ کریں گے اور اب ہارٹ اٹیک کے بعد تو انہیں کسی سہارے کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔'' اس نے اپنا لہجہ مصالحانہ رکھا۔

''ان سارے مسائل سے میرا کوئی تعلق نہیں۔'' عباس نے رکھائی سے جواب



دیا۔

''میں جلد از جلد تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اب مجھ سے تمہارے بغیر نہیں رہا جاتا۔'' اس کا فیصلہ بہت حتمی تھا۔

''یہ کیسی محبت ہے عباس! جو تمہیں قربانی کا درس نہیں دیتی۔''

''میری محبت تو مجھے صبر کا بھی درس نہیں دیتی۔'' اس نے یکدم ہی غنوی کا دوپٹہ کھینچ لیا۔

''بدتمیزی مت کرو عباس۔'' وہ چیخی نیم تاریک سڑک جس پر چلتے چلتے وہ گھر سے کافی دور نکل آئے تھے اور عباس کے تیور اسے سہا رہے تھے۔

''اسی بدتمیزی کے لیے میں تمہیں یہاں تک لایا ہوں غنوی نصیر! جب تم اس دوپٹے کے بغیر لوٹو گی تو پھر کون ہو گا جو تمہاری پارسائی پر یقین کر لے۔ اور پھر ماموں جان کے پاس میرے لیے ہاں کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو گا۔''

''مگر تمہیں ایسا کرنے کی کیا ضرورت ہے ابا تو پہلے ہی راضی ہیں۔'' غنوی کی حیرانی پر اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

''تمہاری یہی لاعلمی تو تمہیں مار گئی غنوی نصیر! سنو ماموں جان مجھے صاف انکار کر چکے ہیں۔ امی نے بتایا ہے کہ تمہارا کسی دوسری جگہ سے بہت اچھا رشتہ آیا ہوا ہے لیکن گھر والے سرپرائز دینے کے چکر میں تمہیں سچ نہیں بتا رہے۔'' وہ کون سے انکشافات کر رہا تھا، غنوی کا سر چکرانے لگا۔

''میرا دوپٹہ واپس کرو عباس۔'' حیرانی کے لمحے سے نکل کر اسے اپنی آکورڈ پوزیشن کا احساس ہوا تو چلائی۔

''یہ تو خیر ممکن نہیں۔ بلکہ میں سوچ رہا ہوں تمہارا حلیہ تھوڑا سا اور خراب کر دوں تاکہ لوگوں کا شک یقین میں بدل جائے۔'' وہ اس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ایک زوردار دھکے نے اس کو لڑھکا دیا۔

''تم کیا اس کے باڈی گارڈ لگے ہو جو ہر دفعہ دخل اندازی کے لیے آجاتے

ہو۔'' سامنے موجود شخص کو دیکھ کر عباس جھنجلایا تھا۔

''درست اندازہ لگایا تم نے اور مزید تمہاری اطلاع کے لیے عرض کر دوں کہ یہ ذمہ داری میں نے ساری زندگی کے لیے اٹھانے کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔'' اس کے ہاتھ سے دوپٹہ جھپٹ کر غنوئی کو دیتے اس نے کہا اور پھر ایک زوردار ٹھوکر عباس کی پہلو میں ماری۔

''آہ! میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں غنوئی صرف میری ہے۔'' عباس کراہتے ہوئے چیخا۔

''امی نے بھی میرے ساتھ دھوکا کیا تمس کے لیے ہاں کروائی تو کیا میرے لیے نہیں کرواسکتی تھیں۔''

''میں تمہیں اس لائق ہی نہیں چھوڑوں گا کہ تم آئندہ غنوئی کا نام بھی لے سکو۔'' اس نے عباس کو ٹھکروں پر رکھ لیا تھا۔

''بس کریں حسنین۔'' غنوئی نے یکدم ہی اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے اس روکا تو وہ یکدم ہی رک گیا۔

''تمہیں کس نے کہا تھا اس وقت اس پاگل کے ساتھ باہر آنے کو۔'' غنوئی کے ساتھ واپسی کے لیے قدم اٹھاتے اس نے اسے گھورا۔

''میری لاعلمی کا فائدہ اٹھا کر وہ مجھے یہاں تک لایا تھا۔'' غنوئی نے اسے تفصیل سنائی۔

''شکر ہے وہ تو بدئی نے تمہیں اس کے ساتھ باہر نکلتے دیکھ لیا اور مجھے اطلاع دے دی ورنہ یہ ذہنی مریض شخص اپنے عزائم تمہیں بتا ہی چکا تھا۔''

''کہیں یہ پھر دوبارہ مجھے تنگ کرنے کی کوشش نہ رے۔'' غنوئی کو خوف محسوس ہوا۔

''آئندہ یہ تمہاری طرف دیکھنے کی جرات بھی نہیں کر سکے گا۔ یہ صرف اس لیے شیر بنا ہوا تھا کہ تمہیں تنہا سمجھتا تھا۔ لیکن آج کے بعد میں تمہارے ساتھ ہوں اور اگر اسے



میرے ہاتھوں کی مار نے نہیں سدھارا ہوگا تو میں اپنے سنی (بلڈاگ) کو اس پر چھوڑ دوں گا۔''

حسنین اپنے عزائم کا اظہار کر رہا تھا۔ غنوئی نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے عباس سے بھی ایسی ہی کوئی بات کی تھی حسنین کے گھر میں اس کی منگنی کی تیاری خود اس کے اپنے گھر میں پھپھو کی آمد ورفت گھر والوں کا پر اسرار رویہ بات کچھ کچھ سمجھ میں آنے کے باوجود الجھی ہوئی تھی۔

''احمقوں کی طرح آنکھیں پٹپٹانے کے بجائے تھوڑا شرمانے کی پریکٹس کرو۔ نیکسٹ ویک منگنی کے بجائے ہم دونوں کا نکاح ہو رہا ہے۔''

''نکاح لیکن اتنی اچانک یہ سب کیسے ہو سکتا ہے۔''

''دیکھو بھئی بات یہ ہے کہ میں منگنی' مایوں' مہندی' جیسے فضول فنکشنز کا بالکل قائل نہیں اس لیے ڈائریکٹ نکاح کا فیصلہ کیا ہے۔'' وہ جیسے اس سے منگنی نہ ہونے کی وجہ پوچھ رہی تھی جو وہ اسے نکاح کے اسباب بتا رہا تھا۔

''مجھ سے کسی نے اتنی بڑی بات کا ذکر ہی نہیں کیا۔'' اسے صدمہ ہوا۔

''تو تم نے خود ہی تو فیصلے کا حق ابا کو دے دیا تھا۔ اب کیا انکار کرنا چاہتی ہو۔''

''نہیں یہ بات نہیں مگر ابا تو......'' اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑا۔

''ہاں تمہارے خیال میں ابا تو تم پر عباس کو مسلط کرنے کا فیصلہ کر کے بیٹھے تھے عقل مند خاتون! انہوں نے صرف تمہاری رائے جاننا چاہی تھی اس لیے نہیں کہ انہیں تم سے گستاخی کا ڈر تھا بلکہ اس لیے کہ وہ تمہیں اپنی سب بیٹیوں میں عقل مند اور دانا سمجھتے ہیں۔ لیکن انہیں کیا معلوم کہ ان کی سب سے احمق بیٹی میرے پلے بندھے والی ہے۔''

''تو نہ کریں آپ مجھ سے شادی۔ کبھی میں آپ کو بزدل لگتی ہو' کبھی احمق' کبھی اعتماد سے عاری۔'' وہ وہیں رک کر اس سے الجھنے لگی تھی۔

''شادی تو مجھے تم سے ہی کرنا ہے کیونکہ یہ میری مجبوری ہے۔'' وہ خود بھی رک

گیا تھا اور سینے پر ہاتھ باندھے بہت دلچسپی سے نیم تاریکی میں اس کے چہرے کے نقوش تلاش کر رہا تھا۔

''کیسی مجبوری۔'' وہ چونکی۔

''مجھے تم سے محبت جو ہو گئی ہے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

''دیوار پھلانگ کر گھر میں گھسنے والی لڑکی سے احمقانہ محبت۔''

''ہاں لیکن اس محبت میں تمہارے اس کرتب کا کوئی دخل نہیں کیونکہ یہ محبت بہت آہستگی سے بتدریج ہوئی ہے مجھے تمہارے ظاہر نے نہیں بلکہ باطن نے تسخیر کیا ہے تم احساس کی دولت سے مالا مال ہو اور میں اپنی زندگی کی ساتھی میں یہی خوبی دیکھنا چاہتا ہوں۔'' وہ بہت سلجھاؤ سے اعتراف کر رہا تھا۔

''تو آپ مجھے میرے گھر والوں کو سپورٹ کرنے دیں گے۔'' اس کے لیے اس سوال کا جواب بہت اہم تھا۔

''بالکل' بلکہ میں خود تمہارا ساتھ دوں گا۔ لائف پارٹنر ہوتا ہی وہ ہے جو اپنے پارٹنر کے ہر مسئلے میں اس کا ساتھ دے۔''

''تھینک یو حسنین۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

''اف! مجھے لگتا ہے ساری عمر میں یہ آنسو ہی صاف کرتا رہوں گا۔''

''اوئے! یہ کیا تم لوگوں نے بیچ راستے میں لیلیٰ مجنوں کا ڈرامہ شروع کر رکھا ہے۔'' ایک کڑک دار آواز پر غنویٰ گھبرا کر پیچھے ہٹی تھی سامنے ضیاء کھڑا قہقہہ لگا رہا تھا۔

''تو تو اخبار میں خبر لگا دے کہ ایم (Aim) تھیٹرز اینڈ پروڈکشن کے مینجنگ ڈائریکٹر کا صحافی خاتون غنویٰ نصیر سے کھلے عام معاشقہ ......''

حسنین نے ضیاء کے بازو پر مکا جڑتے ہوئے کہا۔

''نہیں بھئی اب تو ہم ڈائریکٹ Aim کے ایم ڈی۔ اور اپنے اخبار کی نامور صحافی کی شادی کی خبر لگائیں گے۔''



ضیاء نے بہت لاڈ سے حسنین کی کمر میں بازو ڈال کر کہا اگلے ہی پل فضا ان کے جاندار قہقہوں سے گونج رہی تھی غنویٰ کی شرمیلی اور مدھم ہنسی بھی ساتھ شامل تھی۔ تلخ ایام ڈھل گئے تھے اور نئی رت اس کے استقبال کو سامنے کھڑی تھی۔ اس رت میں سکھ کا پنچھی خوشیوں کی نوید لیے اس کے گرد چہچہا رہا تھا۔

☆☆☆

# تجھ پر دل ہارا

"عجیب بے ڈھنگی ہو گئی ہے یہ لڑکی کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہا۔" ماہا نے بڑبڑاتے ہوئے اپنے برابر سوئی زوہا کے سینے پر سے احتیاط سے کتاب اٹھا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور اسی احتیاط کے ساتھ پائنتی پہ رکھی چادر کھول کر اس پر پھیلا دی۔ اس کی اس عادت کو شدید ناپسند کرنے کے باوجود وہ اس کی نیند میں خلل نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔

"اور اس کی نیند رہ بھی کتنی گئی ہے۔" اس نے ایک سرد سی آہ بھرتے ہوئے وال کلاک پر نظر ڈالی جو اس وقت ساڑھے چار بجا رہی تھی۔ زوہا کی پچھلے کئی دنوں کی روٹین اور موجودہ انداز کو دیکھتے ہوئے وہ ابھی ابھی نیند سے بیدار ہونے کے باوجود سمجھ سکتی تھی کہ اسے سوئے ہوئے پندرہ بیس منٹ سے زیادہ نہیں ہوئے ہوں گے۔

عجیب سی بات تھی کہ زوہا جو ہمیشہ نیند کی رسیا رہی تھی اب سونا بھولتی جا رہی تھی۔ ورنہ اس کا معمول تھا کہ رات گیارہ ساڑھے گیارہ بجے بڑے اہتمام سے سونے کی تیاری کر کے بستر پر آتی کچھ دیر آنکھیں موندے مزے سے لیٹی رہتی اور پھر بے فکری سے سو جاتی نیند بھی ایسی گہری آتی تھی اسے کہ صبح نماز کے لیے جگانا دشوار ہو جاتا یہاں تک کہ امتحان کے دنوں میں بھی وہ اپنی روٹین سے ایک آدھ گھنٹہ زیادہ نہ جاگ پاتی تھی اس نے اپنے ہر کام کے لے ایک ٹائم ٹیبل بنا رکھا تھا درسی کتابیں پڑھنا' گھر کے کام' ٹی وی دیکھنا یا کسی تفریحی کتاب کا مطالعہ کچھ بھی اسے اس کے مقررہ اوقات کو تبدیل کرنے پر



مجبور نہیں کر پاتا تھا وہ تو اپنی پسندیدہ ترین مصنفہ کی تحریریں بھی ٹائم ختم ہو جانے پر اگلے دن کے لیے اٹھا رکھتی تھی۔ لیکن اب تو جیسے عجیب جنونی سی ہوتی جا رہی تھی ٹی وی کے سامنے بیٹھی تو رات گئے تک اٹھنے کا نام نہ لیتی کتاب ہاتھ میں پکڑ کر بستر پر لیٹے لیٹے کچھ پڑھنا شروع کرتی تو جب تک الفاظ نظروں کے سامنے گڈمڈ نہ ہونے لگتے آنکھیں نیند سے بوجھل ہو کر خود بخود بند نہ ہو جائیں اور ہاتھ میں پکڑی کتاب گر نہ جاتی وہ سونے کے بارے میں سوچتی تک نہیں۔

شروع شروع میں تو ماہا کو اس کے اس نئے معمول نے بے حد پریشان کیا تھا اور وہ رات رات بھر لائٹ جلائے رکھنے پر اس سے لڑی بھی بہت تھی لیکن اب تھک ہار کر خاموشی اختیار کر لی تھی۔

وہ اکثر سوچتی کہ کسی دن موقع ملنے پر کھل کر زوہا سے اس کے مسئلے پر بات کی جائے کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اپنے دل کی بات چھپا چھپا کر رکھنے کی عادی تھی۔

اپنی تقدیر کے اس عجیب و غریب موڑ کی ذمہ دار ایک طرح سے وہ خود ہی تھی۔ جب وقت ہاتھ میں تھا تو کسی قسم کا کوئی قدم نہ اٹھایا اور اب وحشی ہرنیوں کی طرح سارے میں چکراتی پھرتی تھی رات کے ان وحشت ناک گھنٹوں کو گزارنے کے بعد وہ اگلا پورا دن اسی طرح مصروف گزارتی جیسے وہ رات بہت سکون سے سوئی ہو وہی یونیورسٹی جانا اپنے پہنے جانے والے کپڑوں اور ان کی میچنگ جیولری اور چپل کا خیال رکھنا گھر کے کام نمٹانا اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر اونچے اونچے قہقہے لگانا بس راتیں اس پر کتنی بھاری گزرتی تھی اس بات کی واحد گواہ ماہا تھی جو کسی دوسرے پر اس کی حالت عیاں کرنا تو دور کی بات خود اس سے بھی بات کرتے ڈرتی تھی کہ کہیں اس کی "انا" جسے وہ ہر بات سے بڑھ کر عزیز رکھتی ہے مجروح نہ ہو جائے۔

☆☆☆

"زوہا! چلو تم جا کر سو جاؤ ہم بھی سونے جا رہے ہیں۔"

"ابھی سے ......ابھی تو مجھے نیند بھی نہیں آ رہی۔" جرجیس بھائی کی ہدایت پر

اس نے حیرت سے جواب دیا۔

''لیکن مجھے تو آ رہی ہے ناں! اور اپنی بھابی کی حالت دیکھو، بالکل ہی بے حال ہو رہی ہے ویسے بھی تمہیں معلوم ہے ان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔'' کہنے کے ساتھ انہوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ نیا بھابھی نے بھی ان کی تقلید کی۔

زوہا چند لمحے تو حیرت سے انہیں سیڑھیاں اترتے دیکھتی رہی پھر یکدم ہی اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے آج کل یوں بھی وہ بڑی حساس ہو رہی تھی اور جرجیس بھائی کی بے نیازی سہنے کی عادت تو اسے بالکل بھی نہیں تھی۔ وہ بچپن سے انہیں اپنے لاڈ اٹھاتے ہوئے دیکھنے کی عادی تھی چنانچہ یہ معمولی سی بے التفاتی بھی اس کی نازک مزاجی کو ٹھیس لگا گئی تھی آج کتنے دنوں بعد تو وہ یہاں رہنے آئی تھی۔ اور اس پر بھی بھائی کے روکھے سے رویے نے اسے بری طرح ہرٹ کیا تھا۔

وہ کچھ دیر ستاروں بھرے آسمان پر نظر جمائے بیٹھی رہی پھر خود بھی نیچے جانے کے لیے سیڑھیاں اترنے لگی جرجیس بھائی کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ یکدم ٹھٹھک گئی اندر سے نیا بھابھی کی آواز آ رہی تھی۔

''آپ اس طرح سے اٹھ کر کیوں آ گئے جرجیس! زوہا کو برا لگا ہو گا۔'' وہ کہہ رہی تھیں۔

''بھئی! تمہاری وجہ سے آ گیا تم سے زیادہ دیر بیٹھا جو نہیں جاتا آج کل۔'' ان کا انداز ٹالنے والا تھا۔

''میرا پرابلم تھا تو میں نیچے آ کر سو جاتی! آپ کو تو بیٹھنا چاہیے تھا زوہا کے پاس آپ جانتے تو ہیں وہ یہاں خاص طور پر آپ کی خاطر آتی ہے۔'' نیا بھابھی نے زوہا کے دل کی بات کی تھی۔

''نہیں بیٹھ سکتا تھا میں اس کے پاس۔ کیونکہ مجھ میں اسے دکھی دیکھنے کا حوصلہ نہیں ہے تم نے دیکھے ہیں اس کی آنکھوں میں آنسو اور ان کے اندر پھیلی ویرانی اگر آج میں تنہا اس کے پاس بیٹھ جاتا تو وہ اپنے اندر موجود ہر آنسو میرے شانوں پر بہا دیتی



بچپن سے عادت ہے اسے اپنا ہر دکھ میرے ساتھ شیئر کرنے کی لیکن آج میں اس کے آنسو شیئر کرنے کی ہمت خود میں نہیں پاتا اگر وہ میرے سامنے روئی تو میری برداشت کی حد ختم ہو جائے گی اور اگر ایسا ہوا تو اس کے ساتھ میں نہ جانے کیسا سلوک کر گزروں جب بھی میں ان دونوں کو سامنے رکھوں گا مجھے یقین ہے بہن کی محبت بھائی کی محبت سے جیت جائے گی۔ لیکن میں اپنے بھائی کو بھی نہیں کھونا چاہتا نیا! وہ میرا اکلوتا بھائی ہے میں کیسے اسے چھوڑ سکتا ہوں۔'' جرجیس عبداللہ کے لہجے میں جو بے بسی تھی اسے محسوس کر کے پہلے سے دکھی زوہا طارق کے دل کو مزید ٹھیس لگی۔

''میں سمجھتی ہوں کہ میں نے اپنے دل کی ہر بات اپنے دل میں دفن کر لی ہے لیکن جو لوگ اس دل کی ہر دھڑکن میں بستے ہیں بھلا وہ یہاں ہونے والی شکست ریخت سے کس طرح ناواقف رہ سکتے تھے'' بوجھل قدموں سے وہ خالہ امی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی ان کی وفات کے بعد سے وہ جب بھی یہاں آتی اسی کمرے میں قیام کرتی تھی وہاں اسے اب بھی ان کے وجود کی خوشبو محسوس ہوتی تھی اور یہ خوشبو ہر بار اسے ماضی کے خوش رنگ دنوں کی یاد میں کھو جانے پر مجبور کر دیتی تھی۔

☆☆☆

''خالہ امی! آپ مجھے تانی آپی کی شادی کے لیے چٹاپٹی کا غرارہ سی کر ضرور دیجئے گا بہت پسند ہے مجھے۔ لیکن ممی کو سینا ہی نہیں آتا کہیں سے نہیں لگتا کہ وہ آپ سی سگھڑ خاتون کی بہن ہیں۔''

خالہ امی کی گود میں لیٹے لیٹے اپنی فرمائش نوٹ کروانے کے ساتھ اس نے ماں کے خلاف شکوہ بھی کیا۔

''حمیرا چھوٹی ہونے کی وجہ سے بہت لاڈلی تھی گھر بھر کی اس لیے ہم لوگوں نے اسے کبھی کسی الجھن میں نہیں ڈالا اسے تو بس وقت کے وقت تیار شدہ چیزیں مل جاتی تھیں استعمال کرنے کو جیسے اب تمہیں مل جاتی ہیں۔''

''آہا! زوہا طارق صاحبہ جلوہ افروز ہیں ہمارے اس غریب خانے پر جب ہی تو

میں کہوں یہ گھر کی فضاؤں میں غیبتوں کی بدبو کیوں پھیلی ہوئی ہے۔" وہ شاید باہر کھڑے کھڑے ہی خالہ بھانجی کی گفتگو سن چکا تھا۔لہٰذا اب اسے چڑا رہا تھا لیکن الفاظ کے بر خلاف اس کی آنکھوں اور لہجے سے شگفتگی پھوٹ رہی تھی۔

"غیبتیں کرنے کی عادت خود تمہیں ہی ہوگی مجھ پر ایسا گھٹیا الزام لگانے کی جرات ہرگز مت کرنا۔" اس کی بات پر تپ ہی تو گئی تھی چنانچہ جھٹ خالہ امی کی گود سے سر نکال کر لڑنے کھڑی ہوگئی۔

"الزام لگا رہا ہوں یہ خوب کہی تم نے اور ابھی ابھی جو تم میری پیاری آنٹی کی برائیاں کر رہی تھیں وہ کچھ نہیں اسی کو تو کہتے ہیں چوری اور اس پر سے سینہ زوری۔" اسے زوہا کو چھیڑنے میں ہمیشہ ہی بہت لطف آتا کہ اس کا غصے سے سرخ پڑتا چہرہ کچھ اور حسین ہو جاتا تھا۔

"تمہاری آنٹی ہیں تو میری بھی ممی ہیں میرا جو دل چاہے میں انہیں کہہ سکتی ہوں۔" اس کی بات پر اندر ہی اندر شرمندہ ہونے کے باوجود وہ نہایت ڈھٹائی سے بولی۔

"ارے۔تم تو بڑی خطرناک لڑکی ہو یعنی کل کو میری ماں کی برائیاں کرنے کھڑی ہو جاؤ گی اور میں بولوں گا تو صاف کہہ دو گی کہ اپنی خالہ امی کی برائی کر رہی ہوں تم کون ہوتے ہو روکنے والے۔" اس کے مخصوص انداز کی نقل اتارتے اس نے کچھ اس طرح سے یہ جملہ ادا کیا تھا کہ خالہ امی بھی مسکرا دیں۔

"دیکھ رہی ہیں آپ خالہ امی! خوامخواہ ہی میرے منہ لگے جا رہا ہے۔" اس نے فوراً اپنی سب سے بڑی حامی کو مدد کے لیے پکارا۔

"خبردار اسیس! جو تم نے میری بیٹی کو تنگ کیا ہو تو یہ تو بہت ہی نیک اور معصوم ہے جس گھر جائے گی وہاں خوشیاں رقص کرنے لگیں گی اس کے دم سے ہی تو میرے گھر میں رونق ہو جاتی ہے کچھ دن کے لیے ورنہ تم دونوں بھائی تو گھر میں ٹکتے ہی نہیں ہو۔"

"تو آپ لے آئیں نا اس رونق کو ہمیشہ کیلیے اس گھر میں۔" اس کی ذومعنی



انداز میں کی گئی سرگوشی خالہ امی نے تو شاید نہیں سنی لیکن زوہا کے کانوں کی لوئیں تک سرخ پڑ گئیں۔لیکن یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ اس نے کچھ نہیں سنا وہ بے نیازی سے قریب رکھے ایک رسالے کی ورق گردانی میں مصروف ہوگئی وہ خود بھی اس کی طرف سے رخ موڑ کر اپنے جوتے اتارنے لگا البتہ باآواز بلند گنگناہٹ جاری تھی۔

☆☆☆

تم دونوں میں سے کون سخی ہے جو اس وقت مجھ غریب کو ایک کپ چائے پلا کر میری دعائیں سمیٹے گا۔" اسیس عبداللہ نے چہرے پر زمانے بھر کی مسکینیت طاری کرتے ہوئے سوال کیا۔وہ آج یونیورسٹی سے سیدھا یہیں چلا آیا تھا اصل میں آج خالہ امی اور حمیرا آنٹی کا شاپنگ کے لیے جانے کا ارادہ تھا اس لیے خالہ امی صبح ہی دونوں بھائیوں کو واپسی میں ان کے فلیٹ پر پہنچنے کی تاکید کر چکی تھیں۔دوپہر کا کھانا تو تیار تھا اس لیے ماہا نے بنا کسی دشواری کے اس کے حضور پیش کر دیا لیکن مسئلہ اب ایک کپ چائے بنانے کا تھا جس کے لیے وہ نہایت عاجزی سے سوال کر رہا تھا۔

"سوری اسیس بھیا! میں تو اس وقت کافی مصروف ہوں ورنہ بنا دیتی۔" تھنر سے ناخنوں پر لگی نیل پالش صاف کرتی ماہا نے بہانہ بناتے ہوئے معذرت چاہی۔

"تم تو فارغ ہو زوہا تم بنا دو۔" اسیس نے آرام سے دونوں پاؤں صوفے پر رکھے سامنے بیٹھی زوہا کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھا۔

"میں! یعنی کہ زوہا طارق اور چائے بناؤں امپاسبل! اتنی فضول چیز کے پیچھے اپنا قیمتی وقت میں ہرگز ضائع نہیں کر سکتی۔" ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی وہ اسے اپنے وقت کے قیمتی ہونے کا احساس دلا رہی تھی۔

"کیا چائے اور فضول چیز؟" وہ تو جیسے تلملا ہی گیا۔یہ دیکھو کتنے بڑے بڑے لوگ چائے کی قدر کرتے تھے ونسٹن چرچل کو کون نہیں جانتا وہ کہتا کیا ہے چائے کے ایک کپ سے بہتر بھی کوئی چیز ہے۔

اور یہ گریٹ گرانڈ ماجیول جن کی عمر ۱۰۸ سال تھی کہتے ہیں" چائے کا ایک کپ

ہی زندگی ہے۔"

"جہاں چائے ہے وہاں امیدیں ہیں۔" یہ میں نہیں کہہ رہا سر آرتھر پیرو کا کہنا ہے۔" وہ خواتین کا ایک رسالہ ہاتھ میں پکڑے چن چن کر اس میں سے اپنے مطلب کی باتیں سنا رہا تھا۔

"ونسٹن چرچل اور آرتھر پیرو کے اقوال سے مجھے کیا لینا دینا اگر علامہ اقبال اور قائداعظم میں سے کسی نے کہا ہوتا تو میں غور بھی کرتی ان باتوں پر۔" اس کے دلائل کو بنا کسی خاطر میں لائے وہ نہایت اطمینان سے بولی۔

"کام کام اور صرف کام ...... یہ بھی تو قائداعظم نے فرمایا ہے لیکن سارا سارا دن فارغ رہتے ہوئے تو تمہیں ان کا یہ ارشاد یاد نہیں آتا۔" اس سے بحث کرنا فضول تھا لیکن پھر بھی وہ الجھ گیا۔

ابھی وہ مزید کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اطلاعی گھنٹی بج اٹھی اور زوہا "جرجس بھائی ہوں گے۔" کہتے ہوئے برق رفتاری سے دروازے کی طرف دوڑی۔ اگلے ہی پل وہ ان کا بازو تھامے اندر آ رہی تھی۔ چہرے پر زمانے بھر کی خوشی تھی ایسی جنونی محبت تھی اسے ان سے کہ چاہے روز بھی ملیں جوش وخروش میں کمی نہیں آتی تھی وہ ہر بار یوں ان سے ملتی تھی کہ نہ جانے کتنے برسوں کی جدائی کے بعد ملاقات ہوئی ہو۔

"بھائی! آپ جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر آ جائیں اتنے میں میں کھانا لاتی ہوں۔" جرجیس عبداللہ کی خدمت پر کمر بستہ مستعدی زوہا کو دیکھ کر کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہی لڑکی ہے جو ابھی چند لمحے پہلے صرف ایک کپ چائے بنانے کے لیے اتنی حجت سے کام لے رہی تھی۔

"کھانا تو میں نہیں کھاؤں گا چاند! ہاسپٹل میں دوستوں کے ساتھ ہی لنچ کر لیا تھا آج۔" چہرے پر نرم سی مسکراہٹ لیے وہ اس سے کہہ رہے تھے۔

"جب یہاں آنا تھا تو کیوں کھا کر آئے۔ میں نے خاص طور پر آج آپ کے لیے شاہی ٹکڑے بنائے تھے اور ابھی تک آپ کے انتظار میں کھانا بھی نہیں کھایا۔" وہ



چہرے پر خفگی سجائے روٹھے روٹھے لہجے میں بولی۔

"اچھا ایسا ہے کہ تم میرے لیے ایک کپ چائے بنا دو تمہاری بنائی سوئیٹ ڈش میں چائے کے ساتھ نوش کر لوں گا اور تم میرے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا لینا۔" جرجیس عبداللہ نے درمیانی راہ نکال کر اس کی خفگی دور کرنے کی کوشش کی۔

"پر ایک شرط پر آپ وہیں کچن میں ڈائننگ ٹیبل پر آ کر بیٹھ جائیں۔" اس کے نہایت آسانی سے ہامی بھر لینے پر اسیس عبداللہ نے بغور اس کی طرف دیکھا۔ دوسری طرف وہ اس کی نظروں سے قطعی انجان مکمل طور پر جرجیس عبداللہ کی طرف متوجہ تھی جواب اٹھ کر اس کے ساتھ کچن کی طرف جا رہے تھے۔

"جانے دیجئے محترم اسیس عبداللہ صاحب! یہ نظارہ اب اتنا نیا بھی نہیں جو آپ یوں حیران پریشان بیٹھے ہیں۔" اتنی دیر سے خاموشی سے نیل پالش ناخنوں پر لگاتی ماہا نے اسے ٹوکا۔

"یہ لڑکی کبھی کبھی مجھے اپنے سگے بھائی سے جیلس ہونے پر مجبور کر دیتی ہے۔" وہ جھنجھلایا۔

"کوئی فائدہ نہیں دل جلانے سے بلکہ شکر کریں کہ چائے کی کچھ امید بن گئی ہے اب یقیناً آپ کو بھی ایک کپ عنایت کر ہی دیا جائے گا۔" اس کے تاثرات کے برعکس ماہا کے انداز میں لاپروائی تھی۔

"ہونہہ! میں کوئی طفیلیہ ہوں جو دوسروں کے ذریعے فائدہ حاصل کروں۔" بائیک کی چابی اٹھائے وہ غصے میں تنتناتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا جبکہ ماہا سمجھ میں نہ آنے والے انداز میں شانے اچکا کر رہ گئی۔

☆☆☆

ددھیالی رشتے بس ایک دھندلی سی شبیہہ کی صورت زوہا کی یادداشت میں باقی تھے۔

اس کے ذہن میں جتنے واقعات زندہ تھے وہ نہایت ناخوشگوار تھے کبھی ممی پر چیختے

چلاتی دادی کی شکل ذہن کے پردے پر ابھرتی تو کبھی آنے بہانے ممی کی تذلیل کرتی تائی اماں کا خشونت بھرا چہرہ سامنے آجاتا پھپھو بھی کم نہیں تھیں جب بھی میکے کا چکر لگاتیں ماں کا دل بہو سے مزید خراب کر جاتیں ۔دادی جو یوں بھی ممی سے خوش نہ رہتی تھیں ان کے ہر چکر کے بعد مزید ناقابل برداشت ہو جاتیں لیکن حیرت تو اسے ممی کی برداشت پر ہوتی تھی جو ہر برا رویہ بہت ضبط سے برداشت کر لیتیں ۔ڈیڈی کی گھر میں آمد کے ساتھ ہی شکایتوں کا ایک پورا پنڈورا بکس ہوتا تھا جو دادی ممی کے خلاف کھول کر بیٹھ جاتی تھیں جبکہ ممی کے پاس ان تمام نفرت انگیز رویوں کا صرف ایک ہی جواب تھا۔''خاموشی''

''آخری نے ایسا کون سا قصور کیا ہے جو یہ لوگ انہیں بخشنے پر تیار نہیں ہوتے اور ممی کی کون سی کمزوری ان لوگوں کے ہاتھ لگ گئی ہے کہ ممی اس سب پر احتجاج تک نہیں کرتیں۔''گھر کے ماحول میں پائی جانے والی کشیدگی کی فضا چھ ساڑھے چھ سال کی زوہا کو سوچنے پر مجبور کر دیتی ۔

لیکن پھر اچانک ہی زندگی کا یہ تکلیف دہ دور ختم ہو گیا کاروبار میں تایا جی سے ہونے والا کوئی اختلاف اس حد تک کہ بڑھا کہ ڈیڈی نے ان سے الگ ہونے کا فیصلہ کر لیا ڈیڈی کے فیصلے پر گھر میں مخالفت کا ایک طوفان اٹھا تھا کوئی بھی ان کو سمجھنے یا ان کا ساتھ دینے کے لیے راضی نہ تھا صرف چھوٹے چچا نے دبے دبے الفاظ میں معاملے کو خوش اسلوبی سے نمٹانے کی بات کی تھی لیکن ان کی اس رائے کو بھی بڑی شدت کے ساتھ رد کر دیا گیا تھا یوں بھی آخری فیصلے کا حق دادی کے پاس تھا کیونکہ ساری جائیداد اور کاروبار ان کے نام تھا۔ دادی جو نہ جانے ڈیڈی سے کس بات پر خفا تھیں کہ اس موقع پر جانبداری سے کام لے گئیں۔

''اور پھر پتا نہیں ہمیشہ کے نرم خو مصالحت پسند ڈیڈی کس طرح اس قدر غصے میں آگئے کہ انہوں نے اسی وقت کھڑے کھڑے گھر چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ممی عجلت میں اپنی جیولری زوہا اور ماہا کی چند ضروری چیزیں ہی سمیٹ سکی تھیں پھر وہ لوگ وہاں سے کراچی نانو کے گھر شفٹ ہو گئے تھے دادی یا گھر کے کسی فرد نے ان لوگوں کو روکنے کی



کوشش نہیں کی تھی چھوٹے چچا نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا تھا شاید ان سے یہ کھلی ناانصافی برداشت نہیں ہو سکی تھی ان کے علاوہ ایک فرد اور بھی تھا جسے زوہا نے اداس دیکھا تھا۔

تائی امی کا بڑا بیٹا منیب جو گھر سے نکلنے سے پہلے اپنے لاڈلے سارق چاچو کی طرف لپکا تھا اور جس کا ہاتھ پکڑ کر تائی امی نے اسے واپس اندر گھسیٹ لیا تھا لوہے کا بڑا سا گیٹ ان لوگوں کے پیچھے بڑی زور دار آواز میں بند ہوا تھا اس آواز پر ہی زوہا نے پلٹ کر پیچھے کی طرف دیکھا تھا۔بڑا سا سیاہ گیٹ جس کے اوپر بوگن ویلیا کی بیل اپنی بہار دکھاتی تھی بڑی مضبوطی سے بند تھا یوں جیسے کبھی نہ کھلے گا۔شعور اور ادراک کی عمر میں نہ ہونے کے باوجود اس پل زوہا نے اپنے دل میں ایک کسک سی محسوس کی تھی۔

☆☆☆

''حمیرا کی بچیاں تو مجھے حمیرا سے بھی چار قدم آگے دکھائی دیتی ہیں اس نے تو پھر بھی یونیورسٹی پہنچ کر رنگ ڈھنگ دکھائے تھے یہ تو لگتا ہے اسکول لائف میں ہی ماں باپ کو بر ڈھونڈنے کی زحمت سے نجات دلا دیں گی۔''

جرجیس عبداللہ کا بازو تھامے اس سے کسی بات کی فرمائش کرتی چودہ سالہ زوہا کو اپنی اکلوتی ممانی کی نوکیلی آواز اور چبھتے الفاظ نے چند لمحوں کے لیے بالکل ساکت کر دیا تھا۔وہ ہاتھ جس سے اس نے جرجیس عبداللہ کا بازو تھاما ہوا تھا اب بے جان سا ہو کر اس کے پہلو میں لٹک رہا تھا۔

کم از کم چودہ سال کی عمر میں وہ ممانی کا طنز سمجھنے کے لائق تو تھی ہی وہ سوال جن کے جواب اسے اپنے ددھیال میں رہتے ہوئے کبھی نہیں مل سکے تھے اب وہ ان سے واقف ہوتی جا رہی تھی۔

وہی عام سی کہانی تھی ممی اور ڈیڈی کی ڈیڈی اپنی ایجوکیشن کے سلسلے میں کراچی آئے تھے اور پھر یونیورسٹی میں اپنی بے انتہا ذہین اور بولڈ کلاس فیلو حمیرا سمیع کے گرویدہ ہو گئے۔خود حمیرا جس نے ساری زندگی کو ایجوکیشن میں پڑھنے کے باوجود

کبھی کسی لڑکے کو لفٹ نہ کروائی تھی طارق حمید کے نام کی مالا جپنے لگی ان کے خاندان میں غیر برادری میں رشتے کرنے کا رواج نہیں تھا اسے یہ حقیقت بھی اس وقت بھول گئی تھی جبکہ طارق حمید کے ہاں ایسا کوئی مسئلہ نہ ہونے کے باوجود پسند کی لڑکی سے شادی کرنا سب سے بڑا مسئلہ تھا اس کو گھر چھوڑ جانے اور خودکشی کر لینے کی دھمکیوں کا سہارا لے کر گھر والوں کو راضی کرنا پڑا اور حمیرا کی صرف ایک دھمکی کہ اجازت نہ ملنے کی صورت میں وہ کورٹ میرج کر لے گی۔'' نانو کو دہلا گئی نانا تو بہت عرصہ ہوا فوت ہو گئے تھے۔اب گھر کی ساری ذمہ داری ان ہی کے ہاتھوں میں تھی اپنی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی کے مزاج سے وہ اچھی طرح واقف تھیں سو اس کی دھمکی کو صرف دھمکی سمجھ کر ٹالنے کے بجائے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے اس کی بات مان لی عزت و وقار کی دیواروں میں دراڑیں پڑ جائیں اس سے کہیں بہتر تھا کہ ایک روایت کو توڑ دیا جائے۔یوں بھی انہیں طارق حمید پسند آیا تھا اچھی شکل اچھے اخلاق اور کچھ کر دکھانے کا عزم رکھنے والا یہ شخص ان کی بیٹی کو بہت خوش رکھے گا اس کا انہیں یقین تھا۔لیکن رشتے صرف فرد واحد سے تو نہیں جڑتے۔حمیرا کو زندگی کی ہر خوشی دینے کا وعدہ طارق حمید نے کیا تھا اس کے گھر والوں نے نہیں بلکہ انہوں نے تو شاید اسے ساری زندگی ناخوش رکھنے کا عہد کر رکھا تھا۔

صرف اپنی پسند کی شادی کرنے کے جرم میں حمیرا کئی سال تک ان لوگوں کا ہر جبر خندہ پیشانی سے سہتی رہی یوں بھی گزارہ کر لینے کے سوا اس کے پاس کوئی راہ نہیں تھی اپنے میکے کے دروازے تو ایک طرح سے اس نے خود پر بند کر لیے تھے نہ وہ ان لوگوں کو اپنے دکھڑے سنانے کی پوزیشن میں تھی اور نہ ہی وہاں کوئی اس کی سننے والا تھا بڑی آپا تو خیر سے شادی شدہ بچوں والی تھیں بھائی بھابھی کا غلام بن بیٹھا تھا بھابھی بھی وہ جن کے بھائی کی وہ ٹھیکرے کی مانگ تھی ان کے بھائی کو ٹھکرا کر حمیرا نے جو کسی دوسرے شخص سے رشتہ جوڑ لیا تھا اس غم کو بھولنے کی کوشش کرنے کے باوجود وہ بھول نہ پائی تھیں اور کبھی نہ کبھی کوئی زہر بھرا جملہ ان کے لبوں سے نکل ہی جاتا تھا۔



جیسے اس وقت انہوں نے زوہا طارق کو چاروں شانے چت کر دیا تھا احساس ذلت کی وجہ سے وہ نظریں اوپر نہ اٹھا پا رہی تھی اتنے ڈھیر سارے لوگوں میں جانے کس کس نے ان الفاظ کو سنا تھا اگر وہ نظر اٹھا کر دیکھنے کی کوشش بھی کرتی تو نہ جان پاتی کیونکہ بظاہر تو وہاں سب ہی اپنے آپ میں مصروف نظر آ رہے تھے یہ پارٹی جرجیس عبداللہ کے ایف ایس سی پری میڈیکل میں اے ون گریڈ لینے پر دی گئی تھی اور اب اتنے سارے ہنستے بستے لوگوں کے درمیان زوہا طارق سر جھکائے آپنی آنکھوں میں اترتی نمی کو سب سے چھپانے کی سعی کر رہی تھی۔

کیا قصور تھا اس کا صرف یہی نا کہ وہ جرجیس عبداللہ کو اپنا بھائی سمجھتی تھی اور اس وقت بہنوں والے مان کے ساتھ ہی اس سے اس کی اتنی بڑی خوشی کی علیحدہ سے ٹریٹ مانگ رہی تھی لیکن نہیں شاید اس کا سب سے بڑا قصور تو حمیرا کی بیٹی ہونا تھا اس لیبل کے ساتھ نہ تو وہ ددھیال کے چھ سالہ قیام میں وہاں سے کسی کا پیار حاصل کر پائی اور نہ ہی ننھیال میں خالہ امی کی فیملی کے سوا کسی نے خصوصی التفات برتا تھا۔

خالہ امی وہ واحد ہستی تھی جنہوں نے حمیرا کے ناکردہ جرم کو معاف کرنے میں بالکل دیر نہیں لگائی بلکہ وہ تو حمیرا کی زبان سے سسرال میں ہونے والے ناروا سلوک کا سرسری سا ذکر سن کر ہی رو پڑی تھیں لیکن جس طرح اس نے اپنی ذات کو مٹا کر وہ دن گزارے تھے اس پر وہ کبھی کبھی داد دینے لگتیں۔خالی ہاتھ خالی جیب کراچی آنے والے بہن بہنوئی کو یہاں ایڈجسٹ کروانے میں ان کے شوہر کا بہت ہاتھ تھا۔ابتدائی چند سال مشکل اور کٹھن ہونے کے باوجود بہرحال خوش اسلوبی سے کٹ گئے طارق حمید کو عبداللہ صاحب نے ایک فرم میں اکاؤنٹینٹ کی جاب دلوادی جبکہ حمیرا نے ایک اچھی ساکھ کا پرائیوٹ اسکول جوائن کر لیا یوں انہیں میکے میں ایک ڈیڑھ مہینہ سے زیادہ کا عرصہ نہ رہنا پڑا شروع شروع میں ایک فلیٹ کرائے پر لے کر رہنے لگے پھر تھوڑی رقم جمع ہونے کے بعد ایک اچھی سی اسکیم میں اپنا ذاتی فلیٹ خرید لیا۔زندگی میں سب کچھ بہت اچھا تھا سوائے ان چند کبھی کبھار کے جملوں کے جو لڑکپن کی حدود کراس کرتی اس چھوٹی سی لڑکی

زوہا طارق کے اندر طوفان برپا کر دیتے تھے۔

☆☆☆

"تم اور ماہا تیار رہنا شام کو کہیں باہر گھومنے چلیں گے ایس کو بھی میں اپنے ساتھ لے آؤں گا۔"

زوہا نے صبح آنکھ کھلتے ہی جرجیس عبداللہ کو فون کر کے اسے وش کیا تھا آج ان کا برتھ ڈے تھا اس کی طرف سے دی جانے والی مبارک باد کو قبول کرتے ہوئے انہوں نے پروگرام بھی ترتیب دے دیا تھا۔

"لیکن بھائی! شام میں تو مجھے پڑھنا ہے۔کل میرا ٹیسٹ ہے" باوجود ان سے بے تحاشا محبت کے وہ اب ان سے کترانے لگی تھی۔

"چند گھنٹے باہر گزار لینے سے تمہارا کوئی اتنا شدید نقصان نہیں ہو جائے گا جو کچھ یاد کرنا ہے شام سے پہلے یاد کر لو اگر کچھ رہ جائے تو رات دیر تک بیٹھ کر تیاری کر لینا کمال ہے بھائی کی زندگی کا اتنا اہم دن ہے اور بہن صاحبہ کو بہانے سوجھ رہے ہیں۔" وہ اس کی کسی معذرت کو خاطر میں لانے کے لیے تیار نہیں تھے وہ اس کے کھنچے کھنچے انداز کو محسوس بھی کر رہے تھے اور وجہ بھی سمجھتے تھے۔

"میری بالکل بھی تیاری نہیں ہے میں فیل ہو جاؤں گی۔" دوسری طرف وہ دہائی دے رہی تھی۔

"تو ہو جاؤ فیل ویسے بھی ایسے نالائق اسٹوڈنٹ کو جو بالکل عین وقت پر رٹے لگا کر ٹیسٹ دے فیل ہی ہو جانا چاہیے۔" ان کے فیصلے میں ترمیم کی کوئی گنجائش نہیں تھی چنانچہ تھک ہار کر اس نے بات مان لی۔

شام کو دونوں بہنیں ان لوگوں کی آمد سے پہلے تیار تھیں ماہا کی فرمائش پر ان لوگوں نے ہل پارک کا رخ کیا تھا وہاں اس مقام پر کھڑے ہو کر جہاں سے سارے شہر کی روشنیاں دکھائی دیتی تھیں اور گھاس کے ایک قطعے پر بیٹھ کر کیک کاٹنے تک زوہا پر ایک عجیب سی بے کلی طاری رہی جرجیس سب دیکھ اور محسوس کر رہے تھے لیکن پھر بھی



نارمل طریقے سے اسے ٹریٹ کرنے کی کوشش میں تھے۔

"کیا خیال ہے پلے لینڈ چلیں' جھولا جھولو گی؟" انہوں نے اچانک پوچھا۔

"نہیں۔میرا دل نہیں چاہ رہا ویسے بھی اب میں کوئی بچی نہیں رہی۔" اس نے بڑے بیزار سے انداز میں جواب دیا۔

"جرجیس بھائی! مجھے جھولا جھولنا ہے۔" گیارہ سالہ ماہا مچل گئی۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔چلو ایس! تم بھی ماہا کے ساتھ چلے جاؤ میں یہاں زوہا کے ساتھ بیٹھا ہوں۔" انہوں نے کہا۔

"یہ مجھ سے پورے دو سال آٹھ مہینے چھوٹی ہو کر بڑی ہونے کی دعوے دار بن رہی ہے اور آپ مجھے بچوں والے کام کے لیے بھیج رہے ہیں۔" نئے نئے کالج میں آنے والے ایس کا منہ پھول گیا۔

"جھولا جھولنے کے لیے کسی مخصوص عمر کی قید نہیں انسان ہر عمر میں جھول سکتا ہے۔اگر تمہارا دل چاہے تو تم بیٹھ جانا ورنہ ماہا کو لے جاؤ۔آفٹر آل تم اس کے بڑے بھائی ہو۔" انہوں نے اسے جوش دلایا تو وہ سر ہلاتا ماہا کی انگلی تھام کر جھولوں والے حصے کی طرف بڑھ گیا جبکہ انہوں نے اپنا رخ زوہا کی طرف موڑ لیا۔

"وہ چند مہینوں میں آپ کچھ زیادہ بڑی نہیں ہو گئی ہیں؟" ان کے قدرے غصے سے بولنے پر اس نے اپنی توجہ سامنے لگے درختوں کی طرف مبذول کر دی۔

"تمہیں وائلڈ لائف پر تحقیق کے لیے یہاں نہیں لایا گیا ہے۔" اس کی توجہ کا مرکز بھانپ کر وہ جھنجلائے۔

"تو اب یہاں بیٹھ کر میں اور کیا کروں؟" وہ نہایت معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔

"وہی جو اب تک کرتی رہی ہو مجھ سے آئس کریم کی فرمائش کرو یا یہ جو بھٹے والا کھڑا ہے اس کے سارے بھٹے میری جیب خالی کروا کر خرید لو۔جو تمہارا دل چاہے وہ کرو۔"

ان کی بات پر اس نے بس ایک بار نظر اٹھا کر ان کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر دوبارہ اپنے پہلے والے مشغلے میں مصروف ہو گئی۔ لیکن اس ایک نگاہ میں جو شکوہ اور درد تھا اسے جرجیس عبداللہ نے پوری طرح محسوس کیا تھا۔

"یہ جو لوگ ہوتے ہیں نا انہیں بس باتیں بنانے سے مطلب ہوتا ہے۔ چاہے ان کی باتیں دوسرے کے دل کو زخم زخم کر دیں یہ باز نہیں آتے لیکن اگر ہمیں اس دنیا میں رہنا ہے تو ہمیں ان کی باتیں ان کے رویے برداشت کرنے کا حوصلہ اپنے اندر پیدا کرنا پڑے گا۔ ورنہ زمین تنگ پڑ جاتی ہے تم ایسے حساس لوگوں کو لیے اس کی بائیں ہاتھ پر اپنا دایاں ہاتھ رکھے وہ اسے سمجھا رہے تھے۔

وہ سر جھکائے چپ چاپ رو رہی تھی آنسو قطرہ قطرہ اس کے چہرے سے پھسل کر ان کی ہاتھ کی پشت پر گر رہے تھے۔

"زوہا میری بات سنو گڑیا! میں ہوں نہ تمہارا بھائی پھر تمہیں کیا ضرورت ہے لوگوں کی پروا کرنے کی۔ جب ہمارے تمہارے دل میں کوئی بات نہیں تو اوروں کے کہنے کا اثر لینے کی کیا ضرورت ہے۔ ویسے بھی بچوں کو زیادہ غور خوض کرنے کی عادت نہیں ہونا چاہیے دماغ پر زور پڑتا ہے۔" نہایت سنجیدگی سے سمجھاتے ہوئے آخر میں انہوں نے ہلکا پھلکا انداز اپنایا اور اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگا کر کھڑے ہو گئے۔

"چلو' جھولوں کی طرف چلتے ہیں۔" ان کی اپنی طرف ہاتھ بڑھانے پر وہ انگلیوں کی پوروں سے آنسو صاف کرتی ان کا ہاتھ تھام کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

"زوہا کو میرے اسیس کی دلہن بنا ہے حمیرا! یہ بات میں ابھی سے تمہارے کانوں میں ڈالے دے رہی ہوں۔" پشت پر زوہا کی موجودگی سے بے خبر خالہ امی ممی سے کہہ رہی تھیں۔ زوہا جو ممی سے کوئی بات کہنے آئی تھی اپنی جگہ ٹھٹک گئی۔

آج اس کا انٹر کا رزلٹ نکلا تھا خالہ امی مبارک باد دینے گھر آئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے باقاعدہ گلے میں پھولوں کا ہار ڈال کر اور منہ میٹھا کروا کر اسے مبارکباد دی نمبر



چونکہ کافی اچھے آئے تھے اس لیے زوہا بھی اڑی اڑی پھر رہی تھی جرجیس عبداللہ نے بھی صبح فون کر کے اسے مبارکباد دی تھی وہ کسی دوست کے پاس حیدر آباد گئے ہوئے تھے۔ پروگرام تو تقریباً دو تین دن کا تھا لیکن اب زوہا کے رزلٹ کا سن کر انہوں نے واپسی کا ارادہ کر لیا تھا دوپہر میں لنچ تک ان کی آمد یقینی تھی اپنی اس قدر اہمیت اور جرجیس عبداللہ کی محبت نے اس کے دل کو فخر سے بھر دیا تھا وہ خوش اور مگن سی گھر کی صفائی میں مصروف تھی ممی خود بھی اس کی کامیابی پر بہت خوش تھیں اس لیے صبح سے انہوں نے خصوصی ڈشز کی تیاری کے لیے کچن سنبھالا ہوا تھا خالہ امی بھی وہیں کچن میں ان کے قریب کھڑی تھیں اور ان کے بار بار منع کرنے کے باوجود کچھ نہ کچھ کر رہی تھیں۔

سلاد کے لیے کھیرا کاٹتے کاٹتے اچانک ہی انہوں نے اپنے دل کی بات حمیرا کے سامنے کہہ ڈالی...... زوہا کی طرح حمیرا بھی ان کی بات سن کر لمحے بھر کے لیے ٹھٹکیں اور پھر رسان سے بولیں۔

"ابھی بچے مکمل طور پر باشعور نہیں ہیں آپا! بہتر ہے کہ ان کی زندگی کا کوئی بھی فیصلہ ان کی مرضی کے بغیر نہ کیا جائے ویسے زوہا آپ کی ہی بیٹی ہے اگر مستقبل میں وہ اس رشتے پر راضی ہوئی تو مجھے بالکل بھی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"میری بیٹی مجھ سے بہت محبت کرتی ہے تم دیکھ لینا اسے کبھی بھی میری اس خواہش پر کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔" خالہ امی کے چہرے پر بڑی مان بھری مسکراہٹ تھی۔

"اور اگر اسیس اس بات کے لیے راضی نہ ہوا تو۔" ممی ان کا دھیان دوسرے فریق کی طرف لے گئیں۔

"جیسے زوہا اپنی خالہ امی سے محبت کرتی ہے ویسے ہی اسیس بھی اپنے آنٹی کا دیوانہ ہے۔ اس کے لیے تو میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اگر تم اسے گھر داماد بھی رکھنا چاہو گی تو بہ خوشی راضی ہو جائے گا۔"

خالہ امی نے ایک کھنکتا ہوا قہقہہ لگایا تھا اور اس آواز کی جلترنگ برسوں گزر جانے کے باوجود بھی زوہا کے ذہن میں بالکل تازہ تھی۔

دوپہر کو ان لوگوں نے مل کر کھانا کھایا تھا وہ پورا دن بڑا خوشگوار اور چمکیلا تھا آپس میں خوش گپیاں کرتے اور قہقہے لگاتے بہت جلد ہی شام ہو گئی تھی۔ زوہا نے اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر سب لوگوں کو پلائی۔ پھر خالہ امی اور خالو جان گھر جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے جبکہ جرجیس اسے ایسں اور ماہا کو آؤٹنگ کے لیے لے جا رہے تھے خالہ امی نے نکلنے سے پہلے زوہا کے ماتھے پر ایک پیار بھرا بوسہ دیا تھا اس آخری بوسے کا نرم گرم سا احساس اب بھی وہ اپنی پیشانی محسوس کرتی تھی۔

کس قدر قیامت کی گھڑی تھی وہ جب جرجیس نے آئسکریم پارلر میں بیٹھے ہوئے اپنے موبائل پر حمیرا کی کال وصول کی تھی وہ یکدم ہی پریشان ہو اُٹھے اور ان کی پریشانی نے ان تینوں کو بھی ہولا دیا تھا۔

پھر نہایت تیز رفتاری سے ہاسپٹل کی طرف گاڑی دوڑاتے انہوں نے ان لوگوں کو بتایا تھا کہ واپسی میں خالہ امی اور خالو جان خریداری کی غرض سے ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور پر اتر گئے تھے اچانک ہی وہاں ڈاکا پڑ گیا۔ لاکھوں کا کیش لوٹ کر لے جانے کے ساتھ ساتھ ڈاکوؤں کی چلائی بے درد گولیوں نے وہاں موجود گاہکوں کو بھی اپنا نشانہ بنا لیا تھا حمیرا کی دی گئی اطلاع کے مطابق وہ لوگ شدید زخمی حالت میں ہاسپٹل میں تھے۔

لیکن وہاں پہنچ کر ان لوگوں نے جانا کہ دراصل سب کچھ بہت پہلے ہی ختم ہو گیا تھا خالو کو سینے اور خالہ امی کے پیٹ میں لگنے والی بے درد گولیوں نے ان کی روحوں کا جسم سے رشتہ موقع پر ہی توڑ دیا تھا پولیس کی کارروائی اور ان کی جیب سے ملنے والے شناختی کارڈ کی مدد سے گھر کا ایڈریس معلوم کر کے وہاں اطلاع پہنچانے میں چند گھنٹے لگ گئے تھے۔ گھر میں اس وقت صرف ان کی برسوں پرانی ملازمہ موجود تھی جس نے فوراً ہی فون کر کے حمیرا کے گھر پر اطلاع دی تھی۔

جرجیس عبداللہ جس نے ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے دن رات بے شمار لوگوں کو موت کے منہ میں جاتے دیکھا تھا اس وقت بالکل ساکت کھڑے تھے ان کے امی ابو اتنی خاموشی سے چلے گئے تھے انہیں یقین نہیں آتا تھا کاش قدرت انہیں موقع دیتی انہیں ان



کا ہنر آزمانے کی مہلت دیتی تو وہ اپنا سارا علم اپنے ماں باپ پر خرچ کر کے ان کی زندگی بچانے کی کوشش کرتے لیکن بھلا تقدیر کے اٹل فیصلوں کو بھی کوئی ٹال سکا ہے۔

ایسں کو اپنے بازوؤں میں سمیٹتے خود ان کا ضبط بھی ٹوٹ گیا تھا اور آنسو ایک سیل رواں کی طرح بہہ نکلے تھے۔

☆☆☆

"لڑکیاں کیسے کیسے حربے استعمال کر کے لڑکوں کو اپنا گرویدہ کر لیتی ہیں۔ کبھی میری بیٹیوں کو اس چیز کا خیال نہیں آتا۔" وہ ایسں کو دودھ کا گلاس دے کر اس کے کمرے سے نکلی تو ممانی کے طنزیہ انداز نے اس کے پہلے سے مضمحل وجود کو مزید ڈھا سا دیا۔

ابھی کل ہی تو وہ لوگ خالہ امی اور خالو جان کے سوئم سے فارغ ہوئے تھے۔ تین دن تک تو ماہا اور ممی سمیت اسے خود بھی کوئی ہوش نہیں تھا۔ وہ دیوانوں کی طرح بار بار ہر کمرے میں جا کر خالہ امی کو تلاش کرنے لگتی اور پھر تھک ہار کر گھٹنوں میں سر دے کر رونے بیٹھ جاتی۔ ہر لمحہ یہی احساس ہوتا کہ وہ یہیں کہیں آس پاس موجود ہیں کچن میں کھانا بنا رہی ہیں یا اپنے کمرے میں نماز میں مصروف ہیں لیکن پھر جلد ہی خوفناک حقیقت اس کے ذہن میں جاگ اٹھتی اور اسے اپنے پہلو میں درد کی لہریں سی اٹھتی محسوس ہوتیں ہر شخص ہی اپنی جگہ سخت اَپ سیٹ تھا۔

آہوں اور سسکیوں میں ڈوبے یہ تین دن بے انتہا طویل تھے جو بہر حال گزر ہی گئے سوئم کے بعد تمام عزیز و اقارب اپنے اپنے گھر چلے گئے تھے صرف وہ لوگ اور ماموں کی فیملی خالہ امی کے گھر پہ رُکے ہوئے تھے تین دن تک گھر کا نظام کیسے چلا اور کس نے چلایا کچھ ہوش نہیں تھا لیکن چوتھے دن جب سب لوگوں کے جانے کے بعد زوہا نے گھر کی حالت دیکھی تو اسے وحشت سی ہونے لگی خالہ امی اپنا گھر ہمیشہ نہایت صاف ستھرا اور سلیقے سے سجا کر رکھتی تھیں لیکن اب تو یوں لگتا تھا کہ کوئی شے اپنے ٹھکانے پر نہ ہو۔ کشن ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے ایش ٹرے سگریٹ کے ٹوٹوں سے بھری ہوئی تھی فرنیچر

بے حد گرد آلود ہو رہا تھا صرف تین دن میں خالہ امی کے گھر کا نقشہ ہی بدل گیا تھا زوہا سے یہ سب برداشت نہ ہوا اور ماہا کو اپنے ساتھ لگا کر گھر کی صفائی میں لگ گئی جب تک ہر شے پہلے والی حالت میں واپس نہ آ گئی اسے چین نہ آیا۔

''لیکن کیا چیزوں کو واپس ان کی جگہ پر لانے سے لوگ بھی واپس آ سکتے ہیں؟''

اس کے ذہن میں ابھرتے اس خیال نے اس کی آنکھوں کو دھندلا دیا تھا اور وہ وہیں ایک صوفے پر بیٹھ کر رونے لگی تھی۔

جرجیس جو ظہر کی نماز پڑھ کر ابھی ابھی گھر میں داخل ہوئے تھے سیدھے اس کے پاس چلے آئے۔اسے اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے کر انہوں نے اسے تسلی دینے کی ایک خاموش سی کوشش کی تھی لیکن وہ تو مزید بکھر گئی۔اس کے آنسوؤں نے ان کا گریبان بھگو ڈالا تھا اور وہ بے بس سے بیٹھے تھے۔تب ہی طارق صاحب وہاں آ گئے۔

''بری بات ہے زوہا بیٹا! اس طرح کرنے سے مرنے والوں کی روح کو تکلیف ہوتی ہے رونے سے کوئی فائدہ نہیں۔رونا آپ کی خالہ امی اور خالو جان کے کام نہیں آئے گا۔انہیں آپ کے آنسوؤں کی نہیں دعاؤں کی ضرورت ہے۔آپ اللہ تعالیٰ سے ان کی مغفرت کی دُعا مانگو۔اس طرح رو رو کر نہ صرف آپ ان کی روحوں کو تکلیف پہنچا رہی ہیں بلکہ بھائی کو بھی آپ نے پریشان کر دیا ہے۔آپ کا تو فرض بنتا ہے کہ اپنے بھائی کا خیال رکھو ان کی ضرورتوں کی طرف توجہ دو۔'' ڈیڈی کے سمجھانے پر اسے خیال آیا تھا کہ ابھی کسی نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ملازمہ کھانا تیار کر چکی تھی چنانچہ وہ آنسو صاف کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی اور سب کو ڈائننگ روم میں جمع کر کے کسی نہ کسی طرح کھانے پر آمادہ کر لیا صرف اسیس تھا جس نے ایک دو لقموں سے زیادہ کچھ بھی منہ میں نہیں ڈالا تھا اور رات کے کھانے پر تو وہ موجود ہی نہیں تھا اس کے بھوکے ہونے کا احساس کر کے ہی وہ رات کو دودھ کا گلاس دینے کی غرض سے اس کے کمرے میں گئی تھی اور ہزار خوشامدوں کے بعد اسے آدھا گلاس دودھ پینے پر راضی کر پائی تھی



اپنے اس خلوص کا صلہ اسے ممانی کے نشتر کی طرح روح کو کاٹتے جملے کی صورت میں مل گیا تھا۔

ممانی اور ان کی بیٹیاں خود تو کسی کا خیال نہیں رکھتی تھیں اور دوسرے کے خلوص کو بھی انہیں شک کی نگاہ سے دیکھنے کی عادت تھی یوں بھی اوپر تلے کی تین بیٹیوں نے ان کی نیندیں اڑا رکھی تھیں بڑی تانیہ کا رشتہ تو انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کے بدلے میں اپنے بھائی کے بیٹے سے کر دیا تھا جبکہ باقی دو کے لیے نند کے بیٹوں سے امید لگائے بیٹھی تھیں لیکن نند اور اس کے دونوں بیٹوں جرجیس اور اسیس کا حمیرا اور اس کی بچیوں سے بے انتہا لگاؤ ان کے دل میں وسوسے پیدا کر دیتا تھا۔

☆☆☆

''میں نے کہہ دیا ناں کہ مجھے کسی سے نہیں ملنا' تو بس نہیں ملنا اب اگر تم نے میرے کمرے کا دروازہ ناک کرنے کی کوشش کی تو میں تمہارا سر توڑ دوں گی۔'' زوہا کا غصے سے سرخ ہوتا چہرہ ذرا دروازے کی اوٹ سے نظر آیا تھا اور پھر اس نے دھاڑ کی زور دار آواز کے ساتھ دروازہ دوبارہ سے بند کر دیا تھا اس کے لہجے کی گرج آنکھوں کی لپک اور دروازے کی دھمک تینوں ہی اتنی زوردار تھیں کہ دروازے کے سامنے کھڑی ماہا نے جہاں سینے پر ہاتھ رکھ کر اپنے دل کی دھڑکن قابو کرنے کی کوشش کی وہیں لاؤنج میں گھنٹے بھر سے اس کے انتظار میں خوار ہوتا اسیس بھی چلا گیا۔

آج زوہا کی سالگرہ تھی۔اور وہ اس کی زندگی کے اس اہم ترین دن پر اسے وش کرنے بڑے ارمانوں سے یہاں تک آیا تھا لیکن اس کے تو مزاج ہی نہیں مل رہے تھے وہ کمرے میں اندھیرا کیے دروازہ اندر سے لاک کر کے بیٹھی ہوئی تھی۔ماہا نے کئی بار دستک دی لیکن جواب ندارد تھا۔ادھر اسیس کو انتظار میں بیٹھے دیکھ کر وہ نہایت سبکی محسوس کر رہی تھی۔لہٰذا تھک ہار کر جارحانہ انداز اختیار کیا اور دروازے کو بری طرح پیٹ ڈالا۔

لیکن ادھر سے بھی ردعمل اتنی ہی شدت سے ظاہر ہوا تھا۔

''زوہا! پلیز باہر آ جاؤ۔اسیس بھائی کب سے تمہارے انتظار میں بیٹھے ہیں کوئی

برتھ ڈے پروش کرنے آئے تو اس کے ساتھ ایسا سلوک تو نہیں کرتے۔" اس کے انداز سے اندر ہی اندر خائف ہونے کے باوجود ماہا نے اسے باہر نکالنے کی ایک اور کوشش کی۔

"میں نے کوئی انوی ٹیشن کارڈ نہیں بھیجا تھا انہیں۔ اپنی مرضی سے آئے ہیں جب دل چاہے گا واپس بھی چلے جائیں گے۔" حد درجہ بے مروتی لہجے میں سموئے اس کے جملے نے نہ صرف ماہا کو شرمندہ کیا بلکہ اسیس کے چہرے پر بھی سرخی دوڑ گئی۔

"سوری اسیس بھائی!"

"پتہ نہیں آج اسے کیا ہو گیا ہے۔" شرمساری ماہا اسیس کے سامنے کھڑی اس کے رویے پر معذرت کر رہی تھی کہ ٹیلی فون کی بیل نے ان کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔

"ہیلو! کون؟ جرجیس بھائی۔ السلام علیکم۔ چلیں اچھا ہوا آپ نے فون کر لیا۔ ورنہ وہ آپ کی لاڈلی بہن تو کھکھنی بلی بنی ہوئی ہے۔ بات سننے سے پہلے پنجہ مارنے کو تیار ہے۔"

"جی جی اچھا۔ بلاتی ہوں اسے۔ آپ کے فون کا سن کر تو یقیناً مزاج پر خوشگوار اثرات مرتب ہوں گے۔" دوسری طرف موجود جرجیس کو ہولڈ کروا کر اس نے ایک بار پھر اپنے اور زوہا کے مشترکہ کمرے کا رخ کیا تھا۔

"زوہا! جرجیس بھائی کا فون ہے۔ تم سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔" اس چھوٹی سی اطلاع میں جانے کیسی تاثیر تھی کہ اگلے ہی لمحے دروازہ کھٹ سے کھل گیا۔ اب وہ بنا ادھر ادھر دیکھے ٹیلیفون اسٹینڈ کی طرف جا رہی تھی۔ اور وہیں ایک صوفے پر بیٹھے اسیس عبداللہ کا خون نقطہ ابال سے بھی زیادہ گرم ہو چکا تھا اور وہ نہایت خون آشام نظروں سے اسے گھورنے کے بعد باہر کا رخ کر چکا تھا۔

"ماہی! چلو تیار ہو جاؤ۔ جرجیس بھائی نے بلایا ہے۔ خالہ امی کے گھر چلتے ہیں۔" فون سن کر فارغ ہوئی تو اس کا لہجہ حیران کن حد تک بدل چکا تھا۔

"خالہ امی کے گھر چلتے ہیں مگر کس کے ساتھ؟" ماہا اس کی بات سن کر بھنائی۔



"اسیس کے ساتھ۔ جرجیس بھائی نے ہمیں لینے ہی تو اسے یہاں ......" بولنے کے ساتھ ہی اسے گھر میں اسیس کی غیر موجودگی کا احساس ہوا تو وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر ماہا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"جا چکے ہیں وہ یہاں سے۔ تمہارے خیال میں تمہاری طرف سے اتنی زیادہ عزت افزائی ہونے کے بعد بھی وہ یہاں رکے رہتے؟" ماہا اس کی نظروں میں موجود سوال کو بھانپ کر اب اسے آڑے ہاتھوں لے رہی تھی۔

"وہ تمہیں تو پتا ہے نا ماہی! جرجیس بھائی برتھ ڈے پر صبح صبح مجھے وش نہ کریں ایسا تو کبھی ہوتا ہی نہیں۔ لیکن آج انہوں نے مجھ سے کونٹیکٹ نہیں کیا تو مجھے غصہ آنے لگا۔ اس پر ممی بھی صبح سے غائب ہیں۔ اس لیے میرا موڈ زیادہ ہی خراب تھا۔" وہ چھوٹی بہن کے سامنے اپنے رویے کی وضاحت کر رہی تھی لیکن وہ بھی اسے اتنی آسانی سے بخشنے کو تیار نہیں تھی۔

"غصہ تمہیں جرجیس بھائی اور ممی پر آ رہا تھا اور نکالا تم نے بے چارے اسیس بھائی پر۔ یہ تو کوئی انصاف نہیں۔ کتنے خلوص سے وہ تمہیں وش کرنے آئے تھے اور تم نے انہیں کتنی بری طرح ڈس ہارٹ کیا ہے۔"

"اب جانے دو نا یار! میں بعد میں اس سے ایکسکیوز کر لوں گی۔" گلاس ٹیبل پر رکھے سرخ گلاب کے بکے سے بمشکل نظر چراتے وہ ماہا سے مخاطب تھی۔ گلابوں کی خوشبوؤں کے ساتھ کسی کے جذبوں کی جو مہک گندھی تھی وہ اس کو محسوس کرنے کے باوجود بھی ہمیشہ پہلو تہی کی کوشش کرتی تھی۔

"محبت کی اتنی بے قدری نہیں کرتے زوہا! ورنہ یہ روٹھ جاتی ہے۔" اس سے تین سال چھوٹی ہونے کے باوجود بھی ماہا اسے سمجھانے کی کوشش کرتی تھی۔

"فار گاڈ سیک ماہی! اپنا یہ فلسفہ پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھو۔ ابھی تو مجھے صرف جرجیس بھائی تک پہنچنے کی بے تابی ہے۔" زوہا کی بات سن کر ماہا ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے جرجیس عبداللہ کا نمبر ڈائل کرنے لگی تھی۔ موجودہ حالات میں وہی ان لوگوں

کو لینے یہاں آسکتے تھے۔

☆☆☆

اپنے کرب کو چھپا کر ہنسنا مشکل ہوتا ہے
دھیمی دھیمی آگ میں جلنا مشکل ہوتا ہے
یوں تو ضبط بہت ہے ہم کو لیکن کیا بتلائیں
آنکھ تک آئے آنسو پینا مشکل ہوتا ہے

آتی جاتی لہروں پر نظریں جمائے اس کی آنکھیں شدت ضبط سے شرخ ہو رہی تھیں۔ حمیرا آنٹی کے گھر سے نکل کر وہ جانے کتنی دیر شہر کی سڑکوں پر مارا مارا پھرا تھا اور جانے کس طرح اس نے گاڑی کا رخ سی ویو کی طرف موڑ لیا تھا اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ وہ تو بس رگ و پے میں دوڑتی آگ کو بجھانے کی سعی کر رہا تھا۔ زوہا کے رویے نے اس کو بے انتہا کرب میں مبتلا کر دیا تھا۔ اپنے اندر کروٹیں لیتے اس کرب اور سینے میں جلتی آگ کو قابو میں کیے بغیر وہ واپس گھر کا رخ نہیں کرنا چاہتا تھا جب ہی بار بار موبائل کی بیل اور اسکرین پر نظر آنے والے جرجیس کے نمبر سے بھی نظریں چرا رہا تھا لیکن دوسری طرف وہ بھی بڑی مستقل مزاجی سے اس کے پیچھے پڑے تھے۔

"ہم سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔" یہ میسج بھی کئی دفعہ مل چکا تھا۔ لیکن اس نے اپنی سماعتوں اور آنکھوں کو مکمل طور پر بند کر رکھا تھا۔ بلکہ اس نے چڑ کر موبائل بھی آف کر دیا تھا۔ اس وقت اسے ساری دنیا بری لگ رہی تھی۔ یہاں تک کہ اپنے بے انتہا محبت کرنے والے بھائی سے بھی حسد محسوس ہو رہا تھا۔

آج کتنے ہی مہینوں بعد تو اس کے دل نے خوش ہونے کی خواہش کی تھی۔ وجہ زوہا کی سالگرہ تھی۔ زوہا جو اسے کچھ عرصے سے بہت اچھی لگنے لگی تھی۔ اور جو اس کے زبان سے بے ساختہ ہی نکل جانے والے جملوں پر خود کو لاپروا پوز کرتے ہوئے بھی شرم سے سرخ پڑ جاتی تھی اس کی برتھ ڈے پر بے ساختہ ہی اس کا دل چاہا کہ اسے کچھ مختلف طریقے وش کرے۔ ورنہ ہمیشہ تو وہ لوگ امی ابو کے ساتھ مل کر شام کو اس کے گھر جاتے



تھے البتہ جرجیس صبح ہی اسے وش کر دیتے تھے لیکن آج اس نے خاص طور پر انہیں روک دیا تھا۔

"بھائی پلیز آج آپ اسے فون مت کیجئے گا۔ آج میں اسے سرپرائز دینا چاہتا ہوں۔" اس کے کہنے پر جرجیس عبداللہ مسکرا دیے تھے اور پھر ان لوگوں نے فون کر کے چپکے سے حمیرا آنٹی کو اپنے گھر بلا لیا تھا۔ کچن کو ان کے ذمہ لگا کر وہ لوگ سودا سلف لانے اور برتھ ڈے کے حساب سے ڈرائنگ روم کو سجانے میں مصروف ہو گئے تھے پھر شام کو جرجیس نے اپنی گاڑی کی چابی بھی اس کے حوالے کر دی تھی کہ وہ جا کر زوہا اور ماہا کو لے آئے۔

اور پھر ان کے گھر کی طرف جاتے ہوئے الوہی جذبوں میں گھرے اس نے سرخ گلابوں کا وہ خوبصورت سا بکے بھی لے لیا تھا لیکن زوہا نے اس کے خلوص کے جواب میں جو رویہ اپنایا وہ بہت زیادہ تکلیف دہ تھا۔ اپنے جذبے کی توہین اسے بے طرح سلگا رہی تھی۔

"میں نے تو سنا ہے اہل کراچی اپنے اس سمندر پر بڑا ناز کرتے ہیں لیکن آپ تو لگتا ہے آج اسے سنگسار ہی کیے جائیں گے۔"

وہ عالم دیوانگی میں چھوٹے چھوٹے پتھر سمندر کی طرف مسلسل اچھال رہا تھا کہ اپنے قریب سے ابھرتی آواز پر چونک گیا۔ وہ اس کی کلاس فیلو مبشرہ تھی جو حال ہی میں پنجاب یونیورسٹی سے مائیگریٹ ہو کر کراچی یونیورسٹی آئی تھی۔

"اوہ۔ مس مبشرہ! کیسی ہیں آپ؟" اپنے آپ پر بمشکل قابو پا کر وہ اپنے ہونٹوں پر ایک نمائشی مسکراہٹ سجانے میں کامیاب ہوا تھا۔

"میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں آپ سنائیے آج یونیورسٹی نہیں آئے۔ اور اب یہاں کھڑے سمندر سے دشمنی نکال رہے ہیں۔" اس کا انداز ہمیشہ کی طرح شوخ تھا۔ وہ جھینپ گیا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں بھلا سمندر سے کون دشمنی پال سکتا ہے۔ میں تو بس

یونہی گھر کے ہنگاموں سے گھبرا کر یہاں آنکلا تھا۔"

"اگر تم مجھ ناچیز کا تعارف بھی اپنے کلاس فیلو سے کروا دو تو کوئی حرج نہیں ہو گا۔" بلیو جینز اور وہائٹ ٹی شرٹ میں ملبوس لڑکے کی مبشرہ کے ساتھ موجودگی کا نوٹس اس نے اس کے احتجاجی جملے کے بعد ہی لیا تھا۔ جبکہ مبشرہ ہنس پڑی۔

"ہاں بھی ایس! ان سے ملو یہ مرسلین ہیں میرے فرسٹ کزن۔" اس نے فقط ایک جملے میں تعارف کا فریضہ بھگتایا۔

"نائس ٹو میٹ یو مسٹر مرسلین! اپنی تمام تر کیفیت بھول کر مرسلین سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے کہا۔

جبکہ مرسلین اپنے آپ کو فقط کزن کی حیثیت سے متعارف کروائے جانے پر مبشرہ کو خطرناک تیوروں سے گھور رہا تھا۔ اس کے انداز پر ایک بار پھر اس کی ہونٹوں پر ہنسی بکھر گئی۔

"سوری ایس! میں بتانا بھول گئی کزن کے علاوہ بھی ان صاحب کا ایک حوالہ اور ہے اور اگر میں کسی اسمارٹ لڑکے کے سامنے اس حوالے کا ذکر کرنا بھول جاؤں تو یہ صاحب بہت ناراض ہوتے ہیں۔" مبشرہ کی بات پر وہ بے ساختہ ہی مسکرا دیا تھا۔ جس حوالے کا وہ ذکر کر رہی تھی وہ بن بتائے بھی ان دونوں کے چہرے پر بکھرا ہوا تھا۔

"اگر آپ ہمیں جوائن کریں تو ہمیں بہت خوشی ہو گی مسٹر ایس۔"

مرسلین کی پیشکش پر اس نے بے سوچے سمجھے ہامی بھر لی۔

اور پھر واقعی ان دونوں کے ساتھ واک کرتے اور ریسٹورنٹ میں ڈنر کرنے کے بعد اس کا موڈ بحال ہو گیا تھا۔

☆☆☆

"اتنی دیر لگا دی ایس! کہاں رہ گئے تھے۔ حمیرا آنٹی اور طارق انکل بھی ابھی کچھ دیر پہلے ہی گئے ہیں۔" گھر میں داخل ہوتے ہیں اس کی مڈبھیڑ جبیں عبداللہ سے ہوئی...... اور انہوں نے اس سے باز پرس شروع کر دی وہ بنا ان کی کسی بات کا جواب



دیے سیدھا ڈرائنگ روم تک آیا تھا جہاں کا ماحول کسی تقریب کے اختتام کا منظر پیش کر رہا تھا۔

(اونہہ! انتظار کر رہے تھے۔ سب کچھ تو میرے بغیر سیلبریٹ کر لیا۔ اب خوامخواہ کا پیار جتایا جا رہا ہے) لوازمات سے بھری ٹرالی جس پر آدھے سے زیادہ استعمال شدہ کیک کی پلیٹ سب سے نمایاں تھی کو ایک طرف دھکیل کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے جلے دل سے سوچا۔

"آنٹی اور ماما تو بالکل بھی راضی نہیں ہو رہی تھیں تمہارے بغیر کیک کاٹنے کے لیے لیکن مجھے پتا تھا کہ تم جان بوجھ کر غائب ہوئے ہو۔ اس لیے میں نے بھی اصرار کر کے زوہا سے کٹوایا۔ ویسے یار! اتنے بڑے ہو کر بچوں کی طرح روٹھنا کچھ اچھا تو نہیں لگتا۔" اس کے اندر ابلتے غصے کو نظر انداز کیے وہ مسلسل اپنی ہی سنانے میں مصروف تھے ساتھ ہی ان کے ہاتھ ڈرائنگ روم...... کے پھیلاوے کو بھی تیزی سے سمیٹ رہے تھے۔

"زبیدہ کا بیٹا بیمار تھا۔ وہ جلدی چھٹی لے کر چلی گئی۔ آنٹی نے بہت اصرار کیا کہ زوہا اور ماما سب کچھ سمیٹ دیں گی لیکن میں نے کہا کہ نہیں جب دعوت ہماری طرف سے ہے تو میزبانی کے سارے فرائض بھی ہمیں ہی پورے کرنے چاہیں ویسے بھی آنٹی صبح سے آئی ہوئی تھیں۔ اب پھر دوبارہ ان لوگوں کو تنگ کرنا مناسب نہیں تھا طارق انکل کو صبح آفس بھی جانا ہوتا ہے۔ اگر وہ لوگ یہاں کام میں لگ جاتے تو رات زیادہ ہو جاتی پھر صبح اٹھنے میں پریشانی ہوتی انہیں۔" اب وہ ٹرالی دھکیلتے کمرے سے باہر نکل رہے تھے۔

"بھائی! صبح مجھے جلدی مت اٹھایئے گا' میں کل یونیورسٹی نہیں جاؤں گا۔"

عقب سے آتی ایس کی آواز پر انہوں نے مڑ کر دیکھا...... پیروں کو بوٹوں سے آزاد کیے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھ کر وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ ٹرالی کو وہیں چھوڑ کر وہ واپس پلٹ کر اس کی طرف آئے۔

"اس سے بدگمان مت ہو ایس! وہ بہت معصوم اور بزدل ہے۔" ان کے ہونٹوں سے ادا ہونے والے جملے نے اسے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول کر سیدھا بیٹھنے پر

مجبور کر دیا تھا۔

"کس سے بدگمان ہونے کی بات کر رہے ہیں بھائی! میں سمجھا نہیں؟" نہ سمجھنے کا دعویٰ کرنے والے لہجہ سچائی کو چھپانے سے قاصر تھا۔

"مجھے ماہی نے سب کچھ بتا دیا تھا۔ میں مانتا ہوں اس کی غلطی ہے لیکن تمہیں پتہ ہے وہ میرے معاملے میں کتنی حساس ہے۔ صبح وش نہ کرنے پر ناراض مجھ سے تھی لیکن چونکہ تمہارا سامنا پہلے ہو گیا سوزد پر تم آ گئے یقین کرو اس نے اپنی زبان سے اظہار نہیں کیا لیکن وہ بہت شرمندہ تھی۔ بالکل بھی انجوائے نہیں کیا اس نے آج اپنی برتھ ڈے کو۔ ماہی کا تو ارادہ تھا کہ آنی سے اس کی شکایت کرے گی لیکن پھر اس کی حالت دیکھ کر چپ ہو گئی۔ جو پہلے ہی اپنے کیے پر نادم ہو اسے مزید شرمندہ کرنے کا کیا فائدہ۔"

زوہا کی وکالت تو جرجیس عبداللہ کا اولین فرض تھا۔

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں بھائی! ایسی کوئی بات نہیں۔ میں کسی سے ناراض نہیں ہوں۔ ایکچوئلی مجھے میری کلاس فیلو اور اس کا کزن مل گیا تھا تو ان کی کمپنی میں انجوائے کرتے ہوئے وقت کا احساس ہی نہیں ہوا یہاں پتا نہیں آپ لوگ کیا کیا سوچ کر اپنا خون جلاتے رہے۔" وہ اب بھی کچھ تسلیم کرنے کو راضی نہیں تھا۔

جرجیس عبداللہ بے اختیار ہی ایک گہرا سانس لے کر رہ گئے۔ وہ جانتے تھے کہ اس قسم کے موڈ میں وہ ان کی کوئی بھی بات سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ اس کا یہ غصہ اب خود ہی ختم ہونا تھا۔ کم از کم ان کے سمجھانے کا اس کی کیفیت پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے کام کا سلسلہ پھر وہیں سے جوڑ دیا اس بار اسیس بھی ان کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ جلد ہی وہ دونوں فارغ ہو کر اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔

"میری چاہت کو کتنی بے دردی سے اپنے قدموں تلے روندتی ہو زوہا!" وہ اس کے تصور سے شکوہ کناں تھا۔ زوہا تنہا اس کے دل کی آرزو نہیں تھی۔ امی بھی اسے اپنی بہو بنانے کی خواہش مند تھیں۔ انہوں نے ایک دن اس سے کہا بھی تھا کہ وہ اس سلسلے میں حمیرا سے بات کریں گی۔ لیکن زندگی نے وفا نہ کی۔ آج اگر وہ زندہ ہوتیں تو وہ جان



لیتا کہ وہ زوہا کے لیے اپنا دامن حمیرا کے آگے پھیلا چکی ہیں۔ خود حمیرا کے رویے سے بہر حال کسی قسم کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ اپنے بھانجوں سے بے تحاشا محبت کے باوجود اب وہ اکثر زوہا اور ماہا کے معاملے میں احتیاط برتنے لگی تھیں۔ "پتا نہیں قدرت نے میرا اور اس کا ساتھ مقدر میں لکھا ہے کہ نہیں۔" دل اچانک ہی اس خیال سے دہل گیا تھا۔ اور وہ بے چینی سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ سارے دن کی تھکن کے باوجود بھی نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

"ٹرن ......ٹرن ......" فون کی بجتی گھنٹی نے یکدم ہی دھڑکنوں میں ارتعاش پیدا کیا۔

"ہیلو......!" اس نے ریسیور اٹھا کر کہا لیکن دوسری طرف مکمل خاموشی تھی۔ سی۔ ایل۔ آئی۔ کی اسکرین بھی کسی شناسا نمبر کو ظاہر کرنے کے بجائے ظاہر کر رہی تھی کہ یہ کال کالنگ کارڈ کے ذریعے کی جا رہی ہے۔

"ہیلو......!" وہ ایک بار پھر بولا۔ لیکن اس بار بھی صرف ہواؤں کے دوش پر سفر کرتی کسی کے ہلکے سے سانس لینے کی آواز سماعتوں تک پہنچی تھی۔ وہ اطمینان سے سیٹ اٹھا کر اپنے بیڈ پر آ بیٹھا۔

"جب فون کرنے کی زحمت کر لی ہے تو شرف کلام بھی بخش دیجئے۔" مزاج میں اچانک ہی خوشگواری در آئی تھی لیکن دوسری طرف ہنوز چپ کی حکمرانی تھی۔

"چہ چہ۔ ایسی بھی کیا انا کہ انسان ایک سوری تک نہ کہہ سکے۔ یا پھر ڈر لگ رہا ہے مجھ سے بات کرتے ہوئے۔" وہ اسے اکسا رہا تھا کہ کسی طرح زبان سے کوئی لفظ ادا ہو جائے لیکن نتیجہ امید کے بالکل برعکس نکلا اور فون کھٹ سے بند ہو گیا۔ اس نے بھی فون کو واپس کریڈل پر رکھ دیا البتہ ایک دھیمی سی مسکراہٹ نے چہرے کا احاطہ کر لیا تھا۔ بے شک اس نے زبان سے کچھ نہ کہا تھا لیکن اس کے کال کرنے سے ظاہر تھا کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہے۔

☆☆☆

"میرے خیال میں اب تمہیں شادی کر لینا چاہیے جرجیس بیٹا!"

حمیرا آنٹی نے ادھر ادھر کی باتیں کرتے اچانک ہی یہ بات کہی تھی۔ وہ لمحہ بھر کو ٹھٹھک سے گئے۔ آج بہت دنوں بعد وہ ہاسپٹل سے سیدھے ان کے گھر چلے آئے تھے اصل میں جب سے امی ابو کی ڈیتھ ہوئی تھی زوہا اور ماہا نے گھر آنا تقریباً چھوڑ دیا تھا کسی خاص موقع کے علاوہ وہ لوگ وہاں نہیں آتی تھیں۔ وہ خود بھی اپنے سوشل سیٹ اپ کو سمجھتے تھے اس لیے آنٹی کی طرف سے برتی جانے والے اس احتیاط پسندی پر شکوہ نہ کیا البتہ آج زوہا سے ملنے کا بہت ہی زیادہ دل چاہ رہا تھا سو سیدھے یہاں کا رخ کیا۔ وہ ابھی تک یونیورسٹی سے نہیں لوٹی تھی۔ وہ لنچ کو اس کی آمد تک ٹال کر آنٹی سے گپ شپ میں مصروف تھے جبکہ ماہا کالج سے آنے کے بعد اب ظہر کی نماز ادا کر رہی تھی۔

"آج آپ کو میری شادی کا خیال کیسے آ گیا۔" وہ بات کے پس منظر کو جاننا چاہ رہے تھے۔

"کیوں خیال آنے کی کیا بات ہے۔ اب تم اس لائق ہو گئے ہو کہ ایک گھر اور بیوی کی ذمہ داری نبھا سکو ویسے بھی تمہارے ہاں کسی عورت کی موجودگی کی ضرورت ہے۔ نوکر چاکر چاہے جتنے بھی اچھے اور وفادار ہوں گھر کو بہرحال ایک عورت کی ضرورت ہوتی ہے جو نہ صرف گھر کو سجائے سنوارے بلکہ زندگی میں خوشگواری کا احساس بھی پیدا کرے۔"

"پھر کیا سوچا ہے آپ نے اس سلسلے میں۔" ان کے لیکچر سے محفوظ ہوتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

"سوچنا کیا ہے۔ لڑکیاں تو گھر میں ہی موجود ہیں۔ اگر تم کہو تو بھابھی سے ثانیہ کے لیے کہتی ہوں۔" اپنے سامنے ترتیب سے رکھے میگزینز کو نئے سرے سے ترتیب دیتے اب وہ ان کی طرف دیکھنے سے گریزاں تھیں۔

"آپ اس سلسلے میں اپنی بھابھی سے بات کریں گی یا انہوں نے ہی آپ سے یہ سلسلہ شروع کروایا ہے۔" جرجیس عبداللہ کی جانچتی نگاہیں ان کے چہرے پر جمی



تھیں۔

"تو کیا حرج ہے۔ اگر انہوں نے خود بھی کہا ہے۔ وہ بڑی ہیں سوچ سکتی ہیں تمہارے بارے میں۔" وہ اپنی بھابھی کی صفائی پیش کر رہی تھیں۔

"ثانیہ کی تعلیم بہت کم ہے آنٹی! میرا مینٹل لیول اس کے ساتھ میچ نہیں کر سکے گا۔" انہوں نے اپنا اعتراض پیش کیا۔

"تو پھر رانیہ کے لیے بات کر لیتے ہیں وہ تو میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہے تمہارے پروفیشن کی لڑکی تو سوٹ کرے گی نا تمہیں۔" انہوں نے فوراً ہی ان کی سامنے دوسرا آپشن رکھا۔

"معاف کر دیں۔ اس سے شادی کرنے سے بہتر ہے آدمی خودکشی کر لے ابھی فرسٹ ایئر میں ہے ایم بی بی ایس کے اور لگتا یوں ہے کہ شہر کی سب سے بڑی لیڈی ڈاکٹر ہو۔ ویسے بھی اس کا اور میرا ایج ڈیفرنس بہت زیادہ ہے۔" ان کا دوسرا آئیڈیا بھی انہوں نے فوراً رد کر دیا۔

"تو تم خود بتا دو اپنی کوئی پسند تا کہ میری جان چھوٹے۔" انہوں نے جھنجھلا کر ہاتھ میں پکڑے میگزین کو ٹیبل پر پٹخا۔ بھاوج نے بڑا زور دے کر انہیں جرجیس سے بات کرنے کے لیے راضی کیا تھا لیکن اب لگتا تھا کہ ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکے گی اور ان کے لیے بھابھی بیگم کے انداز میں مزید سرد مہری پیدا ہو جائے گی۔

"ایک لڑکی ہے ہمارے ہاسپٹل میں لیب میں کام کرتی ہے پیرا سائٹولوجی میں ماسٹرز کر رکھا ہے اگر آپ چاہیں تو اس کی آپ سے ملاقات کروا دوں۔" کچھ جھجکتے ہوئے انہوں نے اپنا مدعا بیان کیا۔

"کیا نام ہے اس لڑکی کا؟"

"نایاب علی لیکن سب نیا کہتے ہیں۔"

کتنے عرصہ سے تمہارے ساتھ ہے؟"

"تقریباً ایک سال ہے۔" وہ تفتیشی انداز میں پوچھے گئے سوالوں کا جواب

دے رہے تھے۔

''ٹھیک ہے جب تمہیں پسند ہے تو چلے چلتے ہیں اس کے گھر۔''ان کا لہجہ کچھ روکھا سا تھا۔

''بات میری نہیں آپ کی پسند کی ہے۔اگر آپ نے اوکے کردی تو ٹھیک ہے ورنہ پھر کوئی اور لڑکی ڈھونڈ لیجیے گا۔''ان کے جملے نے ان کی تشفی کروادی۔

پھر جلد ہی نیا سے ملاقات کا بندوبست کیا گیا۔وہ سب کو بہت پسند آئی۔ متوسط طبقے کی قبول صورت سی لڑکی جو گھر کو سنوارنے کا ہنر جانتی تھی سو فوراً ہی ان کے دل میں اتر گئی چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کا فیصلہ اسے دیکھنے کے ساتھ ہی ہو گیا۔

☆☆☆

''ہیلو اسیس! خیریت یہاں کیسے بیٹھے ہو؟''ڈیپارٹمنٹ کے عقبی حصے میں وہ ایک بینچ پر بیٹھا تھا کہ مبشرہ چلی آئی۔دائیں ہاتھ میں لیکچر فائل اور بائیں بازو پر شولڈر بیگ ڈالے اب وہ بیٹھنے کے لیے جگہ کی متلاشی تھی اسیس اس کا مقصد بھانپ کر بینچ کی ایک سائیڈ پر ہو بیٹھا۔وہ بھی بے تکلفی سے دونوں چیزیں بینچ پر درمیان میں رکھتے ہوئے خود دوسری طرف پر بیٹھ گئی۔

''مجھے لگتا ہے تمہیں لوگوں سے کٹ کر الگ تھلگ بیٹھنا کچھ زیادہ ہی پسند ہے۔''اتفاق ہی تھا کہ ایسے ہر موقع پر جب وہ زوہا کے ہاتھوں کوئی چوٹ کھا کر دنیا سے بیزار بیٹھا ہوتا وہ چلی آتی۔آج صبح سے کلاسز کا سلسلہ یونہی سا چل رہا تھا۔سمیسٹر کا اختتام تھا۔اس نے سوچا تھا زوہا کے ساتھ جا کر کچھ شاپنگ کر لی جائے۔جرجیس بھائی کی شادی بالکل سر پر کھڑی تھی۔وہ نیا بھابھی کے لیے گفٹ زوہا کی پسند سے لینا چاہتا تھا یہی سوچ کر وہ سائنس فیکلٹی کی طرف چلا آیا۔زوہا اسے باہر کاریڈور میں ہی اپنے دوستوں کے گروپ کے ساتھ کھڑی نظر آگئی۔خود اس نے بھی اسیس کو دیکھ لیا لیکن آرام سے اپنے دوستوں سے باتوں میں مصروف رہی۔

''ایکسکیوزمی زوہا! مجھے تم سے کچھ کام ہے۔''اس کی لاپروائی کو نظر انداز کرتے



ہوئے وہ اس کے قریب جا کر مخاطب ہوا۔

''کیا کام ہے؟''اس نے نہایت لٹھ مار انداز میں پوچھا۔

''میں چاہ رہا تھا کہ اگر تمہاری کلاس نہ ہو رہی ہو تو ہم طارق روڈ چلتے ہیں نیا بھابھی کے لیے کوئی گفٹ لے لیں گے۔''اسے مضبوطی سے اپنی جگہ جے دیکھ کر ناچار اسیس کو وہیں سب کے درمیان کھڑے ہو کر اپنا مدعا بیان کرنا پڑا۔

''سوری! میں یونیورسٹی پڑھنے آتی ہوں'اِدھر اُدھر جانے کے لیے نہیں۔'' نہایت بے رخی سے جواب دے کر وہ دوبارہ اپنی دوست کی طرف متوجہ ہو گئی۔احساس توہین سے اسیس نے اپنی مٹھیاں اتنی زور سے بھینچیں کہ لگا رگیں پھٹ جائیں گی۔ایک جھٹکے سے مڑ کر وہ تیز قدموں سے وہاں سے دور ہٹتا چلا گیا۔اور اب اپنے ڈیپارٹمنٹ کے عقب میں بیٹھا خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ہیلو بھئی۔کہاں کھوئے ہوئے ہو۔''مبشرہ نے اپنی فائل سے ایک پیپر نکال کر اس کی آنکھو کے سامنے لہرایا۔وہ یکدم ہی چونکا اور سیدھا ہو بیٹھا۔

''اتنی خوبصورت لڑکی پاس بیٹھی ہو اور بندہ کہیں اور خیالوں میں ڈوبا بیٹھا ہو یہ تو سخت توہین کی بات ہے۔''وہ نزاکت سے بالوں کو پیچھے جھٹکتے ہوئے ایک ادا سے بولی تو بے ساختہ ہی اسیس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''سچ کہو کون ہے وہ جو تمہاری اردگرد کی دنیا بھلا دیتی ہے۔''نہایت رازدارانہ انداز میں پوچھتے ہوئے اس کے چہرے پر شوخی کا تاثر تھا۔لیکن اسیس یک دم ہی ہونٹ بھینچ گیا۔

''کیا لڑائی ہو گئی ہے اس سے؟''وہ غضب کی قیافہ شناس تھی۔اسیس کو سنبھل کر بیٹھنا پڑا۔

''مجھ پر ریسرچ کرنا چھوڑیں۔یہ بتائیں کہ آپ کی دوستوں کی فوج کہاں ہے جو آپ مجھ غریب پر مہربان ہو رہی ہیں۔''

''پہلی بات تو یہ کہ میرے دوستوں کی کوئی فوج نہیں بلکہ ایک چھوٹا سا گروپ

ہے جو آج مجھ سے بے وفائی کرتے ہوئے غائب ہو گیا ہے اور دوسری بات یہ کہ اگر تم آپ جناب کا تکلف ختم کر دو تو تمہیں بھی اس گروپ کی ممبر شپ دی جا سکتی ہے۔'' اس نے بڑی فراخدلی سے آفر کی۔

''یعنی تم اپنی فوج میں مجھے بھی سپاہی بھرتی کرنا چاہ رہی ہو۔'' اس کے شرارت سے پوچھنے پر وہ اسے مصنوعی غصے سے گھورنے لگی۔

''اچھا بابا! گھورومت۔ میں مان لیتا ہوں کہ تمہارا صرف ایک چھوٹا سا گروپ ہے جس کی رکنیت حاصل ہونے پر مجھے فخر ہے۔'' زوہا کے برتھ ڈے والے دن کی طرح آج بھی وہ اس کی سنگت میں اپنی ٹینشن فراموش کر چکا تھا۔

☆☆☆

''اسیس! ذرا فلاور شاپ سے جا کر کنگن تو لے آؤ میں اور ماما آرڈر دے کر آئے تھے اب تک تیار ہو گئے ہوں گے۔ میں جرجیس بھائی کے ساتھ نیا بھابھی کو پارلر لینے جا رہی ہوں ہم لوگ سیدھے وہاں سے میرج لان ہی پہنچیں گے۔ تم ذرا جلدی سے یہ کام کر دینا مہمانوں کی آمد پر خواتین کو کنگن پیش کیے جائیں گے۔''

آرگنزا نیٹ کے ہلکے سے کام والے پرپل سوٹ پر میچنگ جیولری پہنے وہ روانی سے اپنی بات کہتے ہوئے خود پر موجود اسیس کی وارفتہ نگاہوں سے انجان بنی کرسی کے ہتھے پر ٹکی جلدی جلدی اپنی سینڈل کا اسٹریپ لگانے میں مصروف تھی۔ اگرچہ یونیورسٹی میں پیش آنے والے واقعے کے بعد سے اسیس نے اس سے بات چیت بند کر رکھی تھی لیکن دل بہرحال ترک راہ پر راضی نہیں تھا اب بھی اس کی بات پر کوئی رسپانس نہیں دیا تھا۔ لیکن وہ بھی بے فکر تھی پتا تھا کہ بات سن لی گئی ہے اور عمل بھی ہو جائے گا۔ پوری شادی میں اسیس نے اس کے ساتھ یہی رویہ اپنایا ہوا تھا۔ وہ کوئی بات کرتی تو جواب نہ دیتا لیکن کام بہرحال ہو جاتا تھا۔ چنانچہ اب بھی مطمئن سی باہر نکل گئی۔

نیا بھابھی کو لے کر جب وہ لان میں پہنچی تو کنگنوں کے علاوہ حضرات کو پیش کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے بوکے بھی تھے۔ اس نے دل ہی دل میں اس کی حاضر



دماغی کی داد دی ورنہ وہ تو اتنی اہم بات کو فراموش ہی کر چکی تھی۔ ماموں کی فیملی نے تو ہر کام سے ہاتھ اٹھایا تھا۔ شرکت بھی بالکل وقت کے وقت کی جا رہی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر حمیرا جرجیس پر زور دیتیں تو وہ ثانیہ نہ سہی رانیہ کے لیے تو ضرور ہی راضی ہو جاتا۔ ایک طرح سے ان کی سوچ ٹھیک بھی تھی کیونکہ جرجیس واقعی حمیرا کی خواہش پر اپنی پسند کو قربان کر دیتے۔ لیکن حمیرا نے مناسب نہ سمجھا کہ زندگی کا اتنا خوبصورت اور اہم رشتہ جرجیس دل کی منظوری کے بغیر جوڑ لیں۔

نیا کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر مسکراتے جرجیس کو دیکھ کر وہ اپنے فیصلے مطمئن تھیں۔ بس بہن بہنوئی کی یاد بار بار ان کی آنکھوں کے گوشے بھگو ڈالتی تھی۔ جرجیس کو دولہا بناتے وقت تو وہ سب لوگ ہی اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پائے تھے خوشی کے یہ پل بڑے بھیگے بھیگے سے تھے۔ لیکن بہرحال یہ تو قانون قدرت ہے۔ خوشی اور غم ایک دوسرے کے تعاقب میں لگے رہتے ہیں کبھی غم حد سے سوا ہو جائے تو مالک کل اس کی شدت کو کم کرنے کے لیے خوشیوں کا مرہم عنایت کر دیتا ہے اور کبھی بے تحاشا خوشی میں بھی دل میں اٹھتی درد کی لہریں انسان کو اپنے سے باہر نہیں ہونے دیتیں۔

''السلام علیکم۔ مجھے مبشرہ کہتے ہیں۔ اسیس کی کلاس فیلو ہوں۔'' وہ استقبالیہ پر کھڑی تھی کہ ایک کامنی سی لڑکی نے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔

''نائس ٹو میٹ یو مبشرہ جی! آئیں میں آپ کو ماما کے پاس چھوڑ آؤں۔'' خوش دلی سے اس کا استقبال کرتی وہ اسے لے کر راؤنڈ ٹیبلز کی طرف بڑھی تھی۔

''تھینک یو زوہا! پلیز اسیس کو میرے بارے میں بتا دینا۔''

''ارے آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟'' زوہا کی بڑی بڑی آنکھوں میں حیرانی اتر آئی تھی۔

''بھئی۔ بات یہ ہے کہ میرے دوست مجھے انسائیکلوپیڈیا کہتے ہیں یونیورسٹی میں پڑھنے والے آدھے سے زیادہ لوگوں سے میں واقف ہوں سو تمہیں بھی جانتی ہوں۔''

''کیا واقعی؟'' زوہا کی حیرانی میں مزید اضافہ ہوا۔

"اوہ یار! اتنا حیران مت ہو میں مذاق کر رہی تھی۔

تمہیں تو میں اسیس کی کزن ہونے کی وجہ سے جانتی ہوں۔اصل میں میری اس سے بہت اچھی دوستی ہے اس لیے اس کے متعلق ہر ہر بات سے میں واقف ہوں۔"

اس کے لہجے میں عجیب سا تفاخر تھا جسے محسوس کر کے زوہا کو کچھ بے چینی سی ہوئی۔

"ماما! یہ اسیس کی کلاس فیلو ہیں مبشرہ پلیز آپ انہیں کمپنی دیں میں اسیس کو بھجواتی ہوں۔" اس نے ایک جملے میں تعارف کی رسم نبھا کر قدم واپس موڑ لیے۔

حمیرا سے ملتی مبشرہ کے چہرے پر ایک معنی خیز سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

☆☆☆

"زوہا! تمہیں مبشرہ کیسی لگی؟" کچن کے دروازے سے ٹیک لگائے کھڑے اسیس کی بات پر تیزی سے کافی پھینٹتے اس کے ہاتھ کچھ پل کے لیے ساکت ہوئے تھے

آج نیا بھابھی کی کھیر پکائی کی رسم تھی اس سلسلے میں صرف قریبی لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ خالہ امی کے نہ ہونے کا احساس مٹانے کے لیے چھوٹی سی چھوٹی رسم بھی پوری کی جا رہی تھی۔نانو مہینہ بھر سے یہاں ٹھہری ہوئی تھیں۔ان کی موجودگی میں بھابھی کی مجال نہیں تھی کہ ہل کر پانی بھی خود سے پی لیں۔سارے چاؤ چونچلے پورے کیے جا رہے تھے۔ فراغت سے بور ہوتی نیا نے حمیرا سے اپنی بوریت کا رونا رو کر سفارش کی درخواست کی تھی۔ نانو جن کا تین مہینے سے پہلے بہو کو کسی کام کو ہاتھ لگانے دینے کا ارادہ نہیں تھا بڑی مشکل سے راضی ہوئی تھیں۔بہر حال حمیرا کے بہت زیادہ زور دینے پر آج یہ سادہ سی گھریلو تقریب ارینج کی گئی تھی۔

ڈنر کے بعد سب لوگوں کو چائے کی طلب ہو رہی تھی سو زوہا کچن میں چلی آئی۔ چائے کے ساتھ ساتھ وہ جرجیس کی فرمائش پر ان کے لیے کافی بھی بنا رہی تھی۔اسیس جس کی چپ ابھی تک قائم تھی نہ جانے کب اٹھ کر اس کے پیچھے کچن تک چلا آیا کہ اسے خبر تک نہ ہوئی۔جبکہ دوسری طرف وہ ایسے دوستانہ انداز میں مخاطب تھا کہ جیسے کبھی ناراض ہی نہ ہوا ہو۔



"جواب نہیں دیا تم نے میری بات کا؟" اس نے دوبارہ پوچھا۔

"اچھی خوبصورت لڑکی ہے۔مزاج کے بارے میں تم زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہو کیونکہ بہر حال دوست تو تمہاری ہی ہے۔" اس کا رکا ہوا ہاتھ دوبارہ سے متحرک ہو گیا۔

"اور اگر میں اسے لائف پارٹنر بنانا چاہوں تو؟"

"سی......" چائے کی کیتلی کا ڈھکن اٹھاتے اس کا ہاتھ جانے کیسے گرم کیتلی پر جا لگا تھا۔

"کیا ہوا زوئی! اپنی بات ادھوری چھوڑ کر وہ بے قراری سے اس کی طرف لپکا تھا۔

"احتیاط سے کام نہیں کر سکتیں تم۔" سرخ ہوتے اس کے ہاتھ کو تھام کر وہ اس پر خفا ہو رہا تھا۔

اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر چہرے پر بہنے لگے۔

"اچھا روؤ مت میں ابھی کوئی دوا لگا دیتا ہوں۔" اس کے بہتے آنسوؤں نے فوراً ہی اس کا دل موم کر دیا تھا۔

"وہاں سب چائے کے انتظار میں بیٹھے ہیں لیکن یہاں تو لگ رہا ہے کوئی بہت ہی امپورٹنٹ میٹنگ چل رہی ہے۔"

کچن کے اندر جھانکتی رانیہ کے طنزیہ جملے پر وہ کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی تھی لیکن ہاتھ اب بھی اسیس کی گرفت میں تھا۔

"کبھی کبھی اپنے ان اعلیٰ خیالات کو اپنی ذات تک محدود رکھ لیا کرو تو کوئی حرج نہیں۔ہاتھ جل گیا ہے زوہا کا اگر ہو سکے تو خود زحمت کرو اور چائے پیالیوں میں نکال کر سب کو پیش کر دو۔" زوہا کی تکلیف کے سامنے وہ کسی کو بھی برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا۔

"سوری! یہ کام میرے بس کی بات نہیں۔جب زوہا کی تکلیف کا علاج ہو

جائے تو یہ خود ہی لے آئے گی۔" نہایت نخوت اور بے مروتی سے جواب دیتی وہ وہاں سے چلی گئی۔

"اب تو چھوڑ دو میرا ہاتھ یا لوگوں میں اشتہار لگوانا ہے۔" وہ اس پر جھنجھلا رہی تھی۔

"بے کار میں ہر بات کی ٹینشن مت لیا کرو لوگوں کی فضول باتوں پر توجہ دو گی تو زندگی حیران ہو جائے گی۔" کچن میں رکھے فریج سے کوئی ٹیوب نکالے اب وہ اس کی جلد پر کریم لگا رہا تھا۔

"یہی بے کار کی باتیں ساری زندگی انسان کے لیے الزام بنی رہتی ہیں۔" ایبس اس کی کلائی چھوڑ چکا تھا۔ وہ نہایت آزردگی سے کہتی دوبارہ چائے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"تم رہنے دو میں زبیدہ کو بلاتا ہوں وہ چائے سرو کر دے گی۔"

اس کو دوبارہ سے کام میں لگتا دیکھ کر وہ نرمی سے بولا۔ اس نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ خاموشی سے یہاں سے نکل کر کہیں تنہا جا بیٹھے۔ تھوڑی دیر پہلے کہے جانے والے ایبس کے انکشاف اور رانیہ کے طنزیہ جملے نے اس کے دماغ کو چولیں ہلا دی تھیں۔ اب سب کے درمیان جا کر دوبارہ سے بیٹھنا اور خود کو فریش ظاہر کرنا بہت مشکل تھا۔

ایبس خاموشی سے اسے باہر کی طرف جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر پہلے فریش فریش سی زوہا کی چال میں عجیب سی تھکان اتر آئی تھی۔ کس چیز نے اسے نڈھال کر دیا ہے۔ وہ سمجھ کر بھی نظر چرا گیا اور زبیدہ کو چائے لانے کا آرڈر دیتے ہوئے سب کے درمیان لاؤنج میں جا بیٹھا۔ جہاں سب اپنی اپنی باتوں اور خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ زوہا اور اس کی غیر حاضری کا تو شاید کسی کو خیال بھی نہیں آیا تھا۔ البتہ ایک کونے میں سر جوڑے باتیں کرتی ممانی ثانیہ اور رانیہ نے ضرور اس کے تنہا واپس آنے کا نوٹس لیا تھا۔

"ایبس بیٹا! یہ زوہا کہاں رہ گئی بڑی دیر ہوئی چائے بنانے گئی تھی؟" بظاہر



لہجے میں حلاوت لیے وہ معنی خیز انداز میں پوچھ رہی تھیں۔

"زوہا بی بی کا ہاتھ جل گیا وہ ادھر بڑی بی بی کے کمرے میں بیٹھی ہیں۔" ایبس کے کچھ بولنے سے قبل ہی چائے کی ٹرالی اندر لے کر آتی زبیدہ نے اطلاع فراہم کی۔

"کیا زیادہ جل گیا ہے۔" حمیرا اور جرجیس بیک وقت اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے تھے۔

"کوئی خاص نہیں جلا ویسے میں نے دوا لگا دی ہے آپ لوگ بے فکر رہیں۔" بے نیازی سے بولتے ایبس نے انہیں مطمئن کیا۔

"آپ بیٹھیں آنٹی! چائے پئیں میں ابھی اسے دیکھ کر آتا ہوں۔" جرجیس عبداللہ نے حمیرا کو شانوں سے پکڑ کر واپس جگہ پر بٹھا دیا۔

"کیا ہوا گڑیا! ہاتھ کیسے جلا لیا تم نے اپنا؟" اگلے لمحے وہ کمرے میں موجود تھے۔

زوہا بنا کوئی جواب دیے گم صم سی بیٹھی رہی۔ وہ خود ہی آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ کا معائنہ کرنے لگے۔

"زیادہ پریشانی کی بات نہیں ایک دو دن میں صحیح ہو جائے گا۔" اس کے ستے ہوئے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے تسلی دی۔ لیکن یہ کیا۔ وہاں تو آنسو پوری روانی سے بہنے لگے تھے۔

"ارے میری بہادر بہن! اتنی سی تکلیف برداشت نہیں کر پا رہی۔" اسے خود سے لگاتے ہوئے انہوں نے بچوں کی طرح بہلانے کی کوشش کی تھی لیکن بجائے چپ ہونے کے اس کے آنسوؤں میں مزید شدت آ گئی۔

"کیا ہو گیا ہے گڑیا! کیا بہت زیادہ درد ہو رہا ہے؟" اب ان کے لہجے میں پریشانی در آئی تھی جسے محسوس کر کے وہ اندر ہی اندر نادم سی ہو گئی۔ ان کی پریشانی کا ہی احساس تھا کہ اس نے فوری طور پر خود پر قابو پاتے ہوئے آنسو پونچھ ڈالے۔ ورنہ دل کی کیفیت تو اتنی دگرگوں ہو رہی تھی کہ دل چاہتا تھا ساری دنیا کو اپنے آنسوؤں میں

ڈبو ڈالے۔

"ایسا کرو تم سو جاؤ۔ تھک بھی بہت گئی ہو گی۔ میں آنٹی سے کہہ دیتا ہوں کہ آج رات تم یہیں رکو گی۔" اس کے بالوں میں محبت سے انگلیاں پھیرتے انہوں نے کہا تھا۔

"نہیں میں نہیں رکوں گی۔ مجھے گھر جانا ہے۔" اس کی آواز لرز رہی تھی۔

"تم تو آج مجھے پریشان کرنے پر تلی ہوئی ہو لڑکی! بھلا یہاں رکنے میں تمہیں کیا پریشانی ہے جو گھر کی یاد ستا رہی ہے؟" انہوں نے پیار سے ڈپٹا۔

"پلیز بھائی! آج جانے دیں۔ پھر کسی دن آجاؤں گی۔"

اس کے لہجے میں التجا سی تھی۔ وہ باوجود چاہنے کے پھر دوبارہ اصرار نہ کر سکے یوں بھی اس وقت انہیں اس کے انداز میں کچھ غیر معمولی پن محسوس ہو رہا تھا۔ معمولی سا ہاتھ جھلنے پر تو وہ یوں ہلکان ہونے والوں میں سے نہیں تھی۔ یقیناً کسی اور بات نے اس پریشان کر رکھا تھا۔ وہ ذہن میں قیاس کے گھوڑے دوڑاتے اس کی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

☆☆☆

"احتیاط سے کام نہیں کر سکتیں تم۔" خفا خفا سی ایک آواز اس کے ذہن میں گونجی تو وہ بے ارادہ ہی اپنے ہاتھ کی طرف دیکھنے لگی۔ بروقت مرہم لگا دینے کی وجہ سے چھالا تو نہیں بنا تھا لیکن جلد سرخ ہو رہی تھی وہ آہستہ آہستہ اس حصے کو اپنے دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے سہلانے لگی۔ اس کی انگلیوں نے وہاں پہلے سے موجود کسی کے پوروں کا لمس محسوس کیا۔

"تو یوں ہے اسیس عبداللہ تم بالآخر مجھ سے مایوس ہو ہی گئے۔" رات دھیرے دھیرے گزر رہی تھی لیکن وہ عالم بے خودی میں بیٹھی اس کے لمس سے مخاطب تھی۔

"ظاہری زخم پر تو مرہم لگا دیا تم نے لیکن وہ جو روح بری طرح جھلسی ہے اس کا علاج کیسے ہوگا۔" جانتی تھی کہ شکوہ کرنے کی حقدار نہیں پھر بھی شکوہ کناں تھی۔



"آخر تم کہاں تک میری بے رخی کو سہ سکتے تھے۔ تم نے تو راستہ بدلنا ہی تھا۔ پر کیا کرتی میں اپنے اوپر لگے الزام کو دھونے کے لیے خونِ جگر ہی کی ضرورت تھی۔ سو میں نے یہ قربانی دے ڈالی۔" کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر کے اس نے سونے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا لیکن پھر فوراً ہی اٹھ بیٹھی آنکھوں کو برسوں سے عادت تھی بند ہوتے ہی کسی کی تصویر اپنے اندر سجا لینے کی۔ اور اب بھی وہ اپنا معمول ترک کرنے کو تیار نہیں تھیں۔

"مجھے تو سونے کی اتنی جلدی ہی اس لیے ہوتی تھی کہ آنکھوں کے دریچے میں تمہیں سجا کر تم سے ملاقات کر سکوں۔ اب بھلا نیند کا کیا سوال۔"

ہزار خود پر پہرے بٹھانے کے باوجود یہ واحد خواہش تھی جس سے دل کبھی دستبردار ہونے کو راضی نہ ہوا تھا۔ لیکن اب تو اس کی بھی گنجائش نہیں رہی تھی۔ بھلا پرائی چیزوں کے خواب کون اپنی آنکھوں میں سجاتا ہے۔ جب تک یہ احساس رہا کہ دوسرا شخص بھی اسی راستے کا مسافر ہے جس پر وہ خود چل رہی ہے۔ وہ آنکھیں بند کیے چلتی رہی۔ لیکن اب تو بہرحال یہ معمول ترک کرنا ہی تھا اور ہزار کوشش کرنے کے باوجود رت جگے اس کا مقدر بن گئے۔ اسیس عبداللہ کی جڑیں اس کے اندر اتنی گہرائی تک اتری ہوئی ہیں کہ وہ بری طرح خود کو مجروح کر ڈالنے کے باوجود اسے اپنے اندر سے نکال پھینکنے میں کامیاب نہ ہو سکے گی یہ تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔

☆☆☆

مبشرہ کی گھر میں آمدورفت بہت زیادہ بڑھ چکی تھی۔ اکثر اسیس کے ساتھ یونیورسٹی سے واپسی میں اور کبھی اکیلی ہی وہ چلی آتی تھی۔ اور جو کسی دن نہیں بھی آتی تو اس کا فون آجاتا یا پھر اسیس اس کے گھر چلا جاتا۔ وہ دونوں گھنٹوں ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزارتے تھے اپنے پروجیکٹ کو ڈسکس کرنے سے لے کر ٹی۔ وی پروگرامز پر تبصرے کرنے تک ان کے پاس بے شمار موضوعات تھے جن پر دونوں ہی بلا تکان بولنے کی صلاحیت رکھتے تھے مبشرہ کے بارے میں تو خیر نیا اور جرجیس عبداللہ اندازہ لگا ہی چکے

تھے کہ وہ بلا کی باتونی لڑکی ہے لیکن اسیس پتہ نہیں کیسے اب اس قدر باتیں کرنے لگا تھا۔

دن بہ دن مبشرہ سے بڑھتی اس کی دوستی اور زوہا کی آنکھوں میں پھیلتی ویرانیوں نے جرجیس عبداللہ کو بے چین کر دیا تھا۔ دوسری طرف نیا بھی اپنی جگہ حیران تھی۔ جرجیس سے تو اس نے ہمیشہ یہی سنا تھا کہ اسیس زوہا کا دیوانہ ہے لیکن یہاں تو کچھ اور ہی حالات دکھائی دے رہے تھے کوئی لڑکی یونہی صرف دوستی میں تو کسی لڑکے سے اتنی فری نہیں ہوسکتی تھی۔ اتنی بے قراری تو صرف ایک خاص تعلق ہی کی بنا پر دیکھنے میں آتی تھی لیکن جہاں بقول جرجیس کہ یہ خاص تعلق جڑا ہوا تھا وہاں سے ایسی کوئی شنید نہیں ملتی تھی۔ بلکہ اچھا خاصا سرد مہر اور اجنبی سا رویہ تھا زوہا اور اسیس کے درمیان جہاں نیا محبت کی اس عجیب وغریب قسم کو سمجھنے کی کوشش میں الجھی تھی وہیں جرجیس عبداللہ کا اضطراب بھی بڑھتا جا رہا تھا۔

مبشرہ کی وارفتگی اور زوہا کا گریز دونوں ہی ان کے سامنے تھے۔ وہ اسیس سے پوچھ گچھ کرتے بھی تو آخر کس بنیاد پر۔

☆☆☆

''زوہا! میں ہاسپٹل جا رہا ہوں۔ نیا بھی میرے ساتھ ہی جا رہی ہے۔ آج اس کا چیک اپ کروانا ہے۔ بارہ بجے سے پہلے میں اسے واپس چھوڑ جاؤں گا۔ اسیس سو رہا ہے اگر ہمارے آنے سے پہلے اٹھ جائے تو پلیز اسے ناشتے کے لیے پوچھ لینا۔''

جلدی جلدی چائے کے گھونٹ حلق سے اتارتے جرجیس عبداللہ اپنے سامنے بیٹھی زوہا سے کہہ رہے تھے جبکہ نیا بھابھی بڑے سے دوپٹے کو اپنے گرد لپیٹے ان کے بائیں جانب کھڑی تھیں۔ ان کے سراپے میں واضح تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں جو ڈھیلے ڈھالے لباس کے باوجود بھی نمایاں تھیں۔

''او کے، اللہ حافظ۔ مجھ سے تو اب تم شام کو ہی مل سکو گی۔ نیا بھابھی ایک پیاری سی مسکراہٹ اس کی طرف اچھالتے ہوئے ان کے پیچھے چل پڑی تھیں۔

''جرجیس بھائی بے چارے خواہ مخواہ ہی مجھ سے بھاگتے پھر رہے ہیں۔ وہ دکھ جو



میں نے خود اپنی تقدیر میں لکھا ہے بھلا میں کیسے اس کا دکھڑا ان کے آگے رو سکتی ہوں۔''

ان کا گریز اسے مزید دکھی کر رہا تھا۔ رات جب سے اس نے ان کی نیا بھابھی کے ساتھ ہونے والی گفتگو سنی تھی اس کے دل میں ان کی محبت میں پہلے سے بھی بڑھ کر اضافہ ہوگیا تھا وہ صرف اس کی خاطر اپنے سگے بھائی سے خفا تھے۔ جبکہ اس بے چارے کا بھی اتنا قصور نہیں تھا۔

''بھائی اور بھابھی کہاں گئے ہیں۔'' اسیس بالوں کو انگلیوں کی مدد سے سنوارتا بستر سے اٹھ کر سیدھا ڈائننگ ٹیبل تک چلا آیا۔

''بھائی کی تو ڈیوٹی ہے آج مارننگ شفٹ میں اور بھابھی کو چیک اپ کروانا تھا اپنا اس لیے بھائی کے ساتھ وہ بھی چلی گئی ہیں۔ تم فریش ہو جاؤ تو میں تمہارے لیے ناشتہ بنا دیتی ہوں۔''

''نہیں تم رہنے دو ناشتہ ابھی میرا موڈ نہیں ہے۔'' اسے انکار کرتے ہوئے وہ ٹیلیفون اسٹینڈ کی طرف بڑھ گیا۔

''ہیلو۔ مبشرہ، کیسی ہو۔'' اس کی آواز بخوبی زوہا کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

''میں ابھی ابھی سو کر اٹھا ہوں، بھائی بھابھی گھر پر نہیں ہیں ایسا کرو تم جلدی سے یہاں آجاؤ۔ یونیورسٹی کی تو چھٹی ہے ہی تم آج کا دن یہاں گزارنا۔ دونوں مل کر باتیں بھی کریں گے اور کچھ کام بھی ہو جائے گا۔'' اس کا اصرار کرتا جملہ برتن سمیٹ کر باہر نکلتی زوہا کے کانوں سے ٹکرایا۔

اور سچ مچ آدھے گھنٹے کے بعد مبشرہ وہاں موجود تھی۔ اسیس بھی اس دوران فریش ہو چکا تھا۔

''اوہ! اسیس! تم تو اس سوٹ میں بالکل پرنس لگ رہے ہو۔'' مبشرہ نے زوہا کے دل کی بات کہہ ڈالی تھی۔ اسیس اپنی تعریف پر دھیرے سے مسکرایا اور پھر بولا۔

''لگ تو تم بھی کسی پرنسز سے کم نہیں رہی ہو لیکن آج میرا موڈ تمہارے ہاتھ سے تیار کیا گیا ناشتہ کرنے کو چاہ رہا ہے اب اگر کچن میں بھیجوں گا تو تمہارا اتنا اچھا سوٹ

خراب ہونے کا ڈر ہے۔"

"تمہاری فرمائش کے آگے ہزار بارہ سو کے سوٹ کی کیا اہمیت میں ابھی ناشتہ تیار کرتی ہوں۔وہ بھی اسپیشل قسم کا لاہوری ناشتہ۔" اپنے کلف لگے قیمتی کاٹن کے سوٹ کی پروا کیے بغیر وہ بے تکلفی سے کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔

"تم نے خوامخواہ انہیں زحمت دی اسیس! میں تیار کر دیتی ناشتہ اچھا لگتا ہے کیا مہمان سے اس طرح کام کروانا۔" اب تک ان کے درمیان خاموشی سے موجود زوہا اسیس پر بگڑی تھی۔

"تم بھی تو یہاں مہمان ہی ہو۔اگر تم ایک دن کے لیے یہاں آ کر یہاں کے کام سنبھال سکتی ہو تو مبشرہ کو تو بہرحال ہمیشہ کے لیے یہاں رہنا ہے۔بہتر ہے وہ ابھی سے عادی ہو جائے۔"

اسیس کے جواب نے اسے مزید کچھ کہنے کے لائق نہیں چھوڑا تھا۔

☆☆☆

"یہ ڈیڈی اس وقت گھر میں کیسے موجود ہیں!"

ڈرائنگ روم سے آتی آوازوں پر اس نے حمیرا سے پوچھا......وہ ابھی ابھی یونیورسٹی سے آئی تھی اور خلاف معمول اس وقت ڈیڈی کی گھر میں موجودگی پر حیرت زدہ تھی۔

"تم بیگ وغیرہ رکھ کر ڈرائنگ روم میں آؤ کوئی تمہارا انتظار کر رہا ہے۔" ان کا چہرہ خوشی سے کھل رہا تھا۔

"کیا ہے ماما! کون آیا ہے جو آپ اتنی خوش ہیں؟" وہ چونکی۔

"میں نہیں بتاؤں گی تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھنا بہت زبردست سرپرائز ہے۔" ممی اس کے تجسس کو مزید ہوا دے رہی تھیں۔

وہ جلدی سے بیگ اور فائل جگہ پر رکھ کر چہرے پر پانی کے دو چار چھپکے مار کر دوپٹہ سلیقے سے اوڑھ کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔لیکن وہاں موجود دونوں چہرے اس



کے لیے بالکل اجنبی تھے۔

"رک کیوں گئیں زوہا بیٹا! اندر آؤ اور پہچانو کہ یہ کون لوگ ہیں۔" ڈیڈی کی آواز میں یہ سرشاری اس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔وہ بغور ان لوگوں کا جائزہ لینے لگی۔ایک تو چوبیس پچیس سالہ ہینڈسم سا لڑکا تھا جو اس کی طرف دلچسپی سے دیکھتے ہوئے دھیرے دھیرے مسکرا رہا تھا۔جبکہ دوسرے صاحب کافی میچور اور گریس فل سے تھے جن کی کنپٹی پر موجود اکا دکا سفید بال ان کی جاذبیت میں اضافہ کر رہے تھے۔ان کی نگاہوں کا تاثر بھی بڑا نرم اور شفیق سا تھا۔زوہا کو غور کرنے پر یہ چہرہ کچھ شناسا سا محسوس ہوا۔لیکن وہ ماضی کی گرد میں دبے اس چہرے کو شناخت نہ کر سکی۔

"اتنی چھوٹی سی تو تھی یہ لاہور سے آتے وقت بھلا اسے کہاں ہم لوگ یاد ہو سکتے ہیں۔آپ نے خوامخواہ بچی کو الجھن میں ڈال دیا۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب چلے آئے۔زوہا کے ذہن میں ان کے الفاظ سے ایک جھماکا سا ہوا۔

"حاذق چاچو!" اگلے ہی پل وہ جوش سے چلاتی ان کے سینے سے جا لگی...... انہوں نے بھی پوری وارفتگی کے ساتھ اس کو پیار کیا۔

"کتنی بڑی ہو گئی ہے یہ بھابھی جان! مجھے تو ابھی تک وہی بالوں کی پونی ٹیل بنا کر فراک پہنے ادھر ادھر گھومتی زوہا ہی یاد ہے۔"

"یہ تو کچھ نہیں ہے حاذق! ماہی نے تو اس سے بھی اچھا قد کاٹھ نکالا ہے۔ دیکھو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔وہ تو زوہا سے بڑی لگتی ہے دیکھنے میں۔" ماما نے ان کی حیرت پر مسکراتے ہوئے کہا۔

"ارے ہاں وہ بھی تو تھی شرارتی بلی۔کہاں ہے ابھی تک ملی نہیں مجھ سے؟" حاذق حمید کو چھوٹی بھتیجی کا خیال آیا۔

"کالج گئی ہوئی ہے۔آج اس کا فزکس کا پریکٹیکل ہونا ہے اس لیے گھر آنے میں دیر ہو جائے گی۔" ماما نے اطلاع فراہم کی۔

"زوہا! بیٹا کیا چاچو سے ہی لگی کھڑی رہو گی۔یہ منیب بھی تو یہاں موجود ہے

کیا اس سے ملنے کا ارادہ نہیں ہے۔" ڈیڈی نے اسے ٹوکا تو وہ جھینپ کر منیب کی طرف متوجہ ہوئی۔

"سوری منیب! کیسے ہیں آپ چاچو سے ملنے کی خوشی میں مجھے آپ کا دھیان ہی نہیں رہا۔"

"کوئی بات نہیں میں سمجھ رہا ہوں آپ کی کیفیت کو خوشی میں انسان ایسا ہی ہو جاتا ہے۔" اس نے شائستگی سے کہا۔

"ڈیڈی! یہ لوگ آپ کو ملے کیسے؟" وہ بڑے تجسس سے پوچھ رہی تھی۔

"میری ہی فرم میں جاب کر رہا ہے منیب۔ اتفاق ہی ہے کہ ایک مہینے سے زیادہ وقت گزر جانے کے باوجود ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ تو آج حاذق سے لفٹ میں مڈبھیڑ ہو گئی تو مجھے پتا چلا یہ کسی کام سے کراچی آیا تھا تو منیب سے ملنے آفس چلا آیا اور قسمت کی خوبی دیکھو کہ مجھ سے ملاقات ہو گئی۔" وہ خوشی خوشی تفصیلات سنا رہے تھے۔

"تم کوئی دوسرے سیارے پر تو نہیں رہ رہے تھے بھائی جان! اگر آپ چاہتے تو ملنے آسکتے تھے۔ لیکن آپ تو ایسے روٹھے کہ پلٹ کر دوبارہ ہماری طرف دیکھا ہی نہیں۔" حاذق حمید کے لبوں سے شکوہ پھسلا۔

"کس کے لیے آتا میں وہاں' جب سگی ماں ہی کو میری پروا نہیں تھی۔" ان کی آواز میں گہرا رنج تھا۔

"اب وہ پہلی سی بات نہیں رہی بھائی جان! پچھلے دو چار سال سے اماں کے مزاج میں کافی تبدیلی آگئی ہے۔ اکثر آپ کو یاد کرتی ہیں لیکن بہر حال رتبہ تو ان کا ہی بڑا ہے اس لیے خود آپ سے رابطہ کرنے کے بجائے آپ کی منتظر ہیں۔"

حاذق ٹھیک کہہ رہا ہے طارق! ہمیں ہی اماں کے پاس جانا چاہیے۔ آخر وہ ہماری بزرگ ہیں۔ وہ ہمارے سامنے جھکیں یہ اچھا تو نہیں لگے گا۔" حمیرا نے فوراً ہی ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"تھینک یو بھابھی! آپ واقعی بہت اچھی ہیں۔ پتہ نہیں کیوں اماں نے آپ



کی قدر نہیں کی۔" وہ ان کی اعلیٰ ظرفی پر مشکور ہوئے۔

☆☆☆

"ایک بات سوچ رہی تھی میں زوہا!" گود میں تکیہ رکھے بیڈ پر بیٹھی ماہا نے کمپیوٹر پر مصروف زوہا کو مخاطب کیا۔

"کون سی بات؟" زوہا نے مانیٹر سے نظریں ہٹائے بغیر پوچھا۔

"یہی کہ یہ جو اپنے حاذق چاچو ہیں ان کی شادی ابھی تک کیوں نہیں ہوئی۔ حالانکہ اچھے خاصے ہینڈسم ہیں۔ جاب بھی بہت اچھی ہے۔ اتنے زبردست شخص کو کوئی اچھی لڑکی نہ ٹکرائے یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے۔"

"ٹکرائی تھی اچھی لڑکی! لیکن حسب معمول دادی صاحبہ راضی نہیں ہوئیں۔ پتہ نہیں کیوں انہیں بیٹوں کی پسند کبھی پسند نہیں آئی۔" زوہا کے انداز میں تلخی تھی۔

"تمہیں کیسے پتہ چلا اس بارے میں؟" ماہا سارا قصہ سننے کے لیے بے چین تھی۔

"ماما نے پوچھا تھا ان سے اس وقت میں وہیں بیٹھی تھی۔ اس لیے میں نے بھی ساری داستان سن لی۔ کوئی آفس کولیگ تھیں ان کی صبا نام تھا۔ چاچو نے دادی سے ان کے متعلق بات کی تو وہ راضی نہیں ہوئیں۔ چاچو ڈیڈی اور ماما کی زندگی سے سبق سیکھ کر بیٹھے تھے اس لیے ڈیڈی کی طرح دھمکیاں دے کر دادی کو راضی کرنے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن پھر کسی دوسری لڑکی سے شادی کے لیے بھی راضی نہیں ہوئے کافی طویل وقت گزرنے کے بعد دادی کا دل پسیجا اور انہوں نے خود صبا کے لیے رشتہ لے جانے کی آفر چاچو کو دی لیکن اس دوران ان کی شادی ہو چکی تھی۔"

"یہ ہماری دادی محترمہ پنجابی فلموں کے ولن کی طرح نہیں ہیں زوہا' جب دیکھو ہیرو ہیروئن کو جدا کرنے پر تلی رہتی ہیں۔" ماہا کا دادی پر کیا گیا تبصرہ سن کر زوہا کو بے اختیار ہی ہنسی آگئی۔

"خیریت خواتین! کس بات پر ہنسا جا رہا ہے؟" منیب دروازے پر دستک

دے کر اچانک ہی اندر آ گئے تھے۔

"کچھ نہیں منیب بھائی! ہم لوگ ایسے ہی آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ آپ آئیے نا۔" ماہا نے جلدی سے بیڈ کے قریب پڑی کرسی پیش کی تھی۔

"آپ لوگ میری وجہ سے ڈسٹرب تو نہیں ہوں گے۔ اصل میں مجھے نیند نہیں آ رہی تھی آپ کے کمرے کی لائٹ جلتی دیکھی تو یہاں چلا آیا کہ گپ شپ میں تھوڑا وقت گزر جائے گا۔"

"یعنی آپ کو بھی زوہا کی طرح راتوں کو جاگنے کی بیماری ہے آپ ایسا کیجیے اس سے دوستی کر لیں خوب گزرے گی جب مل بیٹھیں گے۔ "شب پسند" دو۔"

"مجھے راتوں کو جاگنے کی بیماری نہیں ہے لیکن اچانک ہی اگر سونے کی جگہ تبدیل ہو جائے تو نیند اڑ جاتی ہے۔" اس نے وضاحت کی۔

طارق اور حمیرا کے اصرار پر آج وہ اور حاذق یہیں رک گئے تھے۔

"آپ ہر ویک اینڈ یہیں گزارا کیجیے گا منیب بھائی! ہم سب مل کر کہیں گھومنے چلا کریں گے۔ انیس بھائی اور جرجیس بھائی کو بھی بلوا لیا کریں گے۔ سچ بڑا مزا آتا ہے ان لوگوں کے ساتھ۔" ماہا بے حد جذباتی ہو رہی تھی۔

"کیوں نہیں، ضرور چلیں گے لیکن اس ویک اینڈ کے بعد سے اس دفعہ تو ہم لوگ طارق چاچو اور چاچی کو لے کر لاہور جا رہے ہیں دادی سے ملانے کے لیے۔" منیب نے مسکراتے ہوئے اطلاع فراہم کی تھی۔

"ہائے اللہ سچ پھر تو بڑا مزا آئے گا۔ میں تو کالج سے ایک ہفتے چھٹی لے لوں گی لاہور کی تو سنا ہے بات ہی الگ ہے خوب سیریں کروں گی نں آپ کے ساتھ وہاں کی۔"

وہ پہلے سے بھی زیادہ جوش ہو کر نیا پلان بنانے لگی منیب کو اس کے بچکانہ سے انداز پر ہنسی آ گئی۔

☆☆☆



"ماں کو اس کی غلطی کی اتنی بڑی سزا تو نہیں دیتے بیٹا! طارق کو اپنے نحیف بازوؤں میں لیے اماں بلک رہی تھیں۔ برسوں بعد بیٹے کی شکل دیکھی تھی اس لیے خود پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

"مجھے معاف کر دیں اماں! سزا آپ نے اکیلے نہیں کاٹی میں بھی برسوں آپ کے لیے تڑپا ہوں۔" وفور جذبات سے ان کی آواز بھی بھرا رہی تھی۔ وہ لوگ ابھی ابھی لاہور پہنچے تھے۔ بچھڑے ماں بیٹے کے ملاپ کے اس منظر نے سب کی آنکھوں کو نم کر دیا تھا۔ حمیرا بھی طارق صاحب کے پیچھے کھڑی دوپٹے کے پلو سے آنسو صاف کر رہی تھی۔

"ادھر آؤ بیٹی! میرے پاس بیٹھو تمہاری تو میں بہت ہی زیادہ قصور وار ہوں ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔" اماں کے لہجے میں واضح شرمندگی تھی۔

"پلیز اماں! مجھے گناہ گار نہ کریں، میں تو خود آپ سے شرمندہ ہوں کہ اتنے سالوں میں طارق کو آپ کے پاس لے کر آنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔" ان کے ہاتھوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر وہ پوری سچائی سے کہہ رہی تھیں۔

"آپ کیسے کامیاب ہو سکتی تھیں بھابی جان! اس نیک کام کا کریڈٹ تو اللہ تعالیٰ نے مجھ جیسے ہینڈسم اور چہیتے بندے کو جو دینا تھا۔" شگفتگی سے کہتے ہوئے حاذق نے ماحول پر چھائی سوگواری کو دور کرنے کی کوشش کی۔

"اور اماں! یہ کیا ناانصافی ہے، آپ اپنے بیٹے بہو میں کھو کر میری اتنی پیاری بھتیجیوں سے ملنا بھول گئیں۔" حاذق نے اماں کی توجہ زوہا اور ماہا کی طرف مبذول کروائی تھی۔

"ارے میں کیسے انہیں بھول سکتی ہوں یہ تو برسوں سے میرے دل میں بس رہی ہیں آؤ میری بچیو میرے گلے لگ جاؤ۔" انہوں نے اپنی بانہیں دونوں کے لیے وا کر دی تھیں۔

☆☆☆

"ماہا ٹھیک کہہ رہی تھی تمہیں تو واقعی لگتا ہے راتوں کو جاگنے کی بیماری ہے۔"

لان میں بیٹھی زوہا کو پیچھے سے آتی منیب کی آواز نے چونکا دیا۔شب خوابی کا آرام دہ لباس پہنے وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے عین اس کی پشت پر کھڑا تھا۔

''مجھے تو خیر راتوں کو جاگنے کی بیماری ہے لیکن آپ کیوں ابھی تک جاگ رہی ہیں جبکہ یہ تو آپ کا اپنا گھر ہے'اجنبی جگہ ہونے کا شکوہ بھی آپ نہیں کر سکتے۔'' حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے اس نے بات کا رخ اس کی طرف موڑ دیا تھا۔

''ہے تو ویسے خلاف معمول بات لیکن پتا نہیں کیسے اچانک ہی میری آنکھ کھل گئی۔دوبارہ سونے کی کوشش کی لیکن نیند نہیں آئی۔ایسے ہی وقت گزاری کے لیے میں اپنے کمرے کی کھڑکی سے نیچے لان کا نظارا کرنے لگا تو نظر تم پر پڑ گئی۔میں نے سوچا اکیلے بور ہونے کے بجائے تمہارے ساتھ گپ شپ کر لی جائے۔'' وہ اطمینان سے اس کے قریب ہی بیٹھتے ہوئے بولا جبکہ زوہا کو گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ایسی جگہ جہاں کے لوگوں کے مزاج سے وہ پوری طرح واقف نہیں تھی اتنی رات گئے ایک لڑکے کے ساتھ تنہا بیٹھنا کچھ معیوب سا لگ رہا تھا۔لیکن فوراً ہی اٹھ کر بھی نہیں جا سکتی تھی کہ یہ خلاف تہذیب تھا۔بس خاموشی سے بیٹھی اپنے ناخنوں سے کھیلتی رہی۔

''میرے خیال میں یہاں تمہیں ایڈجسٹ ہونے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئے گی۔طیبہ اور مجیب تو بالکل بھی کسی کو بور نہیں ہونے دیتے۔البتہ ممی کا تھوڑا سا مسئلہ ہے اس کے لیے میں پہلے ہی تم سے ایکسکیوز کر لیتا ہوں۔کیونکہ بہرحال انسان کا اپنے والدین پر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔'' خاموشی کو توڑتے ہوئے اس نے ازخود ہی گفتگو شروع کر دی تھی۔

''آپ بیکار میں پریشان ہو رہے ہیں میں تائی جان کے مزاج کو سمجھ سکتی ہوں ہم لوگوں کے لیے تو اتنا ہی کافی ہے کہ انہوں نے ہماری یہاں آمد پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔باقی رویوں کی تھوڑی بہت اونچ نیچ تو برداشت ہو ہی جاتی ہے۔''

وہ نہایت تذبذب سے کہہ رہی تھی۔منیب خاموشی سے اس کا چہرہ تکنے لگا۔وہی مخصوص نرم وملائم سا تاثر جو ہر وقت حمیرا کے چہرے پر موجود رہتا تھا وہاں بھی چھایا ہوا



تھا۔برے رویوں کو خاموشی اور صبر سے برداشت کر لینے کا وصف یقیناً اس نے اپنی ماں ہی سے لیا تھا۔

''ایسی لڑکی کے ساتھ زندگی گزارنا کتنا سہل ہو گا۔'' اپنے ذہن میں ابھرتے خیال نے اس کی نظر کا زاویہ بدلا اور وہ کچھ مختلف انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''میرا خیال ہے اب چل کر سو جانا چاہیے۔ویسے بھی فضا میں کچھ خنکی سی محسوس ہو رہی ہے۔'' اس کی حسیات نے بہت تیزی سے کسی تبدیلی کو محسوس کیا تھا اور وہ گھبرا کر اندر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''لگتا ہے اپنے رتجگوں کی بیماری محترمہ مجھے لگا جائیں گی۔'' دل ہی دل میں سوچتا وہ اپنے آپ سے مسکرایا تھا۔

☆☆☆

''آج کل تمہاری دوست مبشرہ نہیں آ رہی یہاں خیریت تو ہے کوئی فون وغیرہ بھی نہیں آیا اس کا؟'' نیا نے کچن میں اپنے قریب ہی اسٹول پر الجھے الجھے سے بیٹھے اسیں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آج کل کچھ مصروف ہے وہ اس لیے یہاں نہیں آتی آپ کو کیا کام تھا اس سے؟'' اس کا لہجہ کچھ بیزار سا تھا۔

''نہیں بھلا مجھے اس سے کیا کام ہو گا وہ تو تمہاری ہی صبح وشام نہیں ہوتی اس کے بغیر'اس لیے پوچھ رہی تھی۔'' انہوں نے انڈوں کو کیک کے آمیزے میں ملایا تھا۔

''یہ آنی کیوں لاہور جا کر ٹک گئی ہیں'چار دن کا کہہ کر گئے تھے وہ لوگ اور آج چھٹا دن ہے ابھی تک واپس نہیں آئے۔زوہا اور ماہا کو بھی کچھ خیال نہیں ہے کہ اسٹیڈیز کا حرج ہو رہا ہے۔'' نیا بھابھی کے جملے پر کوئی ردعمل ظاہر کیے بغیر وہ الگ ہی مسئلے میں الجھا ہوا تھا نیا نے کچھ چونک کر اس کی پریشانی کو نوٹ کیا اور پھر ایک خوشگوار سی حیرت کے ساتھ بولیں۔

''اتنے عرصہ بعد اپنے دوھیال والوں سے ملے ہیں وہ لوگ ظاہر ہے اتنی

جلدی تو واپس آنے کا دل نہیں چاہ رہا ہو گا ویسے بھی حاذق چاچو اور منیب کو دیکھ کر لگتا ہے کہ بڑی اچھی گیدرنگ مل گئی ہو گی ان لوگوں کو وہاں۔"

"ہونہہ اچھی گیدرنگ! آپ تو نئی ہیں اس لیے آپ کو کیا پتا کتنے فضول لوگ ہیں وہ۔ آنٹی کی زندگی کا سکون چھین لیا تھا ان لوگوں نے یہ تو آنٹی ہی کا حوصلہ ہے کہ دوبارہ ان سے تعلق جوڑنے پر راضی ہو گئیں۔" نیا کی زبان سے ان لوگوں کے لیے تعریفی الفاظ سن کر اسے پتنگے لگ گئے تھے۔ "وقت ہمیشہ ایک سا تھوڑا ہی رہتا ہے۔ بدلتے وقت کے ساتھ لوگوں کے رویے بھی بدل جاتے ہیں اور ینگ جنریشن تو ویسے ہی بڑی روشن خیال ہے اب منیب کو ہی دیکھ لو کتنا سلجھا ہوا اور محبت کرنے والا لڑکا ہے مجھے یقین ہے زوہا اور ماہا ان لوگوں کے ساتھ بھرپور انجوائے کر رہی ہوں گی۔" نیا بھابھی نے دانستہ ان کا ذکر کیا۔

"انجوائے کرنے کے لیے ساری عمر پڑی ہے میں آج ہی آنٹی کو فون کرتا ہوں کہ خود چاہے جتنے دن رکیں چاہیں تو ماہا کو بھی روک لیں لیکن زوہا کو واپس بھجوادیں۔ آنرز کر رہی ہے وہ یونیورسٹی سے کوئی بچوں کا کھیل تو ہے نہیں۔"

دل کی بے چینی کسی نہ کسی طرح زبان پر آ ہی گئی تھی۔ نیا کا دل چاہا خوب زور سے قہقہہ لگائیں۔ اتنے دنوں سے مبشرہ کے ساتھ انوالومنٹ کا ڈھونگ رچا کر وہ ان لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا تھا اور اب خود سے اس کی ذرا سی دوری بھی برداشت نہیں ہو پا رہی تھی۔

☆☆☆

"اماں! اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔" حمیرا نے کچھ جھجکتے ہوئے انہیں مخاطب کیا۔

"کہو بیٹا! اجازت لینے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔" انہوں نے کہا۔

"اماں! میں چاہ رہی تھی کہ اب حاذق کو بھی لائن پر لگا دیں۔ آخر کب تک وہ یوں تنہا زندگی گزارتا رہے گا۔"



"وہ ہاں تو کرے، میں کھڑے کھڑے اس کی بارات لے جاؤں لیکن راضی ہی نہیں ہوتا وہ شادی کے لیے۔ غلطی میری تھی اور روگ میرے بچے کی جان کو لگ گیا۔" انہوں نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"قدرت نے آپ کو اس غلطی کی تلافی کا موقع دیا ہے اماں! آپ چاہیں تو اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔" حمیرا کی بات پر انہوں نے استفہامیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"زوہا بتا رہی تھی مجھے کہ کل ریسٹورنٹ میں ان لوگوں کی ملاقات صبا سے ہوئی تھی۔ صبا آج پاکستان میں ہی ہے۔ اس کے شوہر کا ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا ہے۔ اب وہ ایک بچے کے ساتھ اکیلی ہی ہے اور جاب کرتی ہے۔" اماں نے ہر بات بڑی توجہ سے سنی پر بچے کے بارے میں جان کر تھوڑا سا معترض ہوئیں۔

"لوگ کیا کہیں گے بہو! کہ انہیں کوئی کنواری لڑکی نہیں ملی جو ایک بیوہ اور وہ بھی ایک بیٹے کی ماں کو بیاہ کر لے آئے۔"

"لوگوں کی پروا کرنا چھوڑ دیں اماں! لوگوں کو تو ہر بات پر ہی اعتراض ہوتا ہے ہمیں تو حاذق کی خوشی کی فکر کرنی چاہیے مجھے بھی پتا ہے اور آپ کو بھی کہ اسے اب بھی ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی مل سکتی ہے لیکن اصل اہمیت تو اس کے دل کی خوشی کی ہے جب قدرت اسے موقع دے رہی ہے تو ہمیں اس کی خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ کھڑی نہیں کرنا چاہیے۔"

یہ حاذق سے بڑی آسیہ تھی جس کے مزاج کی ساری تندی قسمت کے تھپیڑوں نے نکال دی تھی۔ حمیرا کی زندگی کو اجیرن بناتے اور اماں سے صبا کے لیے انکار کہلوانے میں اس کا ہاتھ سب سے زیادہ تھا۔ وہ جو میکے میں ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتی تھی۔ اس وقت کچھ نہ کر سکی جب شادی کے آٹھ سال بعد تک بھی اولاد نہ ہونے پر اس کی ساس نے اس کے میاں کی دوسری شادی کروادی میاں جو آٹھ سال تک اس کے نام کی مالا جپتے رہے تھے اور ہر کام اس کی منشا کے مطابق انجام دیتے رہے تھے دوسری بیوی اور

اس سے ملنے والی اولاد میں ایسا کھوئے کہ آسیہ کا وجود ہی فراموش کر ڈالا۔ اب آسیہ کی گرہستی پر سوکن اور اس کے بچوں کا راج تھا اس کی حیثیت معزول ملکہ کی طرح تھی جس کے احکامات بجالانے والا کوئی نہ تھا۔ برسوں کی اس اذیت کو سہتے سہتے بالآخر آسیہ کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ جو لوگ دوسروں کی زندگی کو مشکل بناتے ہیں خدا ان کے نصیب میں بھی آسانیاں نہیں لکھتا۔

"آپ آج شام تیار رہیے گا بھابھی جان! ہم آج صہبا کے گھر چلیں گے۔ کل تو آپ کو واپس کراچی چلے جانا ہے اس لیے میرے خیال میں آج ہی اس نیک کام کو انجام دے دینا چاہیے۔" آسیہ نے فیصلہ سنایا تھا۔

"ٹھیک ہے ایسا ہی کیے لیتے ہیں۔ ویسے بھی اب میرے لیے مزید یہاں رکنا ممکن نہیں نیا کی فکر لگی ہوئی ہے اس کی ڈلیوری کے دن قریب ہیں اکیلی گھبرا رہی ہوگی۔ اس کے والدین بھی سعودی عرب گئے ہوئے ہیں گئے تو صرف عمرہ کرنے کے خیال سے تھے لیکن اب فون کر کے کہہ دیا ہے کہ حج کر کے ہی آئیں گے۔ میرے بھروسے پر نیا نے اپنی امی کو بے فکر رہنے کے لیے کہہ دیا ہے۔ اب اگر میں بروقت وہاں موجود نہیں ہوئی تو بچی کا دل برا ہوگا اور پھر زوہا اور ماہا کی پڑھائی کا حرج بھی ہو رہا ہے۔ ایس روزانہ فون کر کر کے مجھے احساس دلاتا ہے کل تو بہت ہی غصے میں تھا کہہ رہا تھا کہ اگر آپ کل تک واپس نہ آئیں تو میں خود آپ کو لینے لاہور پہنچ جاؤں گا۔" آخر میں ایس کی دھمکی کا بتاتے ہوئے حمیرا ہنس پڑیں۔

"میں سمجھتی ہوں بھابھی جان! بس آج یہ ضروری کام آپ کے ہاتھوں انجام پا جائے تو پھر آپ کو رخصت کی اجازت ہے۔" آسیہ نے کہا۔

"آسیہ! بھابھی بیگم سے بھی ساتھ چلنے کے لیے کہہ دینا وہ بڑی ہیں ان کی موجودگی بہت ضروری ہوگی اس موقع پر۔" حمیرا نے انہیں دھیان دلایا تو آسیہ اماں کی طرف دیکھ کر رہ گئیں۔

☆☆☆



"ماشاء اللہ حمیرا! تمہاری بیٹیاں بڑی سگھڑ اور باحیا ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو ان کے جیسی اولاد نصیب کرے۔" نیا بھابھی کو تکیوں کے سہارے بٹھا کر سوپ پلاتی زوہا کو ممانی کا جملہ سن کر حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا اس کے خیال میں یا تو اس کی سماعت ٹھیک طرح سے کام نہیں کر رہی تھی یا پھر ممانی ہی کے دماغ پر کوئی اثر ہو گیا تھا جو وہ ان بہنوں سے ازلی دشمنی بھلائے ان کی تعریف میں رطب اللسان تھیں۔

نیا بھابھی نے اس کی کیفیت کو بخوبی نوٹ کیا اور پھر اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ سے دبا کر جیسے ممانی کے جملے کی یقین دہانی کروائی گزری رات وہ ایک خوبصورت گول گوتھنے سے بیٹے کی ماں بنی تھیں۔ سب ہی لوگ اس خوشخبری کو سن کر نہایت مسرور تھے۔ خصوصاً زوہا تو جرجیس بھائی کا بیٹا پا کر بے انتہا خوش تھی۔

"بھابھی! یہ ممانی کو کیا ہو گیا ہے؟" ابھی کچھ دیر پہلے جاتے جاتے وہ بڑی محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر گئی تھیں چنانچہ اسے تشویش ہونے لگی تھی۔

"انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ ہر وقت دوسرے پر بہتان طرازی کرتی رہتی تھیں اللہ نے ان کا کہا ہر بول ان کے سامنے ہی لا رکھا۔ لاڈلی رانیہ بیگم نے اپنے کسی ادھیڑ عمر پروفیسر سے کورٹ میرج کر لی ہے ممانی جو دعوے کرتی تھیں کہ خاندان سے باہر لڑکی نہیں دیں گی۔ سر پیٹتی رہ گئیں۔" جرجیس کے جواب نے اسے حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔

"اللہ کسی کے کردار پر کیچڑ اچھالنے اور دل آزاری کرنے کی سزائیں بھی دے ڈالتا ہے۔ حمیرا کی پسند کی شادی کو کتنا بڑا ایشو بنایا تھا انہوں نے بلکہ ابھی تک ساس کو طعنے دیتی تھیں بیٹی کی من مانی میں اس کا ساتھ دینے پر لیکن آج ثابت ہو گیا تھا کہ اگر جوانی کے منہ زور ریلے کو تدبر سے قابو کرنے کے بجائے زبردستی سے کام لیا جائے تو یہ اپنے ساتھ خاندانی نجابت اور عزت کی دستار بھی بہا کر لے جاتا ہے۔"

"یہ ایس کہاں رہ گیا‘ دوپہر میں اماں کو گھر چھوڑنے گیا تھا واپس پلٹ کر نہیں آیا۔ میرا ارادہ تھا اس کے ساتھ تھوڑی دیر کے لیے گھر جانے کا۔ ذرا فریش ہو کر واپس

یہاں آؤں گی۔" بڑی دیر سے خاموش بیٹھی حمیرا نے ماحول پر چھائی خاموشی کو توڑا تھا ورنہ جرجیس کے کیے گئے انکشاف پر تو وہ لوگ کوئی تبصرہ کرنے کے قابل بھی نہیں رہے تھے۔ ممانی چاہے جیسی بھی تھیں رانیہ خاندان کی لڑکی تھی جس کے غلط اقدام نے سب ہی کو افسوس میں مبتلا کر دیا تھا۔

"میں لے چلتا ہوں آپ کو انٹی! اسیس تو مشکل ہی ہے کہ اب واپس یہاں آئے اصل میں میں نے اسے عقیقہ کے انتظامات کرنے کی ذمہ داری سونپی تھی یقیناً اسی میں مصروف ہوگا۔ میرا ارادہ ہے کہ سات دن کے اندر ہی اس فرض کو انجام دے لیا جائے ورنہ بعد میں تو اس کی کوئی شرعی حیثیت نہیں رہ جاتی۔ صرف ایک فارملیٹی ہی ہوتی ہے جسے سب نبھاتے ہیں۔" جرجیس نے اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے اسیس کے بارے میں بتایا تھا۔

"چلو ٹھیک ہے پھر تمہارے ساتھ ہی چلتی ہوں۔ میری غیر موجودگی میں یہ دونوں بہنیں یہاں رکی رہیں گی۔ بعد میں جب طارق مجھے چھوڑنے آئیں گے تو انہیں لے جائیں گے۔" حمیرا اپنا پرس سنبھالتے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

☆☆☆

"ہیلو چاچو! السلام علیکم۔ کیا حال ہے؟"

"جی جی میں بالکل خیریت سے ہوں سب گھر والے بھی ٹھیک ٹھاک ہیں۔ منیب بھی اکثر شام کو آجاتا ہے ہم لوگوں سے ملنے بہت انجوائے کرتے ہیں ہم لوگ اس کے ساتھ۔"

کارڈلیس ہاتھ میں پکڑے حاذق سے بات کرتی زوہا کے منہ سے منیب کا ذکر سن کر اسیس نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی یہاں آیا تھا۔ ماما کچن میں اس کے لیے چائے بنا رہی تھی جبکہ حمیرا آنٹی نماز میں مصروف تھیں۔ فون کی بیل پر زوہا نے کال ریسیو کی تھی اور دوسری طرف سے حاذق کی آواز سن کر بڑے جوش وخروش سے بات کر رہی تھی۔



"لاہور تو ابھی آنا ممکن نہیں پہلے ہی بہت چھٹیاں ہو چکی ہیں۔ سمسٹر مکمل ہو جائے تو پھر آؤں گی بلکہ ایسا ہے کہ می بتا رہی تھیں کہ صبا جی اور ان کے گھر والے دادی اور پھوپھو کی خوب جوتیاں گھسانے کے بعد اب راضی ہوگئی ہیں تو ایسا کیجئے آپ شادی کی ڈیٹ فکس کرا لیجئے ہم لوگ پھر بہت سارے دنوں کے لیے وہاں آئیں گے۔ منیب نے بھی آپ کی شادی کے لیے خوب ڈھیر سارے پلانز بنا رکھے ہیں۔ میں وہاں آؤں گی تو آپ کو بتاؤں گی۔"

"کیا منیب کے ذکر کے بغیر اس کی بات مکمل نہیں ہو سکتی۔" اسیس نے ہاتھ میں پکڑا میگزین غصے سے ٹیبل پر پٹخا...... زوہا نے اس کے اندر پر چونک کر ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور پھر دوبارہ فون پر مصروف ہوگئی۔

"ایسا کیجئے گا چاچو! شادی کے لیے چودہ فروری کی ڈیٹ رکھ لیجئے گا۔ اچھا ہے نا' ویلنٹائن ڈے پر دو محبت کرنے والے مل جائیں گے۔" تھوڑے سے دنوں میں چاچو سے اس کی کافی بے تکلفی ہوگئی تھی۔

"ماہی! میں جا رہا ہوں' کوئی بور ہونے کے لیے نہیں آیا تھا میں یہاں۔" بالآخر چڑ کر اس نے ماما کو آواز دے ڈالی۔

"بس بس ناراض نہ ہوں لیجئے میں آگئی۔" ماما ہاتھ میں ٹرے لیے باہر ہی سے بولتی اندر داخل ہوئی تھی لیکن جیسے ہی پتا چلا کہ حاذق چاچو کا فون ہے زوہا کے ہاتھ سے سیٹ چھین لیا۔

زوہا کیونکہ کافی دیر بات کر چکی تھی۔ اس لیے شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے بات کرتا چھوڑ کر اسیس کے لیے کپ میں چائے انڈیلنے لگی۔

"زوہا! میرے ایک دوست کی شادی ہے تم چلنا میرے ساتھ ورنہ اکیلے تو میں بور ہو جاؤں گا۔"

"لیکن میں کیا کروں گی وہاں جا کر۔ میری کون سی آپ کے دوستوں سے جان پہچان ہے۔ آپ مبشرہ کو لے جایئے گا اپنے ساتھ وہ بھی انجوائے کرے گی اور آپ

بھی بور نہیں ہوں گے۔'' مبشرہ کو لے جانے کا مشورہ دیتے ہوئے اس کا اندازہ کچھ روکھا سا ہو گیا تھا۔

''مجبوری ہے۔اس دن مبشرہ کی اپنی فیملی میں شادی ہے اس لیے وہ میرا ساتھ نہیں دے سکے گی۔'' بڑی دیر سے تپتے اسیس کے دل پر اس کے انداز سے ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار پڑی تھی۔

''تو میں بھی کوئی ایسی فالتو نہیں ہوں جو آپ کے ساتھ چل پڑوں۔مجھے بھی بہت سارے کام ہوتے ہیں۔'' اسے کچھ اور غصہ آ گیا تھا۔

''دیکھیں آنٹی! یہ زوہا کتنی بے مروت ہے۔اتنی دیر سے خوشامد کر رہا ہوں کہ میرے ساتھ میرے دوست کی شادی میں چلے لیکن راضی ہی نہیں ہو رہی۔فیملی کے ساتھ انوائٹ کیا ہے اس نے۔اب نیا بھابھی کی تو مجبوری ہے اس لیے میں ان سے کہہ نہیں سکتا اور اکیلے جانا مجھے اچھا نہیں لگ رہا سب ہی لوگ اپنے ساتھ کسی نہ کسی کو لے کر آئیں گے۔ایک بے چارا میں اکیلا جاؤں گا تو کتنا برا محسوس ہوگا۔'' وہ بڑے دکھ بھرے انداز میں اپنی مظلومیت کا رونا رو رہا تھا۔

''تو تم ایسا کرو ماہی کو لے جاؤ اپنے ساتھ ویسے شادی ہے کس دن؟'' آنٹی نے تجویز پیش کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

''تھرٹی فرسٹ دسمبر کو۔'' اسیس نے مرے مرے انداز میں جواب دیا۔

''نہیں اسیس بھائی! میں تو بالکل نہیں جا سکتی فرسٹ جنوری سے تو میرے ایگزامز شروع ہونے والے ہیں۔'' ماہا نے صاف ہری جھنڈی دکھائی۔

''تو پھر ٹھیک ہے فیصلہ ہو گیا۔زوہا جائے گی تمہارے ساتھ فنکشن میں۔تم اسے ٹائم بتا دینا یہ تیار رہے گی۔''

حمیرا کے اٹل انداز میں فیصلہ سنانے پر زوہا جز بز ہونے کے باوجود احتجاج کی ہمت نہ کر سکی۔

☆☆☆



''اپنا موڈ تو ٹھیک کر لو صاف لگ رہا ہے زبردستی لے جا رہا ہوں۔'' رائل بلیو کلر کے سلور کامدانی والے سوٹ میں نظر لگ جانے کی حد تک پیاری لگ رہی تھی۔

''تو حقیقت بھی یہی ہے۔کوئی میں اپنی خوشی سے تو آپ کے ساتھ جا نہیں رہی۔''

وہ دو بدو جواب دے کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔

اسیس نے اس کے انداز پر مسکراتے ہوئے اپنی توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز کر لی۔

میرج ہال میں رنگ و نور کا ایک طوفان تھا جس نے ان کا استقبال کیا تھا۔مکس گیدرنگ کی وجہ سے رونق کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھیں۔اسیس اسے اپنے ساتھ ساتھ لیے کئی لوگوں سے ملوا رہا تھا۔ہر ملنے والا اس سے اتنے تپاک سے مل رہا تھا کہ زوہا کو محسوس ہوا وہ ان لوگوں کے لیے اجنبی نہیں۔

''چلو چل کر دولہا دولہن کو وش کرتے ہیں۔''

اب وہ اسے لیے ہوئے اسٹیج کی طرف بڑھ رہا تھا۔اسٹیج پر چڑھتے ہوئے یکدم زوہا کے قدم ایک لمحے کو ڈگمگا سے گئے۔اسیس نے فوراً ہی اس کا بازو تھام کر اسے سہارا دیا جبکہ اسٹیج پر دولہن کے روپ میں بیٹھی مبشرہ اس کی طرف خیر مقدمی انداز میں دیکھتے ہوئے مسکرائی۔

''آپ تو کہہ رہے تھے کسی دوست کی شادی ہے لیکن یہ تو مبشرہ ہے۔''

وہ بجائے دولہا دلہن سے ملنے کے وہیں کھڑے کھڑے اسیس سے الجھنے لگی۔

''تو کوئی غلط تو نہیں کہا تھا۔مبشرہ میری دوست ہی ہے تم اب تک کچھ اور سمجھتی رہی ہو تو یہ تمہارا اپنا قصور ہے۔''

وہ بڑے مزے سے اس کے تاثرات سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

''بہت ہو چکا اسیس فاؤل گیم اب تمہیں زوہا سے سوری کر لینی چاہیے مجھے تو یہ یقیناً اس روپ میں دیکھ کر معاف کر چکی ہوگی۔''

اپنے دلہن ہونے کی پروا کیے بغیر مبشرہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور

بڑے خلوص سے زوہا کا ہاتھ تھامے اسیس سے مخاطب تھی۔

"لیکن آپ اسیس کو آسانی سے مت بخشئے گا زوہا! مجھے معلوم ہے میری آفت کی پرکالہ بیگم کے ساتھ مل کر انہوں نے آپ کا کتنا خون جلایا ہے۔"

"ارے بھئی! میں حقیقت سے باخبر ہونے کے باوجود بار بار جیلس ہونے لگتا تھا تو آپ کا کیا حال ہوا ہوگا میں اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔"

یہ مرسلین تھا جو اسے مشوروں سے نواز رہا تھا۔

"پلیز اسیس! مجھے ابھی اسی وقت گھر جانا ہے میں گاڑی میں ہوں آپ آجائیں۔"

وہ تیزی سے پلٹ کر اسٹیج کی سیڑھیاں اتر گئی تھی۔ اسیس بھی فوراً ہی اس کے پیچھے لپکا تھا۔ اسے اپنے عقب میں مبشرہ اور مرسلین کا خوشگوار قہقہہ سنائی دیا تھا۔

☆☆☆

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آخر یہ سب کیا تھا۔" وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھامے بیٹھی تھی۔

"یہ تمہارے رویوں کا ردعمل تھا۔ کتنی بے دردی سے تم میرے خلوص کی دھجیاں اڑاتی تھیں بس مجھے بھی غصہ آگیا۔"

"میں تو صرف خود کو کسی الزام کی زد میں آنے سے بچانے کے لیے ایسا کرتی تھی۔ بچپن سے ممی کی لومیرج کے طعنے سن سن کر میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر کسی سے محبت کروں گی مگر اس سے شادی ہرگز نہیں کروں گی لیکن آپ بار بار میری راہ میں آجاتے تھے۔ مجبوراً میں آپ کی ساتھ برا سلوک کر جاتی تھی ورنہ یہ تو میرا دل ہی جانتا ہے کہ ایسے ہر واقعے کے بعد خود مجھے کتنی تکلیف ہوتی تھی اور پچھلے پورے ایک سال سے آپ نے مجھے کتنی تکلیف میں مبتلا کر رکھا ہے یہ تو صرف مجھے ہی معلوم ہے۔"

وہ نہ جانے کس کیفیت میں گھری سر جھکائے روانی سے اعتراف کیے جارہی تھی۔ اسیس نے گاڑی ذرا آگے لے جا کر روک دی۔



"اگر تم اتنے خوبصورت جذبوں کو مجھ سے چھپا چھپا کر نہ رکھتیں تو مجھے اتنا طویل ڈرامہ کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی وہ تو بھلا ہو مبشرہ کا کہ اس نے تم سے اندر کی بات اگلوانے کے لیے نہ صرف اتنا زبردست آئیڈیا دیا بلکہ اپنے منگیتر کی اجازت سے میری بھرپور مدد بھی کی حالانکہ وہ تمہارے چہیتے بھائی صاحب اس کو دیکھ کر ہی ناک بھوں چڑھانے لگتے تھے۔ بلکہ وہ تو مجھے بھی اتنی خونخوار نظروں سے دیکھتے تھے کہ لگتا تھا نظروں ہی نظروں میں مار ڈالیں گے اور تو اور نیا بھابھی بھی تمہاری ہمدردی میں مجھ مسکین پر طعنے بازی کرنے پر اتر آئی تھیں۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے اسیس! میں لوگوں کی باتیں برداشت نہیں کرسکوں گی۔"

اس کی سوئی وہیں پر اٹکی ہوئی تھی۔

کسے خبر تھی کہ اتنی دلیر لڑکی بھی
جہاں کے خوف سے میری یاد تک بھلا دے گی

"جس شاعر نے بھی یہ شعر کہا ہے اس کی محبوبہ بھی تمہاری ہی طرح عقل سے کوری ہوگی اللہ کی بندی اب کس بات سے ڈرتی ہو جو طعنے دینے والے لوگ تھے ان کی زبانیں تو خود حالات نے بند کر دی ہیں۔ باقی سارا جہان فارغ نہیں بیٹھا کہ صرف زوہا طارق اور اسیس عبداللہ کو بیٹھ کر ڈسکس کرتا رہے۔ تم پتہ نہیں کیوں خود کو اتنا وی آئی پی سمجھتی ہو۔ اچھا ہوتا کہ میں تمہیں حقیقت بتانے کے بجائے ابھی کچھ عرصہ اور رات بھر جاگنے اور آنسو بہانے دیتا۔"

وہ کچھ چڑ سا گیا۔

"تو نہ ختم کرتے اپنے ڈرامے کو میں کوئی آنسو بہانے آپ کے پاس تو نہیں آئی تھی۔"

ماہا کو اندر کی باتیں باہر پہنچانے پر مزا چکھانے کا فیصلہ کرتے ہوئے اس نے ترخ کر جواب دیا تھا۔

"مجبوری تھی اس لیے ختم کرنا پڑا ڈرامہ۔ ایک تو ڈرامے کا اہم رول مبشرہ بیگم

نے شادی کا فیصلہ کر کے مزید اداکاری سے انکار کر دیا اور دوسرے وہ تمہارے تایا زاد منیب صاحب رقیب روسیا کا رول پلے کرنے کے لیے تیار بیٹھے تھے ذرا جو غفلت ہو جاتی مجھ سے تو وہ لے اڑتے تمہیں ویسے ہی آج کل تم بڑا منیب منیب کرنے لگی تھیں۔''

''ہاں تو بالکل ٹھیک......''

''شش......''

وہ نہ جانے کیا کہنا چاہ رہی تھی اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اس کی رسٹ واچ سے ابھرتا خوبصورت میوزک رات کے بارہ بجنے کا اعلان کر رہا تھا باہر کی فضا بھی پٹاخوں اور ہوائی فائرنگ کی آوازوں سے گونج اٹھی تھی۔

''ہیپی نیو ایئر۔''

اس نے دھیرے سے سرگوشی کرتے ہوئے زوہا کی نظروں کے تعاقب میں آسمان کی طرف دیکھا۔خوشی میں کی جانے والی آتش بازی کی وجہ سے یہاں وہاں رنگ ہی رنگ بکھرے تھے۔

''تم کب میری زندگی میں رنگ بکھیرنے ہمارے گھر آؤ گی زوہا!'' اس کا لہجہ خمار آلود تھا۔

''کم از کم اس سال نہیں کیونکہ اس سال مجھے اپنا آنرز مکمل کرنا ہے اور آپ کو کسی فرم میں انٹرن شپ کرنی ہے۔''

اس نے مکمل بے مروتی سے بولتے اس کے رومانٹک موڈ کا بیڑا غرق کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بھی ہار ماننے والا نہیں تھا۔

''ٹھیک ہے مجھے منظور ہے۔''

''آپ اتنا زیادہ بھی بول سکتے ہیں اسیس! آج سے پہلے مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا۔''

''صرف زیادہ بول ہی نہیں سکتے ہم عملی طور پر بھی بہت کچھ کر سکتے تھے مگر......!''



ایک شرارتی نظر زوہا کے شرم سے سرخ چہرے پر ڈالتے اس نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔

گاڑی میں ''تیرا ساتھ ہے کتنا پیارا'' بار بار ریوائنڈ کر کے بجایا جا رہا تھا سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں موند کر بیٹھی زوہا کو اب اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔وہ بند پلکوں کے پیچھے دوبارہ سے اپنے ان خوابوں کو سجا چکی تھی جن سے دستبرداری کے فیصلے نے اس کی نیندیں چھین لی تھیں۔

☆☆☆

# وہ چاند کے پاس تارا ہے

مسلسل ہچکولے کھاتی بس جب ذرا ہموار سڑک پر آئی تو خشوع وخضوع سے آنکھیں بند کیے قرآنی آیات کا ورد کرتی ایشاع حیدر نے بھی سکون کا سانس لیتے ہوئے اپنی آنکھیں کھول دیں لیکن اگلا ہی پل اسے شرمندگی کے اتھاہ سمندر میں ڈبو گیا۔ برابر والی سیٹ پر بیٹھی لڑکی جو پچھلے چالیس منٹ سے اس کی ہم سفر تھی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

"اونہہ! اتنی دیر سے تو اسٹیچو بنی بیٹھی تھی۔ مجال ہے جو ایک منٹ کے لیے بھی لفٹ کروائی ہو۔ اب ذرا سی میری کمزوری ہاتھ لگ گئی تو محترمہ دل کھول کر مسکرا رہی ہیں۔" اس نے جل کر کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

دل تو اس کا یوں بھی بہت کڑھا ہوا تھا۔ ذیشان حیدر کی عدم ستیابی پر چھ ماہ پہلے شرمین سکندر سے رشتہ جوڑنے کے بعد وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کے لیے گوہر نایاب ہوتا جا رہا تھا۔ آج چوتھا دن تھا اسے یہ یاددہانی کرواتے ہوئے کہ مدحت کے گھر جانا ہے لیکن وہ آج بھی پچھلے تین دنوں کی طرح دستیاب نہیں تھا۔

دوسری طرف مدحت تھی جو کسی طرح صحت یاب ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ ہر دفعہ فون کرنے پر یہی پتا چلتا "ابھی طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی۔ بخار ہے کھانسی بڑھ گئی ہے" وغیرہ وغیرہ۔"





مدحت سے اس کی دو مہینے اور چند دن پر محیط دوستی کی مدت تو یقیناً مختصر تھی لیکن گہرائی اتنی زیادہ تھی کہ اس کی ایک ہفتے کی مسلسل غیر حاضری نے ایشاع حیدر کو بوکھلا کر رکھ دیا۔

وہ بی ایس سی کرنے کے بعد ایم ٹی (میڈیکل ٹرانسکرپشن) کا کورس کرنے سی ڈی ایس گئی تھی وہیں پہلے دن ہونے والا تعارف اس کی اور مدحت کی دوستی کی بنیاد بن گیا تھا اور یہی دوستی کا جوش تھا جو اسے بس میں بٹھا کر لانڈھی جیسے دور افتادہ مقام کی طرف لے جا رہا تھا۔

راستے میں کئی بار اس نے دل ہی دل میں جہاں شرمین سکندر کو اپنا بھائی لے اڑنے پر کوسا تھا وہیں مدحت کے حوصلے کی بھی داد دی تھی جو روزانہ پچاس منٹ کا راستہ اس بیہودہ سواری میں طے کر کے انسٹی ٹیوٹ پہنچتی تھی اور اس پر ہشاش بشاش بھی یوں رہتی تھی جیسے اس کے گھر کی دیوار انسٹی ٹیوٹ کی دیوار سے ملی ہو۔

"او باجی! نور منزل کا اسٹاپ آ گیا اترنا نہیں ہے کیا تم کو۔"

کنڈیکٹر کی تیز آواز اسے خیالات کی دنیا سے کھینچ لائی۔ گود میں دھرے اپنے بیگ کو کاندھے پر لٹکاتی وہ سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی اس کی ہم سفر لڑکی بھی شاید اسی اسٹاپ پر اتری تھی کیونکہ اس کی کالی چادر کا پلو ابھی ابھی اس کی نظروں کے سامنے سے لہراتا بس کے کھلے دروازے سے غائب ہوا تھا۔

"شاوا' جلدی کرو باجی' جلدی اترو۔" کنڈیکٹر کے جھنجلانے پر اس نے بوکھلا کر بس سے تقریباً چھلانگ ہی لگا دی تھی لیکن وہاں کی زمین اور خود اس کے پیروں میں موجود ہائی ہیل کی نازک سی سینڈل دونوں ہی اس کرتب کے لیے سخت ناموزوں تھیں۔

وہ تو بھلا ہوا کہ چند قدم پر موجود اس کی بدتمیز ہم سفر نے لپک کر اسے تھام لیا ورنہ یقیناً وہ سڑک پر ہی چاروں شانے چت گری ہوتی۔

"کیا ہو گیا ہے شمی! جلدی کرو لگتا ہے بارش شروع ہونے والی ہے۔" گمبھیر خوبصورت آواز پر اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو خود سے چند قدم کے فاصلے پر لڑکی سے

ملتے جلتے نقوش والا ایک لڑکا بھی نظر آیا وہ دونوں یقیناً بہن بھائی تھے۔ جتنی لڑکی کے اندر نزاکت دکھائی دیتی تھی اتنی ہی لڑکے کے اندر وجاہت موجود تھی۔

"آ رہی ہوں بھائی! لڑکی اپنے بھائی کی پکار کا جواب دیتے ہوئے اس کی طرف بڑھی تو یکدم اسے ہوش آیا۔

"ایکسکیوزمی' کیا آپ اس ایڈریس کے بارے میں بتا سکتی ہیں؟" اپنے بیگ کی زپ کھول کر جلدی سے کاغذ کا ایک ٹکڑا باہر کھینچا۔

یہ علاقہ اس کے لیے بالکل نیا تھا چنانچہ کسی نہ کسی سے تو ایڈریس پوچھنا ہی تھا پھر بہتر تھا کہ اس بداخلاق لڑکی سے ہی پوچھ لیا جاتا جس کے بارے میں اس کی رائے ابھی ابھی ہی کچھ بہتر ہوئی تھی۔

"ارے یہ تو میرے بڑے ابا کے گھر کا ایڈریس ہے بالکل ہمارے برابر میں ہی رہتے ہیں ایسا کریں آپ ہمارے ساتھ ہی چلیں۔" پہلی بار لڑکی نے ڈھنگ سے اس سے کوئی بات کی تھی۔

کسی بہتر گائیڈ کے مل جانے پر جہاں اس نے دل میں خوشی کی لہر دوڑتی محسوس کی وہیں بے بسی سے اپنے دائیں پیر کی طرف دیکھ کر رہ گئی اس کی نازک سی سینڈل اسے بیچ راستے میں داغ مفارقت دے چکی تھی۔ پیر پر دو تین جگہ خراشیں بھی آئی تھیں جن سے معمولی سا خون رس رہا تھا۔

لڑکی جسے شہنی کہہ کر پکارا گیا تھا اب خود بھی اس کی نظروں کے تعاقب میں اس کی بے وفا سینڈل اور مجروح پاؤں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"بھائی! میرے خیال میں یہاں سے رکشہ کر کے اندر چلتے ہیں۔"

"بھائی!" جو دیکھنے میں بہن صاحبہ سے بھی کئی گنا سنجیدہ نظر آتے تھے خاموشی سے ایک طرف کھڑے رکشے کی طرف بڑھ گئے۔

رکشے والے سے چند لمحے مذاکرات کرنے کے بعد انہوں نے اشارے سے ان دونوں کو پیچھے بیٹھنے کا اشارا کیا اور خود رکشہ ڈرائیور کے ساتھ ہی براجمان ہو گئے۔



ٹوٹی پھوٹی ڈھیلی سڑک پر رکشے میں جھٹکے کھاتے ہوئے سفر کرنا ایشاع حیدر کا دوسرا دردناک تجربہ تھا پہلے ہی بس کے سفر نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔

وہ تو شکر ہوا کہ رکشہ پانچ منٹ بعد ہی ایک سبز رنگ کے دروازے کے سامنے جا رکا۔ "شہنی صاحبہ" کی پیروی کرتے ہوئے وہ بھی رکشہ سے نیچے اتر آئی۔

"یہ رہا مدحت باجی کا گھر آپ اندر چلی جائیں دائیں طرف پہلا کمرہ ان ہی کا ہے۔" اسے رہنمائی کا شرف بخشنے کے بعد وہ جھپاک سے برابر والے گھر میں داخل ہو گئی۔

حیران پریشان ایشاع نے وہیں کھڑے اردگرد کا جائزہ لینا لیا۔ گلی بہت زیادہ چوڑی نہیں تھی مکانات کے درمیان تضاد بھی بہت نظر آتا تھا کوئی بالکل ہی خستہ حال تھا تو کوئی بالکل نیا نکور بہرحال اکثر درمیانے درجے کے مکانات تھے دن کے تین بجے بھی گلی میں ایسی رونق نظر آ رہی تھی جیسی عام طور پر شام پانچ چھ بجے کے قریب پبلک پارکس اور پلے گراؤنڈز میں نظر آتی ہے ہر سائز اور رنگ وروپ کے بچے مختصر سی جگہ پر بھی مختلف قسم کے گیمز کھیلتے نظر آ رہے تھے۔

جائزہ لینے کو تو ابھی یہاں بہت زیادہ ورائٹی تھی لیکن اب کی بار اس کی نظروں نے جس شے کو فوکس کیا وہ "بھائی محترم" کی آنکھیں تھیں جو بہت واضح طور پر اسے اندر جانے کا حکم دے رہی تھیں۔ ان آنکھوں کے حکم سے خائف ہو کر وہ جلدی سے اپنی ٹوٹی سینڈل کو گھسیٹتی بنا دستک دیے کھلے سبز دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔

گلی کے مقابلے میں گھر کا ماحول بڑا پرسکون تھا صاف ستھرے صحن میں ایک طرف بنی کیاری میں موتیا سدا بہار اور لیموں کے پودے جھوم رہے تھے دائیں طرف کی دیوار میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دو دروازے تھے جو یقیناً کسی کمرے میں ہی کھلتے تھے دوسرے دروازے سے تھوڑا آگے ایک گول زینہ بنا ہوا تھا جس کی گولائی کے ساتھ ساتھ منی پلانٹ کی خوبصورت بیل گھوم رہی تھی۔ بائیں جانب لائن سے بنے چار دروازے یقیناً کچن' اسٹور' غسل خانے اور ٹوائلٹ کے تھے اس کے اندازے کی تصدیق باہر سے بھی

ہو سکتی تھی کیونکہ ایک دروازے پر موٹا سا تالا پڑا تھا دوسرے سے دھواں اور خوشبوئیں ایک ساتھ برآمد ہو رہی تھیں تیسرے اور چوتھے دروازے کی درمیانی دیوار کے ساتھ واش بیسن موجود تھا جس کے اوپر ایک چمکتا' صاف شفاف آئینہ لگا تھا۔

"ارے ایشاع! تم کب آئیں۔" کچن کے دروازے سے نکلتی مدحت نے صحن کے بیچوں بیچ کھڑی ایشاع کو دیکھ کر پہلے حیرت سے ایک چیخ ماری اور دوسرے ہی لمحے مسرت سے چمکتے چہرے کے ساتھ وہ اس کے گلے لگ گئی تھی۔

وہ اس کے بے ساختہ خوشی کو انجوائے کرتی اس کی طرف غور سے دیکھ رہی تھی جو پہلی نظر میں ہی بہت زیادہ کمزور اور مضمحل نظر آ رہی تھی۔

"چلو اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔" وہ اسے ساتھ لیے ایک کمرے کی طرف بڑھنے لگی پھر یکدم ہی ٹھٹک کر رک گئی۔

"تم آئی کس کے ساتھ ہو باہر کسی کو کھڑا تو نہیں کر رکھا؟"

اس کے سوال پر نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہ نیچے جھک کر اپنی سینڈل کے اسٹریپ کھولنے لگی اب مزید اس تکلیف کو سہنا اس کی برداشت سے باہر تھا۔

"کیا بس سے آئی ہو؟" اس کی حالت زار نے مدحت پر جیسے کوئی انکشاف کیا تھا اور اب وہ آنکھیں پھاڑے نئے سرے سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ ہمیشہ بے شکن لباس پہننے والی کے کپڑوں پر بے شمار شکنیں پڑی ہوئی تھیں ڈوپٹہ کی جگہ استعمال کیا جانے والا اسکارف بمشکل گلے میں گرہ باندھ کر گرنے سے روکا گیا تھا۔ اسٹیپ کٹنگ میں سیٹ کیے گئے بال جو ہمیشہ سلیقے سے سنورے رہتے تھے اس وقت اس کی پریشان حالی کا احوال چیخ چیخ کر سنا رہے تھے۔

"تم......ایشاع! یہ تم ہو۔" حیرانی کے بعد اس پر ہنسی کا دورہ پڑا تھا اور وہ منہ بناتی ایشاع کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے لے گئی تھی۔

اپنا حال دیکھ کر تو وہ بھی چند لمحوں کے لیے ہونق رہ گئی۔ ابتر حلیے والی یہ لڑکی ایشاع حیدر ہی تھی اسے خود بھی یقین نہیں آیا لیکن اب آئینے کو تو جھٹلانے سے رہی سو اپنی



خفت مٹانے کے لیے اسی پر بل پڑی۔

"سارا کیا دھرا تمہارا ہے نہ تم اتنے دن اپنی شکل لے کر غائب ہوتیں نہ مجھے اس ایڈونچر سے گزرنا پڑتا۔ یہاں گھر میں آرام سے مٹر گشت کرتی پھر رہی ہو اور انسٹی ٹیوٹ آنے کے لیے بیماری کے بہانے بنائے جا رہے ہیں۔"

"ارے بابا اتنا غصہ لگتا ہے بہت ہی خوار ہو کر آئی ہو۔" مدحت ہنسی۔

"خوار تو ہونا ہی تھا عادت جو نہیں ہے مجھے بسوں میں بیٹھنے کی اوپر سے بارش نے سڑکوں کی حالت تباہ کر ڈالی ہے قائد آباد کے پل کے بعد تو مانو ایسا لگ رہا تھا ناردن ایریاز کے راستوں پر سفر کر رہے ہوں۔ جھٹکے جو لگ رہے تھے' سو لگ رہے تھے' بعض جگہ تو یوں لگتا تھا جیسے بس الٹ ہی جائے گی۔ یقین کرو' میں نے تو جتنی دعائیں اور سورتیں یاد تھیں سب پڑھ ڈالیں۔" تھکے تھکے انداز میں بیڈ پر بیٹھی وہ ہاتھوں کی مدد سے اپنے پیروں کی انگلیاں دبا رہی تھی۔

"گاڑی کیا ہوئی تمہاری جو بس میں آئی ہو۔" اس کی حالت زار پر ہنسی ضبط کرتی وہ بظاہر بڑی سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

"گاڑی کو کیا ہونا ہے کھڑی ہے گھر میں لیکن ماما کا تمہیں بتایا تھا نا میں نے لمبے روٹ پر اکیلے گاڑی لے جانے کی اجازت نہیں دیتیں۔ ذیشان بھیا سے کہہ کہہ کر تھک گئی لیکن انہیں بھی آج کل اپنی نئی نویلی منگیتر سے فرصت نہیں ہے۔ مجبوراً بس سے آنا پڑا۔" اپنی خوبصورت سی ناک کو ایک ادا سے چڑھاتی وہ تفصیل سنا رہی تھی۔

"تو بس سے آنے کی اجازت مل گئی تمہیں؟" اب کے مدحت کے لہجے میں حیرانی در آئی تھی۔

وہ چڑنے لگی۔ "بدھو! اجازت لے کر آیا ہی کون ہے۔ میں تو اس وقت انسٹی ٹیوٹ میں بیٹھی کلاس لے رہی ہوں شام میں سات بجے تک لوٹ جاؤں گی موسم اچھا تھا اس لیے گاڑی گھر چھوڑنے کا بہانہ مل گیا اگر گاڑی میں آتی تو بالکل بھی تمہارے گھر نہیں پہنچ سکتی تھی بالکل ان نون راستہ ہے میرے لیے اب بھی پورا راستہ کنڈیکٹر سے کہتی آئی

ہوں کہ نُورٹرل کے اسٹاپ پر اتار دینا۔''

یوں جھوٹ گھڑ کے اس کا اپنے گھر آنا مدحت کو اچھا تو بالکل نہ لگا لیکن اس کے خلوص کو دیکھ کر چپ ہو رہی۔

''اور ہاں مدحت! تمہاری ایک سڑیل سی کزن بھی میرے ساتھ ہی آئی ہے سچ! سخت بور کیا اس نے مجھے پورے راستے گونگے کا گڑ کھائے بیٹھی رہی اتنی دفعہ اس کی طرف مسکرا کر دیکھا لیکن مجال ہے جو اس نے ذرا سی بات کی ہو اتنا ہے کہ اس کی وجہ سے تمہارا گھر ڈھونڈنے کے لیے خوار نہیں ہونا پڑا مجھے۔ یہیں تمہارے پڑوس میں ہی تو رہتی ہے کیا نام تھا اس کا۔'' کنپٹی کو انگلی کی مدد سے دباتی وہ نام یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ مدحت بول اٹھی۔

''شہنی...... شہنیلا نام ہے اس کا لیکن وہ تو بہت بااخلاق لڑکی ہے تم نے اسے سڑیل کیسے سمجھ لیا۔''

''اونہہ! جو لڑکی پورے پچاس منٹ کے راستے میں ایک بات تک نہ کرے اسے سڑیل نہیں کہوں تو اور کیا کہوں۔''

اس کے منہ بنانے پر مدحت ہنس دی پھر وضاحت کرنے لگی۔ ''اصل میں اسبق بہت ناراض ہوتا ہے بس میں خواتین کے ساتھ بات چیت کرنے اور گلی میں کھڑے ہونے پر اس لیے شہنیلا اس کی موجودگی میں بہت زیادہ احتیاط کرتی ہے۔ ابھی دیکھنا تھوڑی دیر میں خود ہی آجائے گی تم سے ملنے پھر تمہاری ساری غلط فہمی دور ہو جائے گی۔''

''چلو دیکھیں گے۔'' لاپروائی سے کندھے اچکاتی وہ بیڈ پر تکیوں کے سہارے نیم دراز ہو گئی۔

''اے، تم میری مزاج پرسی کرنے آئی ہو۔ خود بیڈ پر قبضہ کر لیا ہے اور میں بے چاری مریض کرسی پر بیٹھی ہوں۔'' مدحت نے اسے پھیلتے دیکھ کر ٹوکا۔

''فی الحال تو میری حالت تم سے زیادہ خراب ہو رہی ہے اور یہ سوچ کر تو بالکل



ہی بے حال ہو رہی ہوں کہ ان ہی مراحل سے گزر کر واپس بھی جانا ہے۔'' اب کے اس کے انداز میں بے چارگی تھی۔

اس سے پہلے کہ مدحت اسے تسلی دیتی دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

''اندر آجاؤ شہنی!'' اس نے آواز لگائی دوسرے ہی لمحے وہ لوازمات سے بھری ٹرے اٹھائے شرمندہ شرمندہ سی کمرے کے اندر داخل ہوئی۔

ایشاع نے دلچسپی سے اس کی جانب دیکھا بڑی سی کالی چادر کی جگہ کاٹن کے میچنگ دوپٹے نے لے لی تھی گلابی رنگ کا عکس اس کے چہرے پر پڑنے سے خوبصورتی اور دلکشی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔

''السلام علیکم!'' ٹرے ایک چھوٹی سی میز پر رکھنے کے ساتھ بڑے ادب سے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔ بھئی! تم تو بہت ہی کیوٹ ہو۔'' ایشاع نے بے اختیار ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب بٹھا لیا۔ اپنی تعریف سن کر ایک پل کے لیے تو وہ محجوب سی ہوئی پھر سنبھل کر وضاحت کرنے لگی۔

''وہ اصل میں بھائی کو پسند نہیں ہے اس لیے میں نے راستے میں آپ سے بات نہیں کی ورنہ جب آپ نے ایڈریس پوچھا تھا تو میں سمجھ گئی تھی کہ آپ مدحت اپیا کی دوست ایشاع ہیں سچ مدحت اپیا سے آپ کی باتیں سن سن کر اتنا اشتیاق ہو گیا تھا آپ سے ملنے کا کہ اگر بھائی کا ڈر نہیں ہوتا تو رکشے میں تو ضرور ہی آپ سے بات کرتی۔''

اس کی بات سن کر ایشاع کا ذہن گلی میں کھڑے اس طرم خان کی طرف چلا گیا جو اسے بھی یوں ہی گھور رہا تھا کہ اگر جو وہ اس کی آنکھ کا اشارہ نہ سمجھتی تو یقیناً بے نقط سنا ڈالتا اپنی چھوٹی بہن پر تو ایسے شخص کا رعب ہونا ایک لازمی سی بات تھی۔

''اور مدحت اپیا! آپ سے تو میں سخت ناراض ہوں آج ہی تو آپ کا بخار اترا ہے اور آپ نے کچن میں انٹری دے دی انتظار نہیں کر سکتی تھیں تھوڑی دیر میرا کون سا ابھی رات کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا جو آپ نے اتنی جلدی دکھائی۔'' وہ یقیناً کچن میں

اس کی کارگزاری دیکھ کر آ رہی تھی اس لیے خفا خفا سی اس سے الجھ رہی تھی۔

"بھئی! اب مہمان کے سامنے تو ناراض مت ہو ویسے بھی میں نے کوئی زیادہ کام نہیں کیا ہے صرف سالن پکایا ہے اور آٹا گوندھا ہے۔ روٹیاں تم ہی کو پکانا ہوں گی چلو تم اب جلدی سے یہ لوازمات سرو کرو ورنہ سب کچھ ٹھنڈا ہو جائے گا۔" مدحت نے پیار سے اسے بہلایا۔

"ویسے تم لوگ آ کہاں سے رہے تھے۔" گرم گرم سموسے کو ہاتھ سے توڑ کر منہ میں رکھتی ایشاع نے شہنی کو مخاطب کر کے پوچھا۔

"شہنی کی خالہ بہت بیمار ہیں انجائنا کا اٹیک ہوا ہے انہیں دو دن پہلے وہیں نیپا پر ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہیں یہ لوگ ان کے پاس ٹھہری ہوئی ہیں چچی تو چچا ابا کو گھر میں زیادہ دیر اکیلا نہیں چھوڑ سکتیں جب سے چچا ابا کو فالج کا اٹیک ہوا ہے وہ اپنی ہر ضرورت کے لیے چچی پر انحصار کرنے لگے ہیں خالہ کی تو کوئی اولاد بھی نہیں ہے جو ان کا خیال رکھ سکے اس لیے چچی کی پریشانی کے خیال سے امی وہاں رکی ہوئی ہیں ادھر میں بیمار ہوں تو بے چاری شہنی پر بوجھ پڑ گیا ہے یہاں کا بھی کرتی ہے اپنے گھر کا بھی بلکہ ہاسپٹل میں امی اور اپنے خالو کے لیے کھانا بھجوانا بھی اسی کی ذمہ داری ہے۔ جواب شہنی کے بجائے مدحت نے تفصیل سے دیا تھا۔

ایشاع اتنی ساری پریشانیوں کا سن کر افسوس سے سر ہلانے لگی۔

☆☆☆

"یا اللہ! یہ بارش ابھی تک ہو رہی ہے۔" ایشاع نے ایک نظر وال کلاک اور دوسری باہر پڑتی پھوار پر ڈالی اب اس کے چہرے پر فکر مندی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔

اس کی یہاں آمد کو دو گھنٹے گزر چکے تھے اس عرصے میں بارش بھی وقفے وقفے سے برس رہی تھی۔ پہلے اس نے پروا نہیں کی لیکن اب صرف گھر واپس جانے کی فکر دامن گیر تھی۔



"مدحت پلیز تم ایسا کرو کہ مجھے چھتری دے دو اگر میں بارش رکنے کا انتظار کرتی رہی تو لیٹ ہو جاؤں گی۔"

"تو یار! اس برستے موسم میں واپس گھر جانے کی ضرورت ہی کیا ہے رک جاؤ آج یہیں۔ کل دونوں اکٹھے ہی چلیں گے ابھی اپنی ماما کو فون کر کے کہہ دو کہ آج میرے پاس رکی ہوئی ہو۔" مدحت نے ہتھیلی پر رکھی سونف پھانکتے ہوئے اطمینان سے مشورہ دیا۔

"واہ! کیا شاندار آئیڈیا ہے۔ اگر آج اس پر عمل کر لوں تو کل سے سی ڈی ایس جانے پر بھی پابندی لگ جائے۔ تسی گریٹ ہو مدحت اقبال۔" مدحت کے نامعقول مشورے پر وہ چڑ کر بولی۔

"اوہ! میں تو بھول ہی گئی تھی۔ تم تو گھر سے اجازت لیے بغیر یہاں آئی ہو۔" مدحت اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔

"اچھا ایسا کرتی ہوں اسبق سے کہتی ہوں تمہیں ٹیکسی میں چھوڑ کر آ جائے اگر تمہیں اکیلے جانے دیا میں نے تو ابو بہت ناراض ہوں گے۔" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے تجویز پیش کی۔

"لیکن وہ بے چارہ ہے تو خود ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی وہاں سے آئے ہیں اب دوبارہ کیسے اتنی دور جائیں گے اور پھر واپس آئیں گے۔" اسے کسی دوسرے کو اپنی خاطر پریشان کرنا اچھا نہیں لگا۔

"تم اس کی فکر رہنے دو فی الحال اپنی خیر مناؤ شام ہو گئی ہے بارش کی وجہ سے ٹریفک بھی جام ہو گا۔ اگر بس سے گئیں تو نہ جانے کتنا وقت لگ جائے بہتر یہی ہے کہ اسبق کے ساتھ ٹیکسی میں چلی جاؤ۔" اسے سمجھاتے ہوئے مدحت اپنے چھوٹے بھائی آذر کو آواز دینے لگی تا کہ اسبق کو بلوا سکے۔

دو منٹ بعد ہی آذر نے کمرے میں جھانک کر اسبق کے آنے کی اطلاع دی تو مدحت کمرے سے باہر نکل گئی۔

فکر مندسی ایشاع بھی اس کے پیچھے اٹھ کھڑی ہوئی' لیکن پھر دروازے تک جا کر رک گئی۔ادھ کھلے دروازے سے ان دونوں کی آوازیں اس تک پہنچ رہی تھیں۔

''ضرورت کیا تھی تمہاری دوست کو اس موسم میں یہاں آنے کی۔'' وہ بہت تپے ہوئے لہجے میں بول رہا تھا۔

''پلیز اسبق! چھوڑ آؤ نا' اب اس بے چاری کو کیا معلوم تھا کہ بارش شروع ہو جائے گی۔وہ تو میری محبت میں اتنی دور چلی آئی ہے۔'' مدحت کی منت بھری آواز سنائی دی۔

''یہ خوب کہا تم نے کہ اسے بارش کا معلوم نہیں تھا سارے اخبار اور ٹی وی چینلز پر آج کی بارش کی پیش گوئی کی گئی تھی لیکن تم لڑکیاں ڈراموں' فلموں اور فیشن شوز سے ہٹ کر کچھ دیکھو تو پتا بھی ہو۔'' اب کے انداز مزید جلا کٹا تھا۔

''اُفوہ اسبق! اب کون موسم کی خبریں پڑھ سن کر گھر سے نکلتا ہے۔ویسے بھی ہمارے محکمہ موسمیات کا کون سا بھروسہ ہے جو کوئی ان کی پیش گوئیوں کے مطابق عمل کرے۔'' اس بار اس کا لہجہ بھی جھنجلا گیا تھا۔

''ٹھیک ہے بابا' ٹھیک ہے۔چھوڑ آتا ہوں میں تمہاری دوست کو اس کے دولت کدے پر لیکن اس سے کہو اپنا حلیہ درست کرے اس طرح سے تو میں نہیں لے جاؤں گا۔'' رضامندی کے ساتھ ساتھ شرط بھی رکھ دی گئی۔

''اسبق......اسبق! میں تمہارا کیا کروں' وہ کوئی تمہاری کزن یا بہن نہیں ہے جو تمہاری مرضی کے مطابق پہنے اوڑھے۔'' مدحت نے بری طرح دانت کچکچائے۔

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا۔نظر سامنے کمرے کے دروازے پر جا پڑی۔گرے چادر کے ہالے میں ایک ہاتھ سے دروازے کا پٹ تھامے برستی بارش کے اس پار کھڑی لڑکی نے اس کی زبان گنگ کر دی تھی۔

''اب ٹھیک ہے' چلیں۔'' چہرے پر معصومیت لیے وہ اس سے پوچھ رہی تھی۔

''آں......ہاں۔چلتے ہیں' آپ تھوڑی دیر ٹھہریے' میں ٹیکسی لے کر آتا



ہوں۔'' وہ جیسے کسی گہرے خیال سے چونک کر باہر نکلا تھا۔

☆☆☆

''مدحت! تم لوگ یہیں کہیں قریب میں کوئی فلیٹ وغیرہ کیوں نہیں لے لیتے۔'' دس منٹ کی بریک میں وہ دونوں چائے پینے کے ارادے سے کینٹین میں بیٹھی تھیں کہ بالکل اچانک ہی ایشاع نے اس سے سوال کر ڈالا۔

''کیوں بھئی! یہ اچانک ہی تمہیں میری رہائش گاہ تبدیل کرنے کا خیال کیوں آ گیا۔'' مدحت نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں' اچانک تو نہیں آیا۔جب سے تمہارے گھر سے واپس آئی ہوں یہی سوچ رہی ہوں' اتنا تو مجھے اندازہ ہے کہ تم لوگ کوئی بڑا گھر نہ سہی لگژری فلیٹ تو افورڈ کر ہی سکتے ہو۔بھیا' تمہارے چار سال سے امریکہ میں ہیں' ابو بھی بینک میں اچھی پوسٹ پر ہیں تو یقیناً مالی طور پر تو ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا کہ تم لوگ اس خراب سے ایریے میں رہنے پر مجبور ہو۔پلیز برا مت ماننا میری بات کا لیکن میں اس لیے بھی کہہ رہی ہوں کہ تم لوگ اپنے ہر کام کے لیے یہیں دوڑے آتے ہو تمہارا یہاں پر کورس چل رہا ہے۔آگے یقیناً تم ایم ایس سی کرو گی تو یونیورسٹی بھی آنا پڑے گا۔آذر کا اسکول بھی یہیں ہے۔

تمہاری دونوں شادی شدہ بہنیں یہیں قریب ہی رہتی ہیں۔سب کچھ یہیں ہے تو پھر تم لوگ وہاں کیوں رہ رہے ہو' یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔'' مدحت کے ''کیوں'' کا جواب اس نے اتنی تفصیل سے دیا تھا کہ اسے یقین آ گیا کہ واقعی وہ کل رات سے مسلسل اسی مسئلہ پر سوچ رہی ہے۔

''تم بالکل صحیح کہہ رہی ہو ایشاع! واقعی ہم لوگ ایک بہتر گھر افورڈ کر سکتے ہیں۔بھیا بھی اس سلسلے میں کئی بار ابو سے فون پر بحث کر چکے ہیں لیکن اصل مسئلہ چچا ابا کی فیملی کا ہے ابو ان سے بہت محبت کرتے ہیں اور ان سے دور نہیں رہنا چاہتے۔جب سے چچا جان کو فالج کا اٹیک ہوا ہے تقریباً معذور ہی ہو گئے ہیں فنڈز وغیرہ کی رقم تو ان کے علاج پر ہی خرچ ہو گئی تھی باقی رقم سے وہیں ایک چھوٹی سی دوکان خرید کر کرائے پر دی

ہوئی ہے۔اسبق کی ٹیوشنز سے ملنے والی رقم سے گھر اور دونوں بہن بھائی کی تعلیم کا خرچہ بمشکل پورا ہوتا ہے اس پر اسبق خوددار اتنا ہے کہ ابو تک سے کسی قسم کی مدد لینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔اس کے دن بھر یونیورسٹی اور ٹیوشن سینٹرز کے چکر میں گھر سے باہر رہنے کی وجہ سے گھر والے بالکل تنہا ہو جاتے ہیں کسی ایمرجنسی کی صورت میں اگر اپنے ساتھ ہوں تو انسان کے دل کو ڈھارس رہتی ہے اس لیے جب تک اسبق اپنی ایجوکیشن کمپلیٹ کر کے کسی اچھی جاب پر نہیں لگ جاتا ہم گھر شفٹ کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے اور تب بھی اسی صورت میں شفٹ ہوں گے جب اسبق ہمارے ساتھ شفٹ ہونے کے لائق ہو سکے اس سے تم اندازہ لگا لو کہ یہ کم از کم بھی پانچ سالہ منصوبہ ہے۔''ایشاع کی الجھن کے جواب میں مدحت نے ساری تفصیل سنا ڈالی۔

''اور یہ اسبق صاحب کی تعلیم کب مکمل ہو رہی ہے؟''ایشاع نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔اس کی آنکھوں میں کل شام بارش میں بھیگتے ہوئے مدحت سے بحث کرتے اور ٹیکسی میں ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر خاموشی سے بیٹھے لڑکے کے دو مختلف روپ بالکل اچانک ہی روشن ہو گئے تھے وہ بھی اتنی جزئیات کے ساتھ کہ وہ چند ساعتوں کے لیے خود بھی ششدر رہ گئی اس کے ہیئر اسٹائل' آنکھوں کی گہرائی' لبوں کو اچانک بھینچ لینے کی ادا سے لے کر شرٹ کا کلر تک اسے اتنا یاد تھا جیسے وہ اب بھی سامنے بیٹھا ہو۔

''یا اللہ! یہ کیا معاملہ ہے؟''اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں' لیکن بند آنکھوں کے پیچھے تو جیسے اس کی شبیہہ کچھ اور واضح ہو گئی تھی۔

''بس یہ لاسٹ سمسٹر چل رہا ہے اس کا دو تین مہینے کی ہی بات ہے۔اس کے بعد وہ پوری طرح میدان میں اتر آئے گا۔''مدحت کا جواب سن کر اس نے آنکھیں کھولیں اور اس کے اشارے پر اٹھ کر غائب دماغی سے اس کے ساتھ کلاس کی جانب چل پڑی۔

☆☆☆

گول زینے کی سیڑھی پر بیٹھی مدحت اپنے چھوٹ جانے والے لیکچرز کے اہم



پوائنٹس نوٹس کرنے کے لیے ایشاع کی ڈائری پر نظر دوڑا رہی تھی کہ اسے اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور مسکرا دی۔اسبق اس سے ایک سیڑھی اوپر خاموشی سے بیٹھا تھا۔یقیناً اوپر وہ ابو کے کمرے میں ان سے حالات حاضرہ پر گفتگو کر کے نکلا تھا اور اب یہاں مدحت کو اس کی پسندیدہ جگہ پر بیٹھے دیکھ کر خود بھی بیٹھ گیا تھا۔

مدحت کچھ لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی لیکن جب وہ اس کی طرف متوجہ نہ ہوا تو دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

''مدحو! کبھی تم نے ایشاع کا گھر دیکھا ہے۔''پورے گھر میں واحد وہی تھا جو اسے مدحت کے بجائے مدحو کہہ کر بلاتا تھا۔

اسبق اور کسی لڑکی کے متعلق کوئی سوال کرے مدحت کی زندگی میں یہ پہلا واقعہ تھا سو وہ بڑی سرعت سے اس کی جانب پلٹی۔وہ نیلے آسمان پر کہیں کہیں اڑتی بدلیوں پر نظر جمائے بیٹھا تھا۔چہرے پر نہ سمجھ میں آنے والے تاثرات تھے۔

''دیکھا ہے میں نے اس کا گھر بلکہ کئی بار گئی ہوں وہاں نزدیک ہی تو ہے سی ڈی ایس سے لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو تم نے تو خود بھی اس دن جب تم اسے چھوڑنے گئے تھے تو دیکھا ہوگا اس کا گھر۔''وہ حیران ہو کر پوچھ رہی تھی۔

''دیکھا ہے' اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں تم سے اس علاقے میں سب سے خوبصورت گھر ان ہی کا ہے اس سے ہی تم اندازہ لگا لو کہ ان کا اسٹیٹس کیا ہوگا۔اتنے اونچے لوگوں میں دوستی کر تو لی ہے' لیکن نبھاؤ گی کیسے مدحو!''

اس کے پوچھنے پر مدحت نے ایک گہرا سانس لیا۔وہ سمجھ گئی تھی کہ اسبق کو اپر کلاس کی لڑکی سے دوستی کرنے پر اعتراض ہے۔

''دوستی ہمیشہ اپنے برابر کے لوگوں سے کرنی چاہیے۔''وہ نہ صرف اس مقولے کا قائل تھا بلکہ سختی سے اس پر کاربند بھی رہتا تھا۔

''دیکھو اسبق! پہلی بات تو یہ ہے کہ اس سے دوستی کرتے وقت مجھے یہ معلوم

نہیں تھا کہ وہ کیا ہے کہاں رہتی ہے' وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جب پتا چل گیا تو اب میں اتنی سی بات پر اس سے دوستی تو ختم کرنے سے رہی۔ تم اس کا یہ گھر دیکھ کر پریشان ہو رہے ہو وہ تو کچھ بھی نہیں ہے ان لوگوں کی پراپرٹی تو جانے کہاں کہاں اور کتنی ہے لیکن میں ان سب چکروں میں نہیں پڑتی جو تعلق ناپ تول کر' حساب کتاب لگا کر جوڑا جائے اسے دوستی یا محبت کا نام ہرگز نہیں دیا جا سکتا۔'' مدحت نے ایک ہی سانس میں اسے لیکچر دے ڈالا۔

''دوستی اور محبت کے رشتے بغیر حساب کتاب کے جوڑ تو لیے جاتے ہیں مدحو! لیکن انہیں نبھاتے وقت سارا حساب کتاب دیکھتے ہیں یہ بڑے لوگ۔'' الجھے الجھے افسردہ انداز میں کہتے ہوئے وہ مدحت کے قریب سے گزری کر تیزی سے سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔

☆☆☆

گھر کے سب لوگ لنچ یا ڈنر پر اکٹھے موجود ہوں ایسا رضا ہاؤس میں کم ہی ہوتا تھا۔ عجب دوڑتی بھاگتی زندگی تھی ان لوگوں کی۔ میٹنگز' پارٹیز' فارن ٹورز اور کلبز کے دائروں میں قید ان لوگوں کے پاس ایک دوسرے کے ساتھ مل کر بیٹھنے کا وقت کم ہی ہوتا تھا لیکن آج کی بات کچھ جدا تھی۔ آج شرمین سکندر اپنے والد کرنل سکندر کے ساتھ یہاں مدعو تھی۔ سو گھر کی ہونے والی بہو اور اس کے والد صاحب کے اعزاز میں سب ہی اہل خانہ موجود تھے۔

حیدر رضا کے خصوصی التفات' مسز رضا کی ناز برداریوں اور ذیشان حیدر کی وارفتہ نگاہوں نے شرمین سکندر کے نخریلے مزاج کو بڑی حد تک نارمل رکھا ہوا تھا کہ اچانک ایشاع ڈرائنگ روم کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہوئی۔

وائٹ کرتا پاجامے میں شانوں پر بڑا سا کلف لگا دوپٹہ پھیلائے اپنے کٹے ہوئے بالوں کو ڈھیروں پنوں کی مدد سے ہمیشہ سے مختلف اور سادہ انداز میں سنوارے میک اَپ سے بے نیاز چہرے میں بھی وہ اتنی حسین لگ رہی تھی کہ شرمین سکندر کا نوک پلک سے سنورا وجود ماند پڑنے لگا۔





''میری بیٹی تو آج جنت کی کوئی حور لگ رہی ہے۔ کیا خیال ہے سکندر صاحب!'' بے ساختہ اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لیتے ہوئے حیدر رضا نے کرنل سکندر سے اپنی بات کی تصدیق چاہی۔

کرنل سکندر بھی ان کی طرف دیکھتے ہوئے تائیدی انداز میں مسکرا دیے۔

سب لوگوں کی توجہ یکدم ہی ایشاع حیدر کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ اس صورت حال نے شرمین سکندر کے اندر کی خود پسند لڑکی کو حسد میں مبتلا کر ڈالا۔

وہ کرنل سکندر کی اکلوتی اور بے حد لاڈلی بیٹی تھی۔ اپنی شریک زندگی کے انتقال کے بعد جس طرح انہوں نے ناز و نعم سے اس کی پرورش کی تھی اس نے شرمین کو کافی حد تک خود پسند بنا ڈالا تھا۔ ''جہاں میں موجود ہوں' وہاں میرے سوائے کچھ دکھائی نہ دے۔'' اس سوچ نے اس اچھی بھلی لڑکی کے دماغ میں خلل پیدا کر دیا تھا۔

اب بھی یہ سوچ بنا کہ جس طرح وہ کرنل سکندر کی اکلوتی بیٹی ہونے کے ناطے ان کی لاڈلی ہے' ویسے ہی ایشاع بھی رضا ہاؤس کی اکلوتی اور لاڈلی لڑکی ہے۔ وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہی تھی۔

''بیٹا! آپ جو کورس کر رہی تھیں وہ کمپلیٹ ہو گیا یا نہیں۔'' کرنل سکندر اپنی بیٹی کی کیفیت سے بے نیاز ایشاع حیدر سے باتوں میں مصروف تھے۔

''جی انکل! وہ پچھلے ہفتے ہی ہو گیا تھا۔ اب تو میں نے یونیورسٹی جوائن کر لی ہے۔ اصل میں بی ایس سی کے بعد تھوڑا گیپ ملا تھا تو میں نے سوچا اس دوران کچھ کر ڈالوں بس اسی لیے ایم ٹی میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔''

''میں نے تو اس سے کہا بھی تھا کہ سڈنی چلی جائے اپنی آنٹی کے پاس لیکن یہ مانی ہی نہیں۔ کہتی ہے دل نہیں لگتا میرا پاکستان سے باہر اور یہاں رہ کر یہ کس چیز سے دل بہلاتی ہے یہ میری سمجھ نہیں آتا۔ نہ اس کی کوئی ڈھنگ کی دوست ہے نہ یہ کلب جاتی ہے اور تو اور شاپنگ کا بھی کوئی خاص شوق نہیں ہے اسے بہت ڈل لڑکی ہے۔'' ان دونوں کی گفتگو کے دوران مسز رضا نے اچانک ہی دخل دے کر اپنے شکوے کہہ سنائے تھے۔

"بھئی! میری بیٹی بہت سادہ مزاج ہے فضول قسم کی ایکٹیویٹیز میں ٹائم ضائع کرنے کے بجائے گھر پر رہنا اور اپنی اسٹڈی پر توجہ دینا پسند کرتی ہے۔" حیدر رضا نے ہمیشہ کی طرح اس کی طرف داری کی۔

"آپ ہی کی شہ پر تو یہ من مانی کرتی ہے ورنہ میں تو اس کو بالکل بھی چھوٹ نہیں دینے والی تھی پڑھنے کا شوق تھا تو کوئی ڈھنگ کی فیلڈ منتخب کرتی، بھلا بوٹنی جیسے بے کار سبجیکٹ میں ایم ایس سی کر کے کیا حاصل ہوگا۔ بندہ کوئی کام کرے تو یہ سوچ کر تو کرے کہ اس سے سوسائٹی میں ہمارا کچھ نام اور مقام بنے گا لیکن اس لڑکی میں تو عقل نام کی چیز ہی نہیں ہے اب شرمین بھی تو ہے جب کسی سے اس کا انٹروڈکشن کرواتی ہوں تو بتاتے ہوئے فخر بھی محسوس ہوتا ہے کہ میری ہونے والی بہو میڈیکل کے فائنل ائیر میں ہے۔" ایشاع کی گت بنتے دیکھ کر اور اپنی تعریف سن کر شرمین کا آف ہوتا موڈ بحال ہو گیا۔

جبکہ دوسری جانب وہ تھی جو اپنی تعریف کی طرح برائی بھی اپنے ازلی بے پروا انداز میں ہنس ہنس کر سن رہی تھی۔

☆☆☆

ڈرائیور کے سبز دروازے کے آگے گاڑی روکتے پر ایک ہاتھ سے دوپٹہ سنبھالتی اور دوسرے میں پرس تھامے بنا ادھر ادھر دیکھے وہ کھلے دروازے سے اندر داخل ہوئی تو خاموشی نے اس کا استقبال کیا۔

کمروں اور کچن کا جائزہ لینے کے بعد جب کسی نے اس کے پکارنے پر بھی کوئی جواب نہ دیا تو اس کے چہرے پر حیرانی دوڑ گئی۔

"آخر اس طرح گھر کھلا چھوڑ کر یہ سب لوگ کہاں چلے گئے تھے۔" ذہن میں اُبھرتے اس سوال کا جواب جیسے ہی اس کی سمجھ میں آیا وہ باہر نکل کر بائیں جانب بنے گھر کے نیم وا دروازے پر دستکیں دینے لگی۔

"شاید آذر ٹیکسی لے آیا ہے۔" اندر سے شہنی کی دھیمی سے آواز سنائی دی اور



اگلے ہی لمحے دروازہ چوپٹ کھل گیا۔

آنکھوں میں آنسو لیے مضطرب سی شہنی کو سامنے کھڑے دیکھ کر اس کا دل کچھ بے چین ہو گیا۔

"خیریت شہنی! کیا ہوا ہے۔"

"وہ اماں کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے اتنی دیر ہو گئی ہوش ہی نہیں آرہا آذر ٹیکسی لینے گیا ہے ابھی تک واپس نہیں آیا سمجھ نہیں آرہا کیا کروں۔" اس کا لہجہ بھرارہا تھا۔ آنسو بھی پلکوں کی باڑ توڑ کر یکدم رخساروں پر ڈھلک آئے تھے۔

وہ کچھ کہے بغیر اندر کی طرف دوڑی تھی۔ جہاں مدحت اور اس کی امی ایک چار پائی پر لیٹی شہنی کی اماں کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔

"مدحت گاڑی ہے میرے ساتھ جلدی سے آنٹی کو اس میں ڈالو ہم ہاسپٹل چلتے ہیں۔"

لیاقت نیشنل کے شعبہ ایمرجنسی میں انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ڈاکٹروں کے مطابق ان کی شوگر خطرناک حد تک بڑھ گئی تھی اور اگلے چند گھنٹوں میں ہوش نہ آنے کی صورت میں خطرہ بڑھ سکتا تھا۔

"کیا آنٹی شوگر کی مریضہ ہیں؟" آئی سی یو کے دروازے پر نظر جمائے وہ مدحت سے پوچھ رہی تھی۔

"نہیں پہلے کبھی انہیں یہ شکایت نہیں ہوئی۔ بس آج اچانک ہی ان کی ایسی کنڈیشن ہو گئی ہے۔"

"کہیں انہیں کوئی ٹینشن تو نہیں ہے۔" اس کے پوچھنے پر مدحت نے ایک گہری سانس لی۔

"پریشانی اور ٹینشن تو پچھلے کئی سالوں سے ان کی زندگی کا حصہ ہے لیکن اس آس پر کہ اسبق ایجوکیشن کمپلیٹ کر کے کسی اچھی پوسٹ پر لگ جائے گا وہ صبر کیے ہوئے تھیں لیکن جس طرح دو مہینے سے اسبق ایک اچھی جاب کے حصول کے لیے خوار ہو رہا

ہے اور ناکامی سے جھنجلایا رہتا ہے' اس چیز نے انہیں کمزور کر ڈالا ہے۔ آج بھی صبح سے نکلا ہوا ہے کسی جگہ انٹرویو کے لیے لیکن وہی بات ہے کہ بغیر سفارش کے کوئی ڈھنگ کی جاب ملتی کہاں ہے۔ ابو نے کہا بھی کہ اپنے کسی دوست سے کہہ کر لگوا دیتے ہیں کہیں' لیکن وہ راضی نہیں ہوتا چھوٹی سے چھوٹی بات پر اس کی انا مجروح ہونے لگتی ہے۔" بولتے بولتے اس لہجے میں اسبق کے لیے ناراضی در آئی تھی۔

اس سے پہلے کہ ایشاع اس کی بات پر کسی قسم کا اظہار خیال کرتی اس کی نظر تیزی سے اپنی طرف آتے اسبق پر جا پڑی۔

"کیسی حالت ہے اماں کی۔" لہجے میں بے تابی سموئے وہ پوچھ رہا تھا۔

"دو گھنٹے سے آئی سی یو میں ہیں۔ ابھی تو فی الحال کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" مدحت نے صاف بتا دینا مناسب سمجھا۔ وہ اس کی بات سن کر تیزی سے ڈاکٹرز کے روم کی طرف بڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

"ایشاع! شام بہت زیادہ ہوگئی ہے اب آپ گھر چلی جائیے۔" اماں کی حالت کچھ سنبھلی تھی تو اس کا دھیان مدحت کے ساتھ گھنٹوں سے خوار ہوتی لڑکی کی طرف گیا تھا۔ اتنے مہینوں میں آج وہ پہلی بار خود سے اس سے مخاطب ہوا تھا ورنہ ہمیشہ تو وہ ہی اس سے سلام دعا اور حال احوال پوچھنے میں پہل کرتی تھی لیکن آج جس طرح وہ ان لوگوں کے کام آئی تھی اس چیز نے اسبق کمال کے گریز میں کسی حد تک کمی کر دی تھی۔

"اگر آج وہ بروقت اماں کو ہاسپٹل نہ پہنچاتی تو جانے کیا ہو جاتا۔" یہ سوچ سوچ کر ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے تھے۔

دوسری طرف ایشاع خود بھی اللہ تعالیٰ کی شکر گزار تھی کہ اس کا بھری دوپہر میں مدحت کے گھر جانا کام آ گیا تھا ورنہ ان لوگوں کو مزید کسی دکھ سے گزرتے دیکھنا خود اس کے لیے بڑا تکلیف دہ ہوتا۔

آج پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت اس نے اور مدحت نے یونیورسٹی



سے چھٹی کی تھی لیکن ڈیڑھ بجے تک گھر کی دیواروں اور ملازموں سے گپ شپ کرتے کرتے جب وہ اوب گئی تو مدحت کے گھر جانے کا ارادہ کر کے اٹھ کھڑی ہوئی اس کی ڈرائیونگ کی صلاحیت پر یقین کرنے کے لیے ماما چونکہ ابھی تک راضی نہیں ہوئی تھیں اس لیے اس نے ڈیڈی سے کہہ کر اپنے لیے الگ سے ڈرائیور رکھوا لیا تھا۔

جب دل چاہتا اپنی مرضی سے مدحت کے گھر چلی جاتی تھی اور یہ دل وہاں جانے کو کیوں مچلتا تھا۔ اس سوال کا بڑا سیدھا سا جواب تھا۔

"اسبق کمال۔" ہاں وہی اسبق کمال جو خود سے مخاطب ہونا بھی پسند نہیں کرتا تھا اس کی کشش، ایشاع حیدر کو ہر بار اس کے گھر کی طرف جانے والے راستوں پر سفر کرنے پر مجبور کر دیتی تھی۔

"اگر آپ کہیں تو میں ڈرائیور کے ہاتھ گاڑی واپس بھجوا دوں ہو سکتا ہے کوئی ضرورت پڑ جائے۔" گہری ہوتی شام کو دیکھ کر اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی واپسی کا ارادہ کر لیا تھا لیکن یہاں کی فکر بھی دامن گیر تھی۔

"نو تھینکس۔ میرے خیال میں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" قدم سے قدم ملائے پارکنگ کی طرف بڑھتا وہ جو ابھی بہت اپنا اپنا سا لگ رہا تھا یکدم واپس اجنبیت اور تکلف کے خول میں جا چھپا۔

"جانے ہر بات اس شخص کے لیے انا کا مسئلہ کیوں بن جاتی ہے۔" آزردگی سے سوچتے وہ اپنے لیے کھولے گئے دروازے سے گاڑی کی پچھلی نشست پر جا بیٹھی۔

☆☆☆

"ڈیڈی! میں اندر آ جاؤں۔" اسٹڈی کے دروازے سے اندر جھانک کر اس نے اجازت طلب کی۔

حیدر رضا نے ایک پل کو کتاب سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر اثبات میں گردن ہلا دی ساتھ ہی انہوں نے بک مارک لگا کر کتاب بند کر دی تھی۔

وہ ان سے کوئی خاص بات کرنا چاہتی تھی' وہ یہ اس کے انداز ہی سے سمجھ چکے

تھے بچپن سے اس کی عادت تھی کہ جب کوئی بات اپنی ماما سے چھپا کر صرف ان سے کرنی ہوتی تو وہ یوں ہی دبے پاؤں ان کی اسٹڈی میں چلی آتی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یہ گھر کا وہ گوشہ ہے جہاں ماما کسی بھی صورت قدم نہیں رکھیں گی۔ان دونوں میاں بیوی کی طبیعتوں میں یہ بڑا عجیب سا تضاد تھا کہ ایک ادب کا حد درجے شائق تھا تو دوسرا حد درجے اس سے الرجک۔

"فرمائیے بیٹا جانی! کیا مسئلہ ہے؟" کارپٹ پر بیٹھی لاڈلی بیٹی سے وہ بڑی ملائمت سے مخاطب تھے۔

"ڈیڈی! میری دوست مدحت کو تو آپ جانتے ہیں اس کا ایک کزن ہے۔ انڈسٹریل کیمسٹری میں ماسٹرز کیا ہوا ہے بہت ذہین ہے لیکن کہیں جاب نہیں ملی۔ میں چاہتی ہوں آپ اسے اپنے پاس کہیں ایڈجسٹ کر لیں۔"

"بس اتنی سی بات کے لیے میری بیٹی پریشان ہے، کل بھیج دینا اسے میرے پاس مل جائے گی جاب اتنی تگڑی سفارش لے کر آئے گا تو ہم انکار تھوڑا ہی کر سکیں گے۔" وہ اس کا سر محبت سے تھپتھپاتے کچھ شوخی سے بولے تھے۔

"اوں ہوں، یہی تو مسئلہ ہے۔ سفارش وغیرہ کو وہ مانتا ہی نہیں۔ بہت خوددار ہے۔ یہ سمجھ لیں کہ وہ مجھ سے سفارش نہیں کروا رہا بلکہ میں خود آپ سے کہہ رہی ہوں کہ کسی طرح اسے اپنے پاس جاب دے دیں۔" وہ جانے انہیں کیا سمجھانا چاہ رہی تھی۔

اس بار ذرا غور سے انہوں نے اس کا جائزہ لیا تو اس کے انداز میں غیر محسوس سی تبدیلی نظر آئی۔

"تمہارے ذہن میں کیا ہے، مجھے کھل کر بتاؤ پھر اس کے مطابق ہی میں کوئی فیصلہ کر سکوں گا۔" اس کی جانب بغور دیکھتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

"آپ ایک پرکشش سیلری پر اپنی ٹیکسٹائل مل کی لیب کے لیے نیوز پیپر میں ایڈ دیں گے وہ آج کل جاب کی تلاش میں ہے اور ہر قابل ذکر جگہ پر انٹرویو کے لیے ضرور جاتا ہے آپ کا اشتہار دیکھے گا تو آپ کے پاس بھی ضرور آئے گا۔ میں اس کا کمپلیٹ





بائیوڈیٹا پہلے سے آپ کو دے دوں گی جتنے لوگ انٹرویو کے لیے آئیں آپ سب سے ملاقات کیجئے گا لیکن منتخب صرف اسبق کمال کو کرنا ہے اس بات کو مت بھولیے گا۔" وہ شاید پہلے ہی سارا لائحہ عمل طے کر چکی تھی اور اب انہیں اس سے آگاہ کر رہی تھی۔

"ٹھیک ہے، ہو جائے گا تمہارا کام لیکن اس سے پہلے میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔" نہایت سہولت سے اس کی تجویز کو قبول کرتے ہوئے انہوں نے اب اس کو ایک مشکل میں ڈالا تھا۔

"تمہارے ٹوٹل دوستوں کی تعداد کتنی ہے؟"

"جی!" وہ جو سمجھ رہی تھی کہ وہ اس سے نہ جانے کیا پوچھیں گے ان کے سوال پر حیرت زدہ رہ گئی تھی۔

"بہت سے بہت دو اور حد سے حد تین۔" اسے حیرت میں مبتلا دیکھ کر انہوں نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دیا تھا۔"اچھا یہ بتاؤ تمہارا سب سے عزیز دوست کون ہے؟"

"آپ!" اس کی طرف سے بلا توقف جواب ملا تھا۔

"پھر تم اپنے سب سے اچھے دوست کو وہ بات کیوں نہیں بتاتیں جو تمہیں شاید بہت دن پہلے بتا دینی چاہیے تھی۔"

"کون سی بات۔" وہ انجان بننے کی کوشش میں نظریں چرا رہی تھی۔

"یہ بات کہ ایشاع حیدر کی زندگی میں اسبق کمال کا کیا رول ہے؟" اس بار انہوں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا تھا۔

"اپنے سب سے اچھے دوست کو یہ بات میں اپنی زبان سے بتاؤں مجھے اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کیونکہ دوست تو دوست کے دل کا حال بغیر کہے ہی جان لیتے ہیں۔" اپنے ازلی پراعتماد لہجے میں جواب دے کر وہ ان کے سامنے سے اٹھ گئی تھی۔

اپنے اندازے کی درستگی پر ایک گہرا سانس خارج کرتے وہ کمرے سے نکلتی

ایشاع حیدر کو ساکت نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

''مجھے جاب مل گئی۔'' وہ خوشی سے بے قابو ہوتا بنا ادھر ادھر دیکھے کمرے میں آرام کرتی اماں سے جا لپٹا تھا۔

ایک کونے میں کرسی پر بیٹھی ایشاع حیدر نے اس کے چہرے کی جگمگاہٹ کو بڑی طمانیت سے دیکھا۔ یہی منظر دیکھنے کی خاطر ہی تو آج وہ بطور خاص چچی اماں کی طبیعت معلوم کرنے کے بہانے یہاں آئی تھی۔

''کانگریچولیشن اسبق!''

پیچھے سے آتی آواز پر اس نے گردن موڑ کر دیکھا تھا اور ایشاع حیدر کو سامنے پا کر اپنے بچوں جیسے انداز پر جھینپ سا گیا تھا۔

''نہ نہ مسکرایئے' خوشی کی بات پر جوش ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' اس کے لب بھینچ کر مسکراہٹ قابو میں کر لینے پر وہ اسے ٹوک گئی۔

''خوشی کے موقع پر اپنوں کی موجودگی انسان کے اندر کیسی ترنگ پیدا کر دیتی ہے۔'' بیرونی دروازے سے شہنی کے ساتھ اندر آتے بڑے ابا کی فیملی اور ایشاع حیدر کے صبیح چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے ایک پل کو اس نے سوچا تھا۔

''لیکن اپنوں میں ایشاع حیدر کا شمار کب سے ہونے لگا؟'' اس کے دماغ نے سرزنش کی۔

''جب سے، جب تم نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔'' دل نے دماغ کے بہت روکنے پر بھی پوری سچائی سے اعتراف کیا تھا۔

دل و دماغ میں ہوتی جنگ کو نظر انداز کر کے وہ بڑے ابا کی کھلی باہنوں میں جا سمایا تھا جو چہرے پر خوشی لیے آنکھوں کی نمی چھپاتے کبھی اسے تو کبھی مسکن دواؤں کے زیر اثر سوئے ہوئے اپنے بھائی کو محبت پاش نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''اور میں بڑے ابا کی بے غرض محبتوں کا احسان کیسے اپنے شانوں سے اتار پاؤں گا۔'' ان کی شفقت کے سائے تلے کھڑے اس نے سوچا تھا۔

☆☆☆

''بہت اچھی طرح سے آبزرو کیا ہے میں نے، اس ایک ہفتے میں اسبق کمال کو وہ واقعی بہترین ہے لیکن۔''

''لیکن کیا ڈیڈی!'' ڈیڈی کی زبان سے اسبق کی تعریف سن کر خوش ایشاع کو ان کے ''لیکن'' نے بے چین کر دیا تھا۔

''لیکن یہ بیٹا کہ وہ ہمارے اسٹیٹس سے بالکل میچ نہیں کرتا اسے اس مقام تک لانے میں کہ اسے تمہارے برابر کھڑا کیا جا سکے بہت وقت لگے گا تم اپنی ماما کو جانتی ہو وہ کبھی بھی تمہارے لیے کسی معمولی شخص کو قبول نہیں کریں گی۔''

''اسبق معمولی شخص نہیں ہے ڈیڈی! وہ بہت خاص ہے۔'' اس کے تڑپ کر بولنے پر وہ دھیرے سے مسکرائے۔

''خاص وہ تمہاری نظر میں ہے، اس لیے کہ وہ تمہیں اچھا لگتا ہے لیکن تمہاری ماما صرف اس شخص کو خاص مانتی ہیں جس کا بینک بیلنس ''خاصا'' ہو۔''

''میں کچھ نہیں جانتی ماما کی تھنکنگ کے بارے میں ان کے پاس تو انسانوں کو پرکھنے کا بس ایک ہی پیمانہ ہے ''پیسہ'' لیکن میں اپنی پسند کو ان کے نظریات کی بھینٹ نہیں چڑھنے دوں گی۔'' اس کے لہجے میں انہیں سرکشی کی بو محسوس ہوئی۔

''میں تم سے ان کی تھیوریز فالو کرنے کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں میرا مقصد تمہیں یہ سمجھانا ہے کہ اگر تمہیں کچھ حاصل کرنا ہے تو اپنی ماما سے الجھے بغیر اس کے لیے خاموشی سے کوشش کرنی ہو گی۔ فی الحال تم اپنی اسٹڈیز پر توجہ دو۔ ڈیڑھ سال کا ٹائم ہے ابھی تمہارے پاس اس دوران اسبق کو کس مقام تک پہنچانا ہے یہ سوچنا میری ذمہ داری ہے۔ ہاں یہ میرا وعدہ ہے کہ جو تم چاہو گی اس سے ہٹ کر کچھ نہیں ہو گا۔'' اپنے وعدے کی زنجیر سے انہوں نے! اس کی سرکشی کو قابو کیا تھا۔

''تھینک یو تھینک یو ویری مچ ڈیڈی! وہ ان کے گلے لگ گئی۔

"حیدر رضا کی بیٹی اس کی طرح اپنی محبت محروم نہیں رہے گی۔" وہ اس کے بالوں میں محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک عزم سے سوچ رہے تھے۔

چھبیس سال پہلے وہ خود بھی اپنی ایک غریب کلاس فیلو کے اسیر ہوئے تھے لیکن ان کے والد نے جب انہیں تمام جائیداد سے عاق کرنے کی دھمکی دی تو وہ اپنے فیصلے پر قائم نہ رہ سکے یوں ماریہ اظفر ماریہ رضا بن کر ان کی زندگی میں چلی آئیں۔ ماریہ جو ہائی سوسائٹی کی ایک لڑکی تھی اس کے ساتھ زندگی کا سفر طے کرتے ہوئے وہ بارہا پچھتائے تھے جو ان کے دل میں خوشی کی جوت نہ جگا سکی یہ دولت آخر کس کام کی ہے؟" یہ سوال پچھلے چھبیس سالوں میں لاکھوں بار انہوں نے خود سے پوچھا تھا اور ہر بار دولت کی قیمت پر پیار کا سودا کرنے پر اپنے آپ کو معتوب ٹھہرایا تھا۔

☆☆☆

وہ جس کامیابی سے ترقی کی منزلیں طے کر رہا تھا اس پر خوش تو تھا ہی لیکن ساتھ ہی حیران بھی قسمت اتنی مہربان ہو جائے گی یہ اس نے کبھی نہ سوچا تھا اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ بہت محنت اور لگن سے اپنے فرائض انجام دیتا تھا اور اس کے باس رضا صاحب اس سے خوش بھی بہت تھے ہر بار اس کی کسی کارکردگی کو سراہنے کے لیے جس طرح وہ اس کے لیے مراعات میں اضافہ کرتے تھے اس پر وہ دل سے ان کی سخاوت کا قائل ہوتا جا رہا تھا۔

آفس کی طرف سے ملنے والی گاڑی لگژری فلیٹ اس کے بدلتے حالات کی واضح علامتیں تھیں۔ رہائش کی تبدیلی جو مدحت کے نزدیک کم سے کم بھی پانچ سالہ منصوبہ تھا چھ ماہ کے قلیل عرصے میں انجام پا چکی تھی ماضی کی طرح اب بھی وہ لوگ ایک دوسرے کے ہمسائے تھے چونکہ یہ فلیٹس ایک نئی اسکیم میں شامل تھے اس لیے انہیں ایسا کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ (یہ اور بات کہ یہ ساری آسانیاں ایشاع حیدر کے سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ تھیں۔ وہ چاہتی تو اسبق کمال کے لیے فلیٹ کے بجائے کسی بنگلے کا انتظام بھی ہو سکتا تھا لیکن مدحت کی فیملی کے بغیر وہ کسی بھی جگہ شفٹ نہیں ہوگا یہ طے تھا



اس لیے اس نے جان بوجھ کر اس جگہ کا انتخاب کیا تھا تاکہ کسی کے پاس اعتراض کی کوئی گنجائش نہ رہے)۔

ترقی کی راہوں پر گامزن اسبق کمال اس وقت پی آئی اے کے ایک جہاز میں محو سفر تھا۔ کمپنی' تین ماہ کے ایک اسپیشل کورس کے لیے اسے جاپان بھیج رہی تھی وہ جانتا تھا کہ اس کورس کے بعد اس کا آگے کا سفر اور بھی زیادہ سہل ہوگا۔

کتنا سہل اس کا فیصلہ ابھی وہ نہیں کر سکا تھا شاید وہ اپنی ہر کامیابی کا ایشاع حیدر کی حیثیت کے ساتھ موازنہ کرنے لگا تھا جس کے بارے میں بس یہ جانتا تھا کہ وہ دولت کے جس مینار کی بلندی پر کھڑی ہے اسے چھونا بہت مشکل ہے۔

لیکن ایشاع حیدر کی آنکھوں میں ہر دم اس کی چاہت کا جو دیا جلتا تھا اس کی روشنیاں لپک لپک کر اسبق کمال کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کرتی تھیں کئی بار اس کا دل چاہا کہ اپنا وجود چاہت کی ان روشنیوں میں ڈبو دے انجام کی فکر کیے بغیر دل کے کہے راستے پر چل پڑے لیکن وہ اسبق کمال تھا انا اور خودداری کا مارا ایک روایتی مرد جو محبت کے وجود کو تسلیم تو کرتا تھا لیکن محبت کے ہاتھوں ہارنا ہرگز گوارا نہ تھا سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندتے ہی اس کا چہرہ نظروں کے سامنے روشن ہو گیا سب گھر والوں کے ساتھ وہ بھی اسے ایئرپورٹ پر چھوڑنے آئی تھی۔

یہ آنکھیں اس کی جدائی پر کتنی افسردہ ہیں اور خاموش لبوں پر اس کے لیے کتنی دعائیں مچل رہی ہیں وہ بن کہے ہی جانتا تھا۔

☆☆☆

وہ روشنیوں سے جھلملاتے اس لان میں بیزار سی ایک ٹیبل پر براجمان تھی۔ اردگرد جدید لباس میں خوشبوؤں سے مہکتی لڑکیوں اور خواتین کے مترنم قہقہے بکھرے ہوئے تھے۔ دل تو اس کا اس پارٹی میں آنے کو نہیں چاہ رہا تھا لیکن آج کل وہ ڈیڈی کی ہدایت کے مطابق ماما سے الجھے بغیر خاموشی سے اپنے لیے کسی بہتر وقت کا انتظار کر رہی تھی۔

اسی لیے جب ماما نے اسے رمیز موتی والا کے بیٹے کی لندن سے ایم بی اے کی

ڈگری لے کر آنے کی خوشی میں دی جانے والی پارٹی میں چلنے کو کہا تو وہ چاہتے ہوئے بھی انکار نہ کر سکی۔ مسز موتی والا ان کی خاص فرینڈ تھیں اور ان کی دعوت میں جانے سے انکار کرنا ماما کے ہاتھوں اپنی شامت لانے کے مترادف تھا۔

ماما بہت سوشل تھیں یہاں اس فنکشن میں بھی ان کے بے شمار جاننے والے تھے ایشاع کو ساتھ لیے وہ جانے کتنے مسٹر الاں اور مسز فلاں سے اس کا تعارف کروا چکی تھیں۔ مصنوعی محبتیں جھاڑتے قلعی شدہ چہروں سے اسے وحشت ہو رہی تھی چنانچہ جیسے ہی ماما کی توجہ اس کی طرف سے کچھ دیر کے لیے ہٹی وہ خاموشی سے انہیں باتیں کرتا چھوڑ کر وہاں سے کھسک گئی اب تنہا بیٹھے اسے بے شک بوریت تو ہو رہی تھی لیکن قسم قسم کے نمونوں سے مل کر اپنا موڈ خراب کرنے سے یہ کہیں بہتر تھا۔

موڈ تو خیر اس کا شرمین سکندر کو دیکھ کر بھی بہت خراب ہوا تھا' جو جارجٹ کی نہایت باریک ساڑھی پر سلیولیس' نہایت بڑے گلے اور انتہائی چھوٹے سائز کا بلاوز پہنے ذیشان حیدر کے پہلو سے لگی ہر ایک سے بے باکی سے ملتی پھر رہی تھی۔ ذیشان حیدر کو عریانیت کے اس چلتے پھرتے اشتہار کے ساتھ خوشی خوشی گھومتے دیکھ کر اس کے ذہن میں بار بار اسبق کمال آجاتا جو کسی اجنبی لڑکی کو بھی اپنے ساتھ بے پردہ چلتے دیکھنے کا روادار نہیں تھا۔

☆☆☆

''دیکھی آپ نے اپنی لاڈلی بیٹی کی حرکت؟'' مسز رضا گھر میں داخل ہوتے ہی حیدر رضا سے جارحانہ انداز میں مخاطب ہوئی تھیں۔

راستے میں بھی شاید انہوں نے ڈرائیور کی موجودگی کی وجہ سے برداشت سے کام لیا تھا ورنہ ان کے چہرے پر غیظ وغضب کے آثار تو وہ باپ بیٹی راستے بھر دیکھتے ہی آئے تھے۔

''کیوں' کیا' کیا میری بیٹی نے' جو آپ اتنی برہم ہیں؟'' ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کر کے وہاں لاؤنج میں ہی ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے نہایت اطمینان سے پوچھا تھا۔

''کیا نہیں کیا' یہ پوچھیں' خاص طور پر آج کے فنکشن میں اسے لے کر گئی تھی تا کہ رمیز موتی والا کے بیٹے فائز سے ملوا سکوں۔ لیکن یہ اس سے ملتی اسے دکھائی دیتی تو ہی وہ اسے پسند بھی کرتا۔ یہ تو نہ جانے کس کونے میں جا کر بیٹھ گئی تھی۔ آخر تک نظر نہیں آئی سب لوگوں کو چھوڑ کر اسے ڈھونڈنا بھی معیوب لگ رہا تھا۔ ادھر وہ مسز منیر کی بہن ایسی چپکی فائز کے ساتھ کہ سب کا پتہ کاٹ دیا۔ اب دیکھیے گا دو چار دن میں کوئی نیوز سننے کو مل جائے گی زمانہ اتنا ایڈوانس ہو گیا ہے اور ہماری بیٹی پتہ نہیں کیا سوچے بیٹھی ہے۔'' وہ سخت خفا لگ رہی تھیں۔

حیدر رضا نے ایک نظر سر جھکائے کھڑی ایشاع پر ڈالی اور پھر اسے اپنے کمرے میں جانے کا حکم دے کر غصے سے بے قابو ہوتی بیوی کی طرف متوجہ ہوئے۔

''ایشاع میری بیٹی ہے۔ اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا ماریہ! اسے سجا بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور موتی والا جیسے لوگوں کے سامنے تو ہرگز بھی نہیں ابھی جو تم سمجھ رہی ہو کہ مسز منیر کی بہن نے اسے اپنا اسیر کر لیا ہے خود چند دن بعد اسے کسی اور لڑکی کے ساتھ دیکھو گی۔ بیرون ملک سے اعلیٰ ڈگری لینے اور باپ کی بے تحاشا دولت سے کسی شخص میں شخصی اوصاف نہیں پیدا ہو جاتے۔ اصل چیز انسان کا کردار ہوتا ہے۔ جس کی فائز موتی والا کے پاس شدید کمی ہے اگر مجھے پتا ہوتا کہ تم اس مقصد کے لیے ایشاع کو وہاں لے جا رہی ہو تو ہرگز تمہیں اس کی اجازت نہیں دیتا۔''

''اور ہاں ایک بات اور آئندہ جب بھی ایشاع کے حوالے سے کچھ سوچو تو میری مرضی ضرور معلوم کر لینا' بیٹے کی طرح بیٹی کی زندگی کا فیصلہ تنہا کر لینے کا حق میں تمہیں بالکل نہیں دوں گا۔'' ایشاع سے متعلق اپنا نقطہ نظر بتاتے بتاتے آخر میں ان کا لہجہ کچھ تنبیہی ہو گیا تھا۔

☆☆☆

''مدحت اب تک ہمارے پاس کتنے پلانٹس کا کلیکشن ہو گیا ہو گا؟''

پیٹری ڈش کو مائیکرو اسکوپ کے نیچے رکھ کر ایک ہفتہ پہلے کلچر کیے فنگس کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''ستر کے قریب فیملیز تو جمع ہوگئی ہوں گی۔''مدحت نے مصروف انداز میں جواب دیا۔

''پھر کیا خیال ہے کل سے ہربیریم شیٹس کی تیاری شروع کردیں۔وقت کم رہ گیا ہے۔وائیوا والے دن جمع کروانی ہوں گی۔''

''ہاں کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔تمام پلانٹس کو اسکوائش ٹیپ سے چپکانے اور ان کی Classifcation لکھنے میں کافی وقت لگ جائے گا۔بلکہ میرے خیال میں الگ الگ بیٹھ کر تو ہم لوگ اسے کر بھی نہیں سکیں گے کیونکہ بعض فیملیز کو شناخت بھی کرنا ہے ابھی۔ایسا کرو کل تم میرے گھر رکنے آجانا۔شہنی کو بھی اپنے ساتھ لگالیں گے تو کام ذرا تیزی سے ہوجائے گا۔''مدحت نے گویا اس کے دل کی بات کی تھی۔

''کل رات کی فلائٹ سے اسبق کمال واپس آرہا ہے۔''یہ اطلاع صبح ہی ڈیڈی نے اسے فراہم کی تھی۔تین ماہ کا طویل عرصہ اسے دیکھے بغیر گزر گیا تھا۔اب وہ جلد از جلد اسے دیکھنا چاہتی تھی۔

فلائٹ چونکہ رات کی تھی اس لیے وہ صرف مدحت سے ملنے کے بہانے وہاں نہیں جاسکتی تھی۔ادھر اپنی واپسی کی خبر کو اس نے گھر والوں سے بھی پوشیدہ رکھا تھا کیونکہ وہ ان لوگوں کو سرپرائز دینا چاہتا تھا البتہ آفس میں اطلاع دینا مجبوری تھی سو اس نے رضا صاحب کو فون پر اطلاع کردی تھی۔

''ٹھیک ہے' کل میں ڈیڈی سے پوچھ کر آؤں گی۔پھر یہیں سے سیدھے تمہاری طرف چلیں گے۔''اپنی خوشی سے بے قابو ہوتی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے اس نے بظاہر بڑی بے نیازی سے کہا تھا اور فوراً ہی خان صاحب (لیب اٹینڈنٹ) کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔تاکہ ان سے سلائیڈز منگوا سکے۔

مدحت اپنی تجویز پر اس کے اتنی آسانی سے مان جانے پر آنکھوں میں خوشگوار



حیرت لیے اس کی طرف دیکھنے لگی جب سے وہ لوگ نئے گھر میں شفٹ ہوئے تھے وہ معمول سے کہیں زیادہ ان کے گھر آنے لگی تھی۔بلکہ اس کی حیثیت گھر کے فرد کی سی ہوگئی تھی۔لیکن رات کو رکنے کی خواہش پر اس نے کبھی ہامی نہیں بھری تھی۔

اس نے مدحت کی ٹٹولتی نظروں کو خود پر محسوس تو کیا لیکن انجان سی بن کر کام میں مصروف ہوگئی۔

☆☆☆

''تمہیں سب سے زیادہ کیا چیز پسند ہے ایشاع؟''

رات کام کرتے کرتے جب وہ تینوں اکتا گئیں تو کچھ دیر سستانے کی غرض سے بالکونی میں آکھڑی ہوئیں یہاں ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے کھاتے پورے چاند کا نظارہ کرنا بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔

''خوشبو.....''مدحت کے سوال کے جواب میں اس نے ایک لمحہ بھی نہیں سوچا تھا۔

''پھر.....؟''

گیت (نہایت جذب سے جواب دیا)

''پھر.....؟''

''ہوا.....''لہجہ ہواؤں کی طرح ہی سبک تھا۔

''پھر.....؟''

''پانی.....!''

''پھر.....؟''مدحت شاید شرارت کے موڈ میں تھی۔

''رنگ.....!''جیتی جاگتی چیزوں میں سے بھی کچھ پسند ہے آپ کو؟''پیچھے سے آتی اسبق کمال کی گمبھیر آواز نے ان تینوں کو چونکا دیا تھا۔

شہنی تو ''بھائی'' کا نعرہ لگاتی فوراً ہی اس کے سینے سے جا لگی تھی۔وہ بھی اپنا دایاں بازو محبت سے اس کے گرد لپیٹے مسکرا رہا تھا جب کہ نظریں سامنے کی طرف اٹھ گئی

تھیں۔اس پری وش کو دیکھنے کی خواہش اپنی سرزمین پر پہلا قدم رکھتے ہی اس کے دل میں ابھری تھی اور یوں یہ دعا پوری ہو جائے گی ایسا تو اس نے تب بھی نہیں سوچا تھا جب وہ نیچے سے بالکونی میں موجود تین سایوں کو دیکھ کر سیدھا یہاں چلا آیا تھا۔

''جواب نہیں دیا آپ نے میری بات کا۔جیتی جاگتی چیزوں میں سے بھی کچھ پسند ہے آپ کو؟''دل اتنے دنوں بعد اسے دیکھ کر کچھ شوخی پر مائل تھا سو اپنے ازلی گریز پا انداز کو بھلائے وہ اس سے مخاطب تھا۔

''یہ ساری بے جان چیزیں اپنے اندر کسی زندہ چیز کا عکس لیے ہوئے ہیں' تب ہی تو اچھی لگتی ہیں۔''اس نے ایک جملے میں سب کچھ سمیٹ دیا تھا۔

''بھائی!آپ بتائیں آپ کو کیا چیز سب سے زیادہ پسند ہے؟''شہنی نے ایک جوش سے اس کا بازو ہلاتے ہوئے سوال کیا۔

''مجھے''وہ ایک پل کے لیے رکا اور پھر آسمان کی جانب ہاتھ بلند کر کے انگلی سے اشارہ کیا۔

''وہ......''

''چاند پسند ہے آپ کو۔''اس کی انگلی کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے شہنی نے تصدیق چاہی۔

اس نے نفی میں گردن ہلا دی اور بولا۔

''وہ جو چاند کے پاس چمکتا ننھا سا تارا ہے۔''

''پھر......؟''مدحت نے شریر سے انداز میں دوبارہ اپنی گردان شروع کرنی چاہی۔

''اس تارے کے علاوہ آسمان پر اور جتنے بھی تارے ہیں۔''

''اسبق!تم تو ایشاع سے بھی زیادہ ہو۔ایک تو اتنے روشن چاند کو چھوڑ کر ٹمٹماتا ننھا ستارہ پسند ہے۔اس پر اس کے بعد بھی باقی ماندہ ستارے ہی پسند ہیں۔ایشاع کی پسند میں کم از کم ورائٹی تو ملتی ہے۔''



اس کی ذہنی حالت پر شبہ کرتی مدحت کچن کی طرف چل دی تاکہ لمبے سفر سے لوٹنے والے مسافر کی خاطر مدارات کا کچھ بندوبست کر سکے مدد کے خیال سے شہنی بھی اس کے پیچھے ہی چلی گئی تھی۔

''آپ کو پتہ ہے ایشاع!مجھے وہ ننھا تارہ اور اس کے بعد وہ سارے جھلملاتے تارے کیوں پسند ہیں؟''ریلنگ پر بازو ٹکائے وہ آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ایشاع حیدر تو اس کے خود سے ہم کلام ہونے پر ہی حواس کھو رہی تھی اس کے سوال کا جواب کیا خاک دیتی وہ بھی جانے کس موڈ میں تھا کہ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر خود ہی بولنا شروع ہو گیا۔

''وہ جو چاند کے پاس ننھا تارا ہے نا۔مجھے لگتا ہے وہ چاند کو اس کی اصلیت بتا رہا ہو۔چاند تو سورج کی روشنی مستعار لیتا ہے تب کہیں چمکنے کے لائق ہوتا ہے جب کہ اس ستارے کی اپنی ایک حیثیت ہے۔بغیر کسی دوسرے کی مدد کے اس نے اپنے وجود کو قائم رکھا ہوا ہے تب ہی تو بے تحاشا روشن چاند کی موجودگی میں بھی سب اسے محسوس کر لیتے ہیں۔''

اپنا عجیب وغریب فلسفہ بیان کرتے ہوئے اس نے اپنا رخ موڑا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بات کو آگے بڑھایا۔

''اور باقی سارے تارے اس لیے پسند ہیں کہ وہ صرف آسمان پر ہی نہیں بلکہ کسی کی آنکھوں میں بھی جھلملاتے ہیں۔''

جواب میں وہ اپنی آنکھوں میں اترتے ستاروں کے قافلوں کو اس کی نظر سے چھپانے کے لیے رخ موڑ گئی تھی۔

☆☆☆

مدحت کے بھائی نادر کی پاکستان آمد کے ساتھ ہی یکدم ان کے گھر میں شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے تھے پچھلے ماہ جب انہوں نے اپنی آمد کی اطلاع کے ساتھ شادی کی منظوری دی تو عافیہ بیگم نے جھٹ اپنی بڑی بیٹی فرحت کی نند سے ان کا رشتہ طے کر

ڈالا ۔ایک تو خود انہیں وہ لڑکی پسند تھی دوسرے گھر گھر جا کر لڑکی کی تلاش کرنا ان کے شوہر اقبال احمد کو سخت ناپسند تھا۔

شادی کی زیادہ تر تیاریاں مدحت ایشاع کے ساتھ مل کر رہی تھی شہنی تو چچا ابا اور چچی کی بیماری کی وجہ سے گھر سے نکلنا تقریباً چھوڑ ہی چکی تھی ۔یہاں تک کہ بی اے بھی پرائیویٹ ہی کر رہی تھی ۔جہاں تک بڑی دونوں بہنوں کا سوال تھا تو فرحت آپا تو لڑکی والے ہونے کی وجہ سے خود بخود ہی یہاں کی ذمہ داریوں سے بری الذمہ قرار دی جا چکی تھیں ۔جب کہ رفعت آپی کے تینوں بچے اس قدر قیامت تھے کہ انہیں ساتھ لے کر بازار جانا یا امی کی نگرانی میں گھر چھوڑ دینا دونوں ہی صورتیں امن وامان کی صورتحال کو خطر ناک بنا دینے کے مترادف تھیں۔

اب نتیجتاً مدحت کی جان ناتواں تھی اور ایشاع حیدر کا ساتھ چونکہ وہ لوگ پری پولیس کے ایگزامز دے کر فارغ ہو چکی تھیں اور فائنل کی کلاس نئی نئی اسٹارٹ ہونے کی وجہ سے پڑھائی کا زیادہ بوجھ نہیں تھا اس لیے ان ساری سرگرمیوں کو انجام دینے میں زیادہ وقت پیش نہیں آرہی تھی۔

آج بھی وہ لوگ خریداری کر کے واپس آنے کے بعد ایک ایک چیز امی چچی اور شہنی کو دکھا رہی تھیں ۔ہر شے اتنی خوبصورت تھی کہ ہر بار ان کی زبانوں سے بے اختیار ''ماشاء اللہ'' کے الفاظ نکل جاتے تھے۔

''اور آنٹی !یہ دیکھیں یہ سوٹ کتنا خوبصورت ہے ۔''ایشاع نے ستاروں بھر ایک آسمانی دوپٹہ اٹھا کر اپنے دائیں بازو پر پھیلایا۔

اسبق کمال جو اپنی ہی دھن میں موبائل پر کسی سے بات کرتا اندر داخل ہوا تھ یکدم ٹھٹک کر رک گیا ۔لائن پر دوسری طرف موجود شخص اس سے کیا کہہ رہا تھا اسے بالکل خبر نہیں تھی وہ تو بس اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جس نے اپنے دائیں بازوں پر گو ستاروں سے بھرا آسمان سجا رکھا تھا ستاروں کی چمک کا عکس چہرے پر پڑنے سے اس ک حسن کچھ اور خیرہ کن ہو گیا تھا۔نہ جانے یہ لڑکی اپنے اندر کتنے ڈھیروں روپ چھپائے



بیٹھی تھی کہ اسبق کمال جیسا دل پر قابو رکھنے والا شخص بھی بار بار اس کے سامنے ٹھٹک کر رک جانے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

''آؤ آؤ ،اسبق بچے !یہاں میرے پاس آکر بیٹھو۔دیکھو تو یہ بچیاں تمہاری بھابھی کے لیے کیا چیزیں لے کر آئی ہیں۔'' سب سے پہلے امی کی نگاہ اس پر پڑی اور انہوں نے فوراً اسے پکار لیا۔

''ایک کپ گرم گرم چائے تو پلا دو شہنی !بہت تھک گیا ہوں ۔''ان کے برابر بیٹھ کر صوفے کی بیک سے ٹیک لگاتے ہوئے اس نے آنکھیں موندلیں۔

''ابھی دو منٹ میں لاتی ہوں بھائی ۔''شہنی جھٹ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''بہت کمزور ہو گیا ہے میرا بیٹا' محنت بھی تو دن رات کرتا ہے۔'' امی نے محبت سے اس کے گھنے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔

ایشاع نے دوپٹے کو تہ کر کے ڈبے میں واپس رکھتے ہوئے ایک چور نظر اس پر ڈالی جس کے چہرے پر تھکن سے زیادہ اندرونی کشمکش کے آثار تھے ورنہ جاپان سے واپس آنے کے بعد سے اس کی وجاہت میں پہلے سے کہیں زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

''ایشاع! کہاں جا رہی ہو تم ؟'' گلاس ڈور کھول کر باہر نکلتی ایشاع کے قدم ماما کی آواز نے روک لیے۔

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ اسے اوپری منزل سے نیچے آتے زینے کی تیسری سیڑھی پر کھڑی نظر آئیں ۔ان کے بالوں میں رولر اور چہرے اور بازوؤں پر بلیچ کریم لگی ہوئی تھی ۔بچپن سے انہیں اس طرح کے حلیے میں دیکھتے رہنے کے باوجود نہ جانے کیوں اسے ان کا یہ روپ آج بہت مضحکہ خیز لگا۔

اس کی نظروں میں مدحت کی امی اور چچی کے سراپے گھوم گئے تھے جنہوں نے اپنے گھر کی تقریبات میں بھی سادگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔

"کچھ پوچھ رہی ہوں میں تم سے؟" بنا کوئی جواب دیے اسے خاموشی سے اپنی جانب تکتے دیکھ کر وہ جھنجلا گئیں۔

"ماما! آپ کو بتایا تو تھا مدحت کے بھائی کی شادی ہو رہی ہے آج ولیمہ ہے اقبال انکل خود دعوت دے کر گئے تھے سب کو بلکہ ڈیڈی کو ریا جانے سے پہلے آپ سے شرکت کے لیے کہہ کر بھی گئے تھے۔" اس نے کچھ روٹھے روٹھے لہجے میں جواب دیا۔

"او کے' تم جاؤ مجھے تو مسز راجا کے ہاں گیٹ ٹو گیدر میں جانا ہے۔"

ان کی طرف سے سوال جواب کا سلسلہ ختم ہوتے ہی وہ باہر نکل گئی۔ مدحت کے بھائی کے ولیمے میں شریک ہونا وہ قطعی گوارا نہیں کریں گی۔ یہ بات وہ پہلے ہی سے جانتی تھی اس لیے اس نے یاددہانی بھی نہیں کروائی انہیں تو اس کا بھی اس قدر ان لوگوں سے گھلنا ملنا پسند نہیں تھا لیکن حیدر رضا کی حمایت کی وجہ سے خاموش ہو جاتی تھیں۔

حیدر رضا کو اسبق اور اقبال صاحب دونوں نے ہی الگ الگ انوائٹ کیا تھا۔ لیکن انہوں نے اپنے ایک ہفتے کے لیے کوریا جانے کا بتا کر ان سے معذرت کر لی تھی ویسے بھی حالات کی اس نہج پر جب کہ اسبق ابھی مکمل طور پر اپنا کیریئر نہیں بنا پایا تھا۔ ان کا ایشاع کے ڈیڈی کی حیثیت سے متعارف ہو جانا کچھ مناسب نہیں تھا اتنے عرصے میں وہ خود بھی اسبق کمال کے مزاج کو اچھی طرح سمجھ چکے تھے اور جانتے تھے کہ اگر اسے ذرا بھی ایشاع اور ان کے مابین رشتے کی بھنک مل گئی تو وہ خود کو ملنے والی ہر رعایت کو ایشاع کی عنایت سمجھ کر اپنا کیریئر داؤ پر لگا دے گا۔ انہیں وہ ذہین سا لڑکا اپنی تمام تر خودداری سمیت بہت پسند آیا تھا اور ایشاع کے حوالے سے تو وہ اسے بہت ہی عزیز رکھتے تھے۔

☆☆☆

"تھینک یو ویری مچ ایشاع۔" اپنے پیچھے سے آتی آواز پر اس نے رخ موڑ کر یہ دیکھنے کی ضرورت قطعی محسوس نہیں کی کہ یہ الفاظ کس نے اور کیوں ادا کیے ہیں کیونکہ جواب اسے خود بہت اچھی طرح معلوم تھا۔

آج سہ پہر اس نے جب کوریئر سروس سے آنے والے بے نام پیکٹ کو کھولا تھا



تو اس میں سے برآمد ہونے والے آسمانی ستاروں بھرے آنچل کو دیکھ کر اس کے ذہن میں صرف ایک نام آیا تھا۔ "اسبق کمال"

اور اس اندازے کی تصدیق بھی اس سوٹ کے ساتھ ہی برآمد ہونے والے ایک چھوٹے سے کاغذ پر لکھے جملے سے ہو گئی تھی۔

"آنکھوں میں جھلملاتے ستارے چھپائے رکھنے والی لڑکی اگر یہ تاروں بھرا آنچل اوڑھ لے تو اس کے سامنے آسمان کا حسن کیسے ماند پڑ سکتا ہے۔ آج میں یہ نظارہ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اور ولیمے کی تقریب میں شریک مسرور سی ایشاع اس وقت خود کو روئے زمین کی سب سے خوش قسمت لڑکی تصور کر رہی تھی۔

"آج تو میری نگاہ آسمان کی طرف اٹھ ہی نہیں رہی میں اس کے حسن کو ماند پڑتا کیسے دیکھوں؟" اس کے بے چارگی سے کہنے پر وہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف پلٹی تو خود کئی لمحوں تک بنا پلکیں جھپکائے مبہوت کھڑی رہ گئی۔

بلیک ڈنر سوٹ میں اپنی گھور سیاہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتا۔ ہونٹوں پر دلکش سی مسکراہٹ لیے وہ خود کوئی دیوتا لگ رہا تھا۔

☆☆☆

دن بڑے بیزار اور تھکے تھکے سے ہو گئے تھے جب سے شرمین سکندر شرمین ذیشان بن کر رضا ہاؤس میں آئی تھی گھر سے سکھ چین بالکل ہی ختم ہو چکا تھا اس پر اسبق کمال کی جدائی نے ایشاع حیدر کے دل کو بالکل ہی بے سکون کر ڈالا تھا۔ ڈیڈی پھر کسی کورس کے سلسلے میں اسے چھ ماہ کے لیے کوریا بھیج چکے تھے۔ اگر اس کا کیریئر بنانے کا مسئلہ نہ ہوتا تو وہ کبھی یہ جدائی گوارا نہ کرتی اقرار کے لمحوں سے گزرنے کے بعد تو یہ سب بہت ہی مشکل لگ رہا تھا۔

اور دوسری طرف اسبق کمال سا کٹھور' اصول پرست شخص تھا جس نے کسی فون کال ای میل یا خط کا سہارا نہ لیا تھا وہ جانے سے پہلے جو کچھ کہہ گیا تھا وہی حرف بہ حرف

ایشاع کو یاد تھا اس نے کہا تھا۔

"تم کون ہو، تمہارے پاس کتنی پراپرٹی ہے۔ مجھے اس سب سے کوئی سروکار نہیں میں تمہیں بس ایک ایسی لڑکی حیثیت سے جانتا ہوں جو مدحت کی دوست ہے اور ہم لوگوں کے ساتھ بالکل ہماری طرح گھل مل کر رہتی ہے۔ لیکن کسی کے گھر چند گھنٹے خوش اسلوبی سے گزار لینے کے مقابلے میں پوری زندگی گزارنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ وہ بھی ایسی صورت میں کہ تمہیں وہ ساری سہولیات جو اپنے گھر میں میسر ہیں یہاں نہ تو مل سکیں گی اور نہ ہی اپنے ساتھ لانے کی اجازت ہوگی اگر میں بہت سادہ سے الفاظ میں بتاؤں تو میری بات کا صرف اتنا مطلب ہے کہ تمہیں اپنی بے شمار دولت اور اسبق کمال میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ میں چھ مہینے کے لیے تم سے دور جا رہا ہوں اس عرصے میں نہ تو میں تم سے کوئی رابطہ کروں گا اور نہ ہی تم ایسا کرنا واپس آنے پر اگر تمہارا انتخاب میں ہوا تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی اور اگر تم ایسا نہ کر سکیں تو بھی مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں ہو گا۔"

اور ایشاع حیدر کو تو اپنا فیصلہ سنانے کے لیے چھ ماہ تو کیا چھ پل بھی درکار نہ تھے لیکن وہ اس کا جواب سننے کے لیے اسے چھ ماہ کا پابند کر گیا تھا تو اسے کسی نہ کسی طرح یہ وقت بہر صورت گزارنا ہی تھا۔

اور یہ چھ ماہ گزارنا اتنا دشوار نہ ہوتا جو ثمرین سکندر کو اپنی زندگیوں میں تلخی گھولنے کے لیے وہ لوگ اپنے گھر نہ لے آتے پتہ نہیں وہ کس قسم کی لڑکی تھی اور اپنے ارد گرد والوں سے کیا چاہتی تھی کہ کسی طرح مطمئن ہی نہیں ہوتی تھی اسے ذیشان حیدر سے ہٹ کر یہ گھر اور اس میں رہنے والا ہر شخص برا لگتا تھا اس کے نزدیک ذیشان حیدر اس کی وہ پراپرٹی تھا جیسے کسی سے شیئر کرنے کے لیے وہ ہرگز تیار نہیں تھی اسے اس کا کبھی کبھی ماما کے ساتھ بیٹھ کر پانچ دس منٹ گزار لینا یا ایشاع کی طرف مسکرا کر دیکھ لینا تک برداشت نہیں ہوتا تھا۔ اور ذیشان حیدر جو شادی سے پہلے ہی اس کے شاروں پر چلنا سیکھ چکا تھا اب بالکل بے دام غلام بنتا جا رہا تھا۔



اس دن بھی جانے کس بات پر اس کا موڈ آف ہوا اور اس نے چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔ اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ ہرگز بھی ایسے نہیں تھے جنہیں سن کر کوئی شخص یقین کر سکے کہ یہ لڑکی ایک کوالیفائیڈ ڈاکٹر اور کسی اعلیٰ خاندان کی فرد ہے۔

گھر کی اس مکدر فضا کو دیکھ کر حیدر رضا نے ذیشان حیدر کو ڈیفنس والے بنگلے میں شفٹ ہونے کہہ دیا تھا اور شاید وہ لوگ بھی اس بات کے خواہش مند تھے سو خاموشی سے اپنا سب کچھ سیٹ کر لے گئے۔

ماریہ جو اعلیٰ سوسائٹی کی حد درجہ دلدادہ تھیں اور اپنا ہر کام اسی سوسائٹی کے طے کردہ اصولوں کے مطابق انجام دیتی تھیں۔ اس وقت بالکل کسی مڈل کلاس گھرانے کی ماں کی طرح بے چین ہو گئی تھیں۔ اپنی اولاد سے بہت زیادہ محبت کا اظہار کرنا یا اس پر توجہ دینا یقیناً ان کی کلاس کی ماؤں کا طریقہ نہیں تھا۔ لیکن خود کو اپنی اولاد کی محبت سے آزاد کر لینا کچھ ایسا آسان بھی نہیں ہوتا۔ ایک شہر میں رہتے ہوئے بھی بیٹے کا الگ گھر میں رہنا شاید ان کے لیے اتنا بڑا صدمہ نہ ہوتا جتنا اس کا ملنے تک کے لیے نہ آنا انہیں ناگوار گزرتا تھا حالانکہ وہ آفس بدستور جا رہا تھا اور وہ تو اسے جانا ہی تھا کہ اتنی بڑی پراپرٹی سے دستبردار نہیں ہوا جا سکتا تھا۔

اور دل نے تو ان کے جب دھڑکنے سے انکار کر دیا تھا جب ان کی بہو ذیشان حیدر کی موجودگی میں ایک پارٹی میں بیٹھی ان کے نامعلوم مظالم اور ایشاع حیدر کے خود ساختہ افیئرز کی داستان سنا رہی تھی۔

"کیا کوئی شخص اس حد تک بھی جھوٹ بول سکتا ہے اور کیا اپنی سگی اولاد کا خون بھی اتنا سفید ہو سکتا ہے؟" اپنی رکتی سانسوں کو بحال کرنے کی کوشش کرتے ہوئے انہوں نے خود سے پوچھا تھا۔

ہاسپٹل کے ٹھنڈے برآمدے میں آئی سی یو کے سامنے کھڑی اپنی ماما کی زندگی کے لیے دعا مانگتی ایشاع حیدر نے اس پل زندگی میں پہلی بار کسی سے شدید نفرت محسوس کی تھی پارٹی میں ماما کو کیا صورتحال پیش آئی تھی کہ انہیں وہاں سے سیدھا ہاسپٹل پہنچانا

پڑا۔ یہ سب وہ مسز منیر کی زبانی سن چکی تھی۔ جنہوں نے شرمین اور ذیشان حیدر کے پیچھے کھڑی ماریہ رضا کو سفید چہرے کے ساتھ دل پکڑ کر گرتے سب سے پہلے دیکھا تھا۔

نظر تو اس نے کچھ فاصلے پر سر جھکائے کھڑے ذیشان حیدر پر بھی ڈالنا گوارا نہیں کی تھی جو اس کی ماں کو اس حال تک پہنچانے میں برابر کا شریک تھا۔

☆☆☆

"آخر ایک معمولی ورکر کو اتنی سہولیات دینے کی کیا وجہ ہے؟" ذیشان حیدر باپ کے سامنے بیٹھا ان سے ان کے کیے ہوئے فیصلوں کا حساب مانگ رہا تھا۔ شرمین کی خصوصی ہدایت پر اس نے تمام ملز اور فیکٹریوں کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات میں دخل دینا شروع کر دیا تھا۔ اور اسبق کمال کو دی جانے والی تمام مراعات اتنی غیر معمولی تو تھیں کہ وہ چونک اٹھا۔ سو اب سوال لیے ان کے سامنے بیٹھا تھا۔

"معمولی ورکر نہیں بلکہ میرا ہونے والا داماد ہے اسبق کمال! جتنا تمہارا حق ہے اس جائیداد پر اتنا ایشاع کا بھی ہے اور ایشاع کا ہونے والا شوہر یہ سب ڈیزرو کرتا ہے اس سے تم انکار نہیں کر سکو گے۔" ذیشان حیدر کو اطمینان سے جواب دیتے ہوئے حیدر رضا بالکل فراموش کر چکے تھے کہ اسبق کمال ان کے آفس سے متصل ریکارڈ روم میں موجود ہے۔

اور جھٹکا تو اصل میں ریکارڈ روم کا دروازہ کھول کر آفس میں داخل ہوتے اسبق کمال کے اعصاب کو لگا تھا۔ امیر گھرانے کی پروردہ ایشاع حیدر 'رضا گروپ آف انڈسٹریز کے مالک حیدر رضا' ان کا بیٹا ذیشان حیدر کتنی سیدھی سادی کڑیاں تھیں۔ جنہیں وہ جوڑ نہ سکا تھا۔

ابھی ایک ہفتے پہلے ہی تو وہ کوریا سے واپس آیا تھا اور اس دوران ایشاع حیدر کو غیر حاضر پا کر بنا کسی سے اس کے بارے میں پوچھے اس نے اپنے طور پر فیصلہ کر لیا تھا کہ ایشاع حیدر نے اسبق کمال اور دولت میں سے دولت کا انتخاب کر لیا ہے۔ جب ہی تو اماں کے مدحت کے بارے میں رائے لینے پر انہیں انکار نہ کر سکا اور صبح ہی انہیں اپنی رضا مندی سے آگاہ کر آیا۔ دل تو اس فیصلے پر پہلے ہی دہائیاں دے رہا تھا اور اب جو انکشافات اس پر ہوئے تو اس کی پوری ہستی زلزلوں کی زد میں آ گئی تھی۔

حیدر رضا کی خود پر نظر پڑتے اور انہیں گھبراتے اس نے دیکھا تو تھا لیکن اپنے اندر اٹھتے غیظ و غضب کے طوفان نے اسے بھی مزید ایک لمحہ وہاں رکنے نہ دیا۔ وہ فل اسپیڈ میں گاڑی دوڑاتا ایشاع حیدر کے گھر کے سامنے جا رکا تھا۔

اور اب تیوری پر بل ڈالے اپنے تنے ہوئے اعصاب کے ساتھ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ جو شاید اسے اچانک سامنے پا کر خوشی سے اتنی مدہوش ہو گئی تھی کہ اس کے تیور نہ پہچان سکی۔ ماما کی طبیعت کی وجہ سے وہ گھر سے نکلنا بالکل ترک کر چکی تھی۔

"کس قیمت پر اسبق کمال کو خریدنے کی پلاننگ کی تھی تم باپ بیٹی نے؟" غصے سے لب بھینچتا شاید وہ اسے مار ڈالنے کا ارادہ ہی رکھتا تھا۔

"کک...... کیا کہہ رہے ہیں یہ آپ؟" اس کی نظروں میں موجود سفاکی کو محسوس کر کے ایشاع حیدر کے اعصاب معطل ہونے لگے۔

"کیا کہہ رہا ہوں یہ مجھ سے پوچھتی ہو؟ تمہیں خود نہیں پتا کہ تم نے کیا کیا ہے؟ تم نے اپنی دولت کے سہارے اسبق کمال کو خریدنے کی کوشش کی ہے۔ تم نے اسبق کمال کے اصولوں کو توڑا ہے۔ اس کی انا کو شکست دینے کی کوشش کی ہے تم پیسے والوں کے نزدیک ہر چیز بکاؤ ہے۔ تم لوگ محبت کو محبت سے حاصل کرنے کی نہیں بلکہ خریدنے کی کوشش کرتے ہو۔

"پر تم سن لو ایشاع حیدر! جو تمہاری دولت کے عوض تمہیں مل جائے وہ شخص اسبق کمال نہیں ہو سکتا۔ دو دن بعد میری مدحت سے منگنی ہے تم ضرور شریک ہونا۔" وہ جیسے کوئی دھماکہ کر کے وہاں سے جا چکا تھا۔

"کیا اسبق کمال کے بغیر بھی دنیا میں رہا جا سکتا ہے؟" گلاس ڈور سے باہر کی طرف جاتے دیکھ کر ایشاع حیدر نے خود سے سوال کیا تھا۔

اور دل کے بہت شدت سے نفی میں جواب دینے پر اپنے سامنے موجود ہر شے

کو دھندلا کر تاریکی میں ڈوبتے محسوس کر کے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

☆☆☆

بڑے ابا کا جواب سن کر وہ ششدر رہ گیا۔

ابھی ابھی اس کے سامنے ہی ابا نے ان سے اسبق کے لیے مدحت کا ہاتھ مانگا تھا اور انہوں نے ایک پل کے لیے بھی سوچے بغیر انکار کر دیا تھا۔

''مگر کیوں بھائی صاحب؟'' کمال احمد نے حیرت سے اپنے بڑے بھائی کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''اس لیے کہ مجھے اسبق کی خوشی عزیز ہے اور اسبق مدحت کے ساتھ خوش نہیں رہ سکے گا بلکہ میرا خیال ہے ایک کے سوا دنیا کی کسی بھی لڑکی کے ساتھ خوش نہیں رہ سکے گا۔'' انہوں نے نہایت اطمینان سے جواب دیا تھا۔

''کس لڑکی کی بات کر رہے ہیں آپ؟ کمال احمد کی الجھن کچھ اور بڑھ گئی۔

''اس کا جواب تو تمہیں اسبق ہی دے گا۔'' انہوں نے بات کا رخ اس کی طرف کر دیا۔

''آپ کس کی بات کر رہے ہیں بڑے ابا! میں سمجھا نہیں۔'' اس نے تجاہل سے کام لے کر اپنا اضطراب چھپانا چاہا۔

''ایشاع حیدر کی۔'' اب کے انہوں نے بغیر رکے جواب دے ڈالا۔

''مجھے مدحت کے لیے اسبق کے رشتے پر کبھی اعتراض نہ ہوتا اگر درمیان میں ایشاع کا معاملہ نہیں ہوتا مدحت ایشاع کی راز دار سہیلی ہے اور ان دونوں کے جذبات سے اچھی طرح واقف بھی تم لوگ اس کے لیے اسبق کا رشتہ مانگنے کا ارادہ کر رہے ہو۔یہ بات شہنی نے اسے پہلے ہی بتا دی تھی۔اسی لیے اس نے حفظ ماتقدم کے تحت مکمل تفصیلات کے ساتھ اپنا انکار پہلے ہی مجھ تک پہنچا دیا تھا۔''

''اور میاں صاحبزادے! اب تم ہمیں بتاؤ گے نا گڑبڑ کیا ہے۔'' انہوں نے بھائی کو مطمئن کرنے کے بعد اپنا رخ اس کی طرف موڑ لیا۔




جواب میں وہ پھٹ پڑا تھا حیدر رضا اور ذیشان حیدر کے درمیان ہونے والی گفتگو کی روشنی میں اسے اور اس کے باپ کو سخت سازشی قرار دیا تھا اس کے خیال میں ان لوگوں نے اپنی دولت کے ذریعے اس کی عزت نفس کو کچلنے کی کوشش کی تھی۔

اقبال احمد نہایت سکون سے اس کا ایک ایک لفظ سنتے رہے اور جب وہ سب کچھ کہہ کر تھوڑا تھما تو اس سے پوچھنے لگے۔

''کیا کبھی تم نے خود کو ملنے والی مراعات کے مقابلے میں کم محنت سے کام کیا؟''

''میں تو بالکل نہیں میں ہمیشہ اچھے سے اچھا کام کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔'' انہوں نے ایک پرسوچ ہنکارا بھرا۔

''اس کا مطلب ہے تمہیں جو کچھ دیا گیا وہ تمہاری اپنی محنت کا صلہ تھا۔''

''شاید ......آج دوپہر تک میرا اپنا بھی یہی خیال تھا۔'' اس نے نہایت شکستہ لہجے میں کہا۔

''تمہارا اب بھی یہی خیال ہونا چاہیے کیونکہ حقیقت بھی یہی ہے۔'' بڑے ابا نے پرزور انداز میں اس یقین دلایا۔پھر اچانک ہی جیسے موضوع بدلتے ہوئے بولے۔

''اچھا یہ تو بتاؤ کہ اگر کوئی کم حیثیت شخص شہنی کے لیے خلوص دل سے طلبگار ہو اور شہنی خود بھی اس کے خلوص کی قدر کرتی ہو تو تم کیا کرو گے؟''

''میں ہر ممکن طور پر شہنی کی خوشی پوری کرنے کی کوشش کروں گا؟'' اس نے نہایت سچائی سے جواب دیا۔

''اور اگر وہ شخص بے روزگار ہوا تو؟''

''تو میں اس کے برسر روزگار ہونے کا انتظار کروں گا۔اور ممکن ہوا تو اس کی مدد بھی۔'' وہ مکمل طور پر ان کی باتوں کے جال میں پھنس چکا تھا۔

''یہی...... یہی تو بات ہے تم اپنی عزیز بہن کے لیے سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہو لیکن اگر کوئی دوسرا ایسا کرتا ہے تو اسے اپنی خوداری پر چوٹ سمجھتے ہو جب کہ ان

شریف لوگوں نے تو تم پر کبھی اس کا اظہار بھی نہیں ہو...
سے سب کچھ چھپاتے رہے تاکہ تمہاری نام نہاد انا قائم رہ سکے۔'' بڑے ابا بڑے پرجوش انداز میں ایشاع کی وکالت کر رہے تھے۔

اور اسبق کمال کٹہرے میں کھڑے کسی چالاک وکیل کے دلائل کے داؤ میں آکر اقبال جرم کر لینے والے مجرم کی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا۔

''ابو! جلدی سے اٹھیں' ہاسپٹل جانا ہے مجھے حیدر انکل کا فون آیا ہے۔ ایشاع کی حالت بہت خراب ہے۔'' بیرونی دروازے سے تیزی سے اندر آکر مدحت کے اطلاع دینے پر اسبق کمال پھرتی سے اٹھ کر باہر دوڑا اور بنا کسی کی پکار سنے تیزی سے سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔

☆☆☆

پت جھڑ کے موسم میں تجھ کو
کون سے پھول کا تحفہ بھیجوں
میرا آنگن خالی ہے
لیکن میری آنکھوں میں
نیک دعاؤں کی شبنم ہے
شبنم کا ہر تارا
تیرا آنچل تھام کے کہتا ہے
خوشبو' گیت' ہوا' پانی اور رنگ کو چاہنے والی لڑکی
جلدی سے اچھی ہو جا
صبح بہار کی آنکھیں کب سے
تیری نرم ہنسی کا رستہ دیکھ رہی ہیں

ٹی سی ایس سے موصول ہونے والے گیٹ ویل سون (Get well soon) کے کارڈ پر لکھی یہ نظم پڑھ کر اس کے لب مسکرا اٹھے۔



اسبق کمال کی بے رخی اسے اس دنیا سے لے جانے ہی لگی تھی کہ اچانک اس کی دعاؤں نے بڑھ کر دامن تھام لیا۔

ہوش میں آنے کے بعد مدحت نے اسے بہت کچھ بتایا تھا یہ بھی کہ وہ اس کے بنا بتائے اس کے دل کا راز پا گئی تھی جب ہی اس کا مقدمہ لڑنے کے لیے ابو کو اسبق کے مقابل کھڑا کر دیا۔

اور یہ بھی کہ حیدر رضا نے اس سے اسبق کمال کی واپسی کو چھپانے کی درخواست کی تھی۔ کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ ماریہ رضا کو اب کم از کم اپنی اولاد کی طرف سے کوئی جھٹکا نہ لگے۔ وہ اس سارے قصے میں ایشاع کی دلچسپی کے بارے میں بتائے بغیر اپنے طور پر مسئلہ حل کرنے کے خواہشمند تھے۔ اور وہ ایسا کر بھی لیتے جو اگر اسبق کمال ان کے اور ذیشان حیدر کے درمیان ہونے والی گفتگو اتفاقاً سن نہ لیتا۔

لیکن ایشاع کی موجودہ حالت نے تو جیسے ہر مسئلہ خود بخود حل کر دیا تھا۔ ماریہ رضا اپنی بیٹی کی زندگی اور خوشی کے لیے اسٹیٹس کی ہر دیوار ہٹا دینے کے لیے راضی تھیں۔

اور وہ اسبق کمال جو ہر وقت انا انا پکارتا پھرتا تھا ایشاع کے لیے زندگی کی دعائیں مانگتا دیوانگی کی آخری حدوں تک جا پہنچا تھا یہ لڑکی اسے کتنی عزیز ہے یہ تو اس نے اسے موت کے پنجے میں پھنسا دیکھ کر جانا تھا۔

☆☆☆

ستاروں بھرے آسمان سے بھی زیادہ جھلملاتا آنچل اوڑھے پری وش کا ہاتھ تھامے وہ اپنے بیڈ روم کی کھڑکی میں کھڑا تھا۔

''تمہیں پتا ہے ایشاع! وہ جو چاند کے پاس تارا ہے مجھے کیوں اچھا لگتا ہے۔''

''ہاں پتا ہے؟'' اس کے پوچھنے پر اس نے فوراً ہی اثبات میں سر ہلایا۔

''کیا پتا ہے؟'' وہ مسکرایا۔

''یہی کہ وہ تارا چاند کو اس کی اصلیت بتاتا ہے۔ اس کی اپنی ایک حیثیت ہے اور اس نے چاند کی طرح کسی سے روشنی مستعار......

''اوں ہوں ......اب مجھے وہ تارا کسی اور وجہ سے اچھا لگتا ہے۔'' اس نے بات کو درمیان میں ہی کاٹ دیا تھا۔

''اب کیوں اچھا لگتا ہے؟'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔

''کیونکہ اب یہ تمہارے جھمکے میں چمکتا ہے۔'' اسبق کمال نے دھیرے سے اس کے بائیں کان کے جھمکے کو چھیڑا۔

وہ بے اختیار ہی محجوب سی ہو کر اس کی کھلی بانہوں میں سما گئی تھی۔

اور آسمان پر چاند کے پاس چمکتا تارا ان کے ملاپ پر خوشی سے مسکرا دیا تھا۔

☆☆☆





# کارِ مسلسل

''پاکستانی وہ قوم ہے جو پیسے کے لیے اپنی ماں کو بھی بیچ دے۔''

سائب خان نے زندگی میں یہ طعنہ بار ہا سنا تھا اور ہر بار کہنے والے سے جھگڑ پڑتا تھا۔ وہ امریکا میں پیدا ہوا تھا۔ وہیں تعلیم حاصل کی لیکن جب بھی کوئی شخص پاکستان یا پاکستانیوں کے بارے میں کوئی منفی جملہ کہتا وہ شدید غصے میں آ جاتا آئے دن دنیا بھر کے نیوز چینلز مسلمانوں اور خصوصاً پاکستانیوں کے دہشت گرد ہونے پر زور دیتے رہتے مگر وہ یقین نہیں کرتا کیونکہ اس کے ماں باپ بھی پاکستانی تھے اور اس نے انہیں ہمیشہ بہترین انسانوں میں سے پایا تھا اس کے دل و دماغ میں پاکستانیوں کا صرف اچھا خاکہ تھا جو کہ اس نے اپنے والدین کو دیکھ کر بنایا تھا۔ اس کے یقین کا تو یہ عالم تھا کہ ایک بار اس کے کسی دوست نے پاکستان کی برائی کی تو وہ اس کے ساتھ باقاعدہ ہاتھا پائی پر اتر آیا اور یہ معاملہ پولیس تک جا پہنچا۔ اس کے پاپا سہراب خان کو اسے اس مصیبت سے نجات دلانے میں شدید پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا اور پھر انہوں نے اس سے عہد لیا تھا کہ وہ آئندہ ایسا کوئی قدم نہیں اٹھائے گا۔

''تم لڑ جھگڑ کر کبھی پاکستان کا اچھا تاثر قائم نہیں کر سکتے۔ اسے تمہیں اپنے کردار اور عمل سے ثابت کرنا ہوگا اور یہ تم جب ہی کر سکتے ہو جب تمہیں اپنے آپ پر کنٹرول ہو جائے۔'' پاپا نے اسے نصیحت کی تھی۔

اس نے کبھی اس نصیحت سے روگردانی کی کوشش نہیں کی تھی۔ چنانچہ جوانی تک تو وہ خود کو ایک بہترین لڑکا ثابت کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا اس کے امریکن دوستوں کے علاوہ پاکستان سے تعلق رکھنے والے امریکن نیشنلٹی ہولڈرز بھی اسے بہت پسند کرتے تھے۔ کبھی کبھار اسے اپنے ہم وطنوں کی حرکتوں کی وجہ سے شرمندگی بھی اٹھانی پڑتی اور امریکنز کے طعنے بھی سننے پڑتے تھے لیکن وہ سمجھتا تھا کہ یہ امریکی معاشرت کا اثر ہے جس نے اس کے ہم وطنوں کو اپنی اقدار بھلا دی ہیں۔

لیکن اب مٹی کا ڈھیر بنے اس شہر میں...... اس نفرت انگیز جملے کی گونج اس کی سماعت کو جیسے جلا رہی تھی۔ وہ شہر جہاں ابھی تک گلنے سڑنے والی لاشوں کا تعفن پھیلا ہوا تھا فضا میں سسکیاں اور آہیں گونج رہی تھیں۔ لوگ برہنہ سر اور خالی پیٹ تھے محبت وایثار کی داستانیں رقم کرنے والوں کے شانہ بشانہ رقص شیطانی دیکھ کر وہ صدمے سے گنگ تھا۔ کیا یہ وہی جگہ تھی کیا یہ ہی لوگ تھے جن کے قصے وہ اپنے پاپا سے سنتا آیا تھا۔ جس سے ملے بغیر ہی جنہیں دیکھے بغیر وہ انہیں اپنا مانتا تھا جن کی خاطر وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہاں دوڑا آیا تھا۔

☆☆☆

"تم میری تسکین کا سامان نہیں کر سکتیں۔ تمہاری قربت میں میرے لیے کچھ نہیں ہے۔"

گل جاناں نے بہت حیرت سے ارباز خان کی زبان سے نکلنے والے الفاظ سنے تھے۔ بھرپور جوانی کی مالک گل جاناں جس کا حسن آئینے کو شرماتا تھا اپنی شادی کے محض دو دن بعد ہی ارباز خان کے لیے کشش کھو بیٹھی تھی۔ اور ارباز خان اس کے مقابلے میں کیا تھا؟ چالیس سال سے اوپر معمولی شکل وصورت کا ایک کھردرا مرد۔

گل جاناں تو سمجھتی تھی کہ ارباز خان اسے پا کر پھولے نہ سمائے گا۔ ادھیڑ عمری میں اتنی خوبصورت بیوی ملی لیکن وہ ناشکرا تھا۔ گل جاناں نے ارباز خان کے رویے سے سخت ہتک محسوس کی حالانکہ وہ خود بھی اس شادی پر خوش نہیں تھی۔ یہ شادی صرف اور



صرف ان کی روایات کی پاسداری کے لیے انجام پائی تھی۔ گل جاناں کو اس کے پیدا ہوتے ہی ارباز خان سے موسوم کر دیا گیا تھا۔ ارباز خان اس کے باپ کے بڑے بھائی کا بیٹا تھا جسے اس کے باپ نے بھائی کی موت کے بعد اپنے گھر میں رکھ لیا۔ ارباز خان کا باپ مرتے وقت بیٹے پر لاکھوں کا قرضہ چھوڑ کر مرا جسے اتارنے کے لیے اسے اپنا علاقہ چھوڑ کر شہر کی طرف جانا پڑا۔ اپنے ہوش میں گل جاناں نے ارباز خان کو پہلی بار اس وقت دیکھا جب گل جاناں کی ماں مری تھی۔ ارباز خان اپنی چاچی کی آخری رسومات میں شرکت کر کے دوسرے ہی دن لوٹ گیا تھا۔ دوسری بار اسے گل جاناں کے باپ نے خط بھیج کر بلوایا تھا۔ وہ شدید بیمار تھا اور چاہتا تھا کہ بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہو جائے۔ ارباز خان نے چپ چاپ اپنے چاچا کے فیصلے پر سر جھکا دیا تھا۔ گل جاناں بھی بابا کی حالت کے پیش نظر ناپسندیدگی کے باوجود خاموش رہی تھی۔ بابا اس کی رخصتی کی رات ہی مر گیا تھا لیکن اب خود گل جاناں کو شاید ساری زندگی مر مر کر جینا تھا۔ اپنے سے کمتر شخص کی طرف سے ٹھکرائے جانے کا دکھ بہت کاری تھا۔ گل جاناں توہین سے سلگ رہی تھی۔ ارباز خان اس کی حالت سے بے خبر شہر واپسی کے لیے سامان باندھ رہا تھا۔

☆☆☆

آٹھ اکتوبر کو پاکستان میں زلزلے کی خبر سن کر سہراب خان کی پوری فیملی ہل کر رہ گئی زلزلے سے متاثر علاقوں میں ان کا گاؤں بھی شامل تھا اگرچہ سہراب خان امریکا آنے کے بعد کبھی واپس اپنے گاؤں نہیں گیا تھا لیکن اس مشکل گھڑی میں اس کی بے چینی دیدنی تھی۔ سائب خان دو آج کل ٹائیفائیڈ کی وجہ سے بیمار تھا اپنے باپ کی پریشانی میں اس کے ساتھ تھا۔ وطن سے محبت اسے باپ سے ورثے میں ملی تھی۔

"مجھے پاکستان جانا ہو گا۔ میں ایک ڈاکٹر ہوں اور اس وقت سب سے زیادہ میرے وطن کو میری ضرورت ہے۔" سہراب خان نے اعلان کیا۔

"لیکن خان! آپ کا وہاں جانا......" سہراب خان کی بیوی سائرہ نے کچھ کہنا چاہا۔

"نہیں سائرہ! اب ایسا کوئی خطرہ نہیں۔ پاکستان سے جو اطلاعات آ رہی ہیں انہیں سن کر مجھے شک ہے کہ شاید ہی کسی دوست یا دشمن سے مل سکوں۔ اس وقت میں ہر خوف سے نکل کر اپنے بھائیوں کی مدد کے لیے جانا چاہتا ہوں۔" سہراب خان نے اپنی بیوی کو مزید کچھ بھی کہنے سے روک دیا۔

"پاپا! میں بھی آپ کے ساتھ پاکستان چلوں گا۔ ایک پاکستانی اور ڈاکٹر ہونے کے حیثیت سے میرا بھی فرض ہے کہ میں اپنے ہم وطنوں کے کام آؤں۔" سائب خان نے اپنے باپ سے کہا۔

"ابھی تم اس لائق نہیں کہ کچھ کر سکو۔ ایک بیمار شخص دوسروں کے لیے بھی بوجھ ہوتا ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم یہیں رہو۔ ویسے بھی وہاں جو حالات ہیں اور جتنے بڑے پیمانے پر لوگ متاثر ہوئے ہیں میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ابھی بہت عرصے تک امدادی کارروائیاں کرنی ہوں گی۔ تم صحت یاب ہوتے ہی ہمیں جوائن کر لینا" سہراب خان نے اسے سمجھایا تو وہ امریکا میں اپنی ماں کے پاس ہی رک گیا۔ لیکن وہ اس دوران سہراب خان سے رابطہ میں رہا تھا سہراب خان کا گاؤں اس حادثے میں مکمل طور پر تباہ ہو گیا تھا۔ وہ اپنے لوگوں کی موت پر بہت رنجیدہ تھا لیکن اس کے ہاتھ بچ جانے والوں کے زخموں پر مرہم رکھنے میں مسلسل مصروف تھے۔ اسے لگتا تھا کہ لوگوں کے زخم سیتے سیتے خود اس کی انگلیاں فگار ہونے لگی ہوں۔

"پاپا! میں ٹھیک ہوں۔ نیکسٹ ویک میں آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔" سائب خان کی فون پر اپنے باپ سے بات ہوئی تو اس نے اسے اطلاع دی "تم رہنے دو سائب! میں ہوں ناں یہاں۔" سہراب خان نے اسے روکنا چاہا۔

"نو پاپا! میں آ رہا ہوں۔ آپ مجھے بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہیں۔ آپ کو بھی ریسٹ کی ضرورت ہے۔" اس نے اپنے باپ کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

"ماما! مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ پاپا نہیں چاہتے میں پاکستان جاؤں۔ میں نے کتنی بار ان سے ضد کی کہ وکیشنز گزارنے مجھے پاکستان جانے دیں لیکن انہوں نے ہر



بار مجھے روک دیا اور آج جبکہ میری وہاں ضرورت ہے وہ تب بھی مجھے روک رہے ہیں۔" اس نے اپنی ماں سے پوچھا تھا۔

"یہ بہت تکلیف دہ کہانی ہے سائب! جسے ہم نے ہمیشہ تم سے چھپایا۔ میں اور تمہارے پاپا کلاس فیلوز تھے اور دوران تعلیم ہی ہم ایک دوسرے کو چاہنے لگے۔ لیکن سہراب کا تعلق جس علاقے سے تھا وہاں شادیاں اپنے ہی قبیلے میں کرنے کا رواج تھا۔ سہراب کا رشتہ بھی اپنی چچا زاد سے طے تھا۔ لیکن میری خاطر سہراب نے اپنی کزن سے شادی کرنے سے انکار کر دیا اس کے انکار نے دونوں خاندانوں میں طوفان کھڑا کر دیا۔ سہراب کو اس طوفان سے نمٹنے کا یہی راستہ دکھائی دیا کہ وہ مجھ سے کورٹ میرج کر لے۔ وہ سمجھتا تھا کہ جب وہ مجھے بیوی بنائے گا تو لوگوں کے پاس کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں رہے گی۔ لیکن سہراب کا اندازہ غلط نکلا سہراب کے چچا نے اس کے اس عمل کو اپنی توہین سمجھا جس کے بدلے میں انہوں نے سہراب کی بہن کو جو چچا کی بہو تھی اپنے گھر سے نکال دیا۔ سہراب کے بابا اور بڑے بھائی جب چچا کے گھر بچوں کو لینے گئے تو چچا نے انہیں بھی بے عزت کر کے نکال دیا۔ معاملہ صرف یہیں پر ختم نہیں ہوا۔ انہوں نے سہراب کی جان لینے کی کوشش بھی کی۔ وہ تو سہراب کی قسمت اچھی تھی کہ گولی اس ک بازو میں لگی اور جان بچ گئی۔ اس وقت سہراب کی ماں جی نے ہمیں قسم دی کہ ہم یہ ملک چھوڑ کر کسی دوسرے ملک چلے جائیں اور کبھی لوٹ کر نہ آئیں ان لوگوں نے ہم سے قطع تعلق کا اعلان کر کے دشمنی کی آگ کو مزید بھڑکنے سے روک دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تمہارے پاپا نہ کبھی خود پاکستان گئے اور نہ تمہیں جانے دیا۔ لیکن اب حالات مختلف ہیں اس لیے سہراب کو ماں جی کی دی ہوئی قسم توڑ کر واپس پاکستان جانا پڑا۔"

اپنی ماں کی زبانی سارے حالات جان کر سائب خان اپنے باپ کے رویے کی وجوہات سمجھ گیا تھا۔

☆☆☆

"تم اچھی طرح تیار ہو جاؤ شہر سے کچھ دوست میرے ساتھ آئے ہیں اور وہ تم

سے ملنا چاہتے ہیں ۔" ارباز خان پندرہ دن بعد شہر سے لوٹا تو اس کے ساتھ اس کے دوست بھی تھے۔گل جاناں کو ارباز خان کے یہ دوست بالکل اچھے نہیں لگے تھے لیکن وہ ارباز خان کا حکم ماننے سے انکار نہیں کرسکتی تھی سو اپنے بہترین لباس میں تیار ہو کر ان کے سامنے چلی آئی۔

"واہ ارباز خاناں! تم نے تو سچ مچ ہیرا تلاش کر کے رکھا ہے ہمارے لیے تم نے ہمارا دل خوش کر دیا۔اب ہم تمہیں بھی خوش کر دیں گے۔" گل جاناں نے ان کی باتوں پر گھبرا کر ارباز خان کی طرف دیکھا تھا لیکن وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

"ہمارا آپ کا دو دن کا معاملہ طے ہوا ہے صاحب!"

"نہیں خان! پورے ہفتے کی بات کرو۔"

"جیسی آپ کی مرضی صاحب مگر پھر ......" ارباز خان نے باچھیں پھیلا کر کہنا چاہا۔

"اس کی تم فکر نہ کرو خان! ہم تمہارا دل خوش کر دیں گے" انہوں نے لالچی ارباز کا مطلب سمجھتے ہوئے بات کاٹ کر کہا۔

"ارباز خان! یہ کون بے ہودہ لوگ ہیں اور تم ان سے کس قسم کی گفتگو کر رہے ہو۔" گل جاناں چیخ پڑی لیکن اس کی آواز نیلے نوٹوں کی کڑکڑاہٹ میں دب کر رہ گئی تھی۔

گل جاناں کی چیخ و پکار بے کار تھی ۔دور دور پہاڑیوں پر بنے گھروں سے کوئی مدد آنے کا امکان نہ تھا۔ابتدائی چیخ و پکار کے بعد اس نے خود کو ان بھیڑیوں کے حوالے کر دیا تھا۔ایک ہفتے بعد جب ارباز خان واپس آیا تو گل جاناں نفرت سے اس پر تھوکنے کے سوا کچھ نہیں کر سکی۔

"ارباز خان! دل تو چاہ رہا تھا کہ اس سونے کی چڑیا کو لے کر اڑ جائیں لیکن تم سے یاری کا خیال آ گیا" وہ شخص جس کی آنکھوں سے عیاری ٹپکتی تھی ۔ارباز خان سے بولا۔



"اچھا ہوا صاحب! آپ نے اس خیال پر عمل کرنے کی کوشش نہیں کی ورنہ سونے کی چڑیا رکھنے والے اس کی نگرانی کرنا بھی خوب جانتے ہیں ۔" ارباز خان کے الفاظ نے ان دونوں آدمیوں کے ساتھ ساتھ گل جاناں کو بھی باور کرا دیا تھا کہ اس کے فرار کی ساری راہیں مسدود ہیں ۔

آنے والے دنوں میں گل جاناں ارباز خان کے ہاتھوں کھلونا بن کر رہ گئی سیزن میں جب سیاح اس علاقے کا رخ کرتے تو ارباز کی چاندی ہو جاتی ۔اب اس نے مستقل یہی ڈیرہ ڈال لیا تھا۔کبھی کبھی شہر بھی جاتا لیکن نگرانی کے لیے اس نے ایک عورت رکھ چھوڑی تھی۔جس کے ہوتے گل جاناں مرنے کی جرات بھی نہیں کر سکتی تھی۔

ارباز خان نے اسے رد کیوں کیا اس کی وجہ گل جاناں کو بہت دن بعد سمجھ میں آئی تھی ۔آف سیزن میں ارباز خان اسے اپنے ساتھ کراچی لے گیا تھا تاکہ مزید کمائی کر سکے وہیں گل جاناں پر انکشاف ہوا کہ ارباز خان دراصل دوسرے ہی شوق کا شکار ہے جوانی میں قرضوں کے بوجھ سے لدا ارباز خان جب شہر آ کر رہا تو اس کا واسطہ اپنے ہی جیسے حالات کے مارے لوگوں سے پڑا یہ لوگ اپنے جسمانی تقاضوں سے مجبور ہو کر غیر فطری زندگی گزار رہے تھے ۔ارباز خان بھی ان کے ساتھ رہ کر اس مکروہ فعل کا عادی ہو گیا اور اب یہ عالم تھا کہ گل جاناں جیسی حسین بیوی بھی اس کی تسکین کا سامان کرنے سے قاصر تھی۔

☆☆☆

"آپ بہت تھک چکے ہیں پاپا' آپ کچھ دنوں کے لیے شہر چلے جائیں ریفریش ہو کر واپس آ جائے گا۔" سائب خان نے کہا۔ جو ایک دن کراچی میں اور چند گھنٹے اسلام آباد میں اسٹے کرنے کے بعد ایک فوجی ہیلی کاپٹر کے ذریعے وہاں پہنچا تھا۔

"ہاں' تم ٹھیک کہتے ہو۔میں خود بھی آرام کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔" سہراب خان نے جواب دیا۔سائب خان اپنے باپ کی حالت پر حیران تھا اتنا پژمردہ اور اداس وہ پہلے کبھی نہیں دکھائی دیا تھا۔

''پاپا! آپ کی فیملی کے بارے میں کچھ پتا چلا؟'' اسے خیال آیا۔

''تمہیں میرے گاؤں میں جہاں میرا گھر تھا وہاں اب کچھ نہیں ہے۔'' سہراب خان نے جواب دیا اور پھر اس دن وہ مریضوں کو لے جانے والے ایک ہیلی کاپٹر کے ساتھ واپس چلا گیا تھا۔

سائب خان نے اپنے باپ کی ساتھی رضا کاروں کے ساتھ ملکر اپنی ذمے داریاں سنبھال لیں۔

جسمانی اور ذہنی ٹوٹ پھوٹ کے شکار مریضوں کے درمیان شب و روز بہت مصروف گزر رہے تھے۔ اسے ان لوگوں کے ساتھ دلی ہمدردی تھی لیکن وہاں بہت کچھ ایسا بھی ہو رہا تھا جس نے اسے بے چین کر رکھا تھا۔

امدادی سامان کی تقسیم نہایت بے ہنگم طریقے سے ہو رہی تھی۔ طاقتور اپنی ضرورت سے کہیں زیادہ سامان ہتھیا کر ذخیرہ اندوزی کر رہے تھے اور وہ خاندان جو کسی جوان اور توانا مرد کے سہارے سے محروم تھے اپنی ضروریات کی اہم ترین اشیاء تک حاصل نہیں کر پا رہے تھے اس پر مزید ستم یہ کہ آنے والا بعض سامان فوری طور پر تقسیم کرنے کے بجائے کچھ لوگ اپنی تحویل میں روک لیتے تھے۔ کمبل۔ خشک دودھ کے ڈبے، آٹا، چینی یہ سب کھلے عام تقسیم کرنیکے بجائے راتوں رات کب اور کن لوگوں کو دیا جاتا کچھ معلوم نہیں تھا۔ سائب خان کو یہ سب کبھی معلوم نہ ہوتا اس نے ایک رات ایک نوجوان لڑکی کو ایک ذیلی کیمپ کے انچارج کے سامنے گڑگڑاتے ہوئے نہ دیکھ لیا ہوتا۔

''صاحب! میرا بھائی سردی سے مر جائے گا اس کے لیے کمبل اور کھانے کی کچھ چیزیں دے دو۔''

''ان چیزوں کی قیمت معلوم ہے تمہیں!'' انچارج مکاری سے بولا تھا۔

''جی صاحب!'' لڑکی کا سر جھک گیا تھا۔ وہ شخص اس لڑکی کو اپنے ساتھ ایک خیمے میں لے گیا تھا۔ سائب خان نے دیکھا کہ ایک گھنٹے بعد جب وہ لڑکی خیمے سے باہر نکلی تو اس کے ہاتھوں میں مطلوبہ چیزیں موجود



تھیں جو اس نے کچھ فاصلے پر انتظار میں کھڑے اپنے بوڑھے باپ کو لے جا کر دیں اور خود لڑکھڑا کر گر گئی۔

سائب خان دوڑ کر اس تک پہنچا تھا۔

''کیا ہوا بابا! یہ لڑکی ٹھیک تو ہے۔'' اس نے لڑکی کی نبض تھام کر اس کی کیفیت جانچنی چاہی تھی۔

''جس کے نصیب خراب ہوں وہ کب ٹھیک رہ سکتے ہیں۔'' بوڑھے شخص نے جواب دے کر لڑکی کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا تھا۔

سائب خان اسے دیکھا تو کپکپاتے لبوں، ڈبڈبائی آنکھوں والی وہ لڑکی بنا کچھ کہے بھی خود پر گزرنے والے حادثے کی داستان سناتی محسوس ہوئی۔ سائب خان صدمے سے سن ہو گیا تھا۔ بوڑھا باپ ایک ہاتھ میں امدادی اشیاء اور دوسرے ہاتھ سے اپنی بیٹی کی زندہ لاش کو سہارا دیے جا رہا تھا۔

☆☆☆

دروازے پر ہونے والی دستک نے گل جاناں کو چونکا دیا۔ ارباز خان کئی دن سے شہر گیا ہوا تھا اور اس کی نگراں عورت بے خبر سو رہی تھی۔ آج وادی میں موسم سے بہت پہلے غیر متوقع طور پر برف باری شروع ہو گئی تھی۔ اس موسم میں ارباز خان کے واپس آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس کی ملازمہ بھی شاید اسی لیے مطمئن ہو کر سو گئی تھی۔ گل جاناں کے اس برف باری میں کہیں جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

دروازے پر ہونے والی دستک ایک بار پھر ابھری تو گل جاناں کو دروازے تک جانا پڑا۔

''کون؟'' اس نے پوچھتے ہوئے دروازہ کھول دیا سامنے ایک نوجوان کندھے سے بیگ لٹکائے کھڑا تھا اس کے کوٹ اور ٹوپی پر برف چمک رہی تھی۔

''کیا میں اندر آ سکتا ہوں مادام!'' کپکپاتی آواز میں اس نے بہت شائستگی سے پوچھا گل جاناں نے بنا کچھ کہے اس کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ دروازہ بند کر کے وہ

واپس پلٹی تو اسے احساس ہوا کہ وہ نوجوان بری طرح کانپ رہا ہے سردی کی شدت سے اس کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا اور لرزتے ہونٹ سفید پڑ رہے تھے۔

"تمہارے کپڑے بہت گیلے ہو رہے ہیں تم پہلے انہیں تبدیل کر لو۔" گل جاناں نے اسے مشورہ دیا اور ارباز خان کا کوئی جوڑا لینے اندرونی کمرے میں چلی گئی۔ واپس آئی تو اجنبی اپنے جوتے موزے اور سر پر موجود اونی ٹوپی اتار چکا تھا اس کے سر پر موجود گھنے سیاہ بال بہت بھلے معلوم ہو رہے تھے۔

"سامنے غسل خانہ ہے۔تم وہاں جا کر اپنا لباس تبدیل کر لو" اشارے سے بتا کر اس نے اجنبی کو ارباز خان کا گرم سوٹ پکڑایا اور خود آتش دان میں مزید لکڑیاں ڈالنے لگی۔اس کام سے فارغ ہو کر اس نے کچن کا رخ کیا تھا تا کہ اجنبی کے لیے قہوہ بنا سکے۔اس نے اندازہ لگا لیا کہ وہ کوئی سیاح ہے جو برف باری میں پھنس کر یہاں آ پہنچا ہے۔

"تھینک یو مادام!" وہ قہوہ لے کر واپس آئی تو ہتھیلیاں سینکتا اجنبی اسے دیکھ کر مسکرایا۔اس کی مسکراہٹ بہت خوبصورت تھی کم از کم گل جاناں نے اپنی زندگی میں کسی مرد کی اتنی خوبصورت مسکراہٹ نہیں دیکھی تھی۔

"شاندار!" قہوے کی پیالی اس کے ہاتھ سے لے کر اس نے پہلی چسکی لی تو بے ساختہ بول اٹھا۔

"میں اپنے دوستوں کے ساتھ اس علاقے میں سیر کے لیے آیا ہوں۔آج صبح سے ہم لوگ گھومنے پھرنے اور تصویریں اتارنے میں مصروف تھے۔گائیڈ نے خدشہ ظاہر کیا کہ شاید برف باری ہو جائے لیکن وہ شخص بہانے باز ہے۔اس لیے ہم نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا یوں بھی آسمان بالکل صاف تھا۔میں اور میرے دوست گائیڈ کی بات کو نظر انداز کر کے موج مستی میں لگے رہے میں اپنا کیمرا نکال کر مختلف مناظر کی تصویریں اتارتا رہا۔بہتر سے بہتر تصویر بنانے کے چکر میں میں اپنے دوستوں سے کتنی دور نکل آیا مجھے خبر نہیں ہو سکی۔جب ہوش آیا تو میں راستہ بھول چکا تھا۔واپسی کے لیے



کوششیں کر ہی رہا تھا کہ برف باری شروع ہو گئی اور یوں بھٹکتا بھٹکتا میں آپ کے دروازے پر پہنچ گیا۔" گل جاناں کے پوچھے بغیر وہ خود ساری تفصیل سناتا چلا گیا۔

"تمہیں گائیڈ کی بات مان لینی چاہیے تھی علاقے کے موسموں کو یہاں کے رہنے والوں سے بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا۔" گل جاناں نے اس کی پیالی میں مزید قہوہ ڈالتے ہوئے سرزنش کی۔

"لیکن اس طرح میں آپ جیسی خوبصورت خاتون کی میزبانی سے محروم رہ جاتا۔" وہی سحر انگیز مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھری گل جاناں ایک بار پھر گنگ ہو گئی۔

"یہاں آپ کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔" گل جاناں نے بتایا۔

"اور یہ لباس؟" یقیناً وہ لباس کے مالک کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔

"میرے شوہر کا ہے۔وہ کچھ عرصے کے لیے شہر گیا ہوا ہے۔" گل جاناں کے لہجے میں نا معلوم سی تلخی گھل گئی۔

"میں تمہارا بستر یہیں لگا دیتی ہوں تمہاری حالت مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی تمہیں آرام کرنا چاہیے۔" اجنبی کی سرخ ہوتی ناک اور آنکھوں سے بہتے پانی کو دیکھ کر گل جاناں نے اندازہ لگایا۔یوں بھی گفتگو اب ایسے موڑ پر آ پہنچی تھی جہاں سے ارباز خان کا تذکرہ شروع ہوتا تھا اور گل جاناں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

"ہمیں امداد کے نام پر بھیک نہیں چاہیے۔میں آپ کے چینل کے ذریعے لوگوں سے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنی بیکار اور پرانی چیزیں بھیج کر ہماری بے عزتی نہ کریں۔اگر کچھ دینا ہے تو عزت سے دیں ورنہ ہم ایسے ہی ٹھیک ہیں۔" سائب خان نے ایک پرائیویٹ ٹی وی چینل کے نمائندوں کے سامنے کھڑے ہو کر تقریر کرتے اس صاف ستھرے لباس والے شخص کو دیکھا۔اس شخص کا حلیہ گواہ تھا کہ اسے زندگی کی بنیادی سہولتیں میسر آ رہی ہیں۔شاید زلزلے میں اس کی املاک تباہ ہونے سے بچ گئی تھیں یا پھر

وہ آنے والی امداد سے بھرپور استفادہ کر رہا تھا۔ اس شخص کی گفتگو سن کر سائب خان کو کراچی کے ریلیف کیمپ پر گزارا وہ ایک دن یاد آنے لگا جہاں اس نے قربانی کی لازوال داستانیں رقم ہوتی دیکھی تھیں۔ اسے بے ساختہ وہ سانولی سی عورت یاد آئی جس نے گوٹے کناری سے مزین ایک سرخ ریشمی جوڑا دیتے ہوئے امدادی کارکن سے کہا تھا۔

''یہ میرا شادی کا جوڑا ہے ہم بہت غریب لوگ ہیں لیکن میں اپنے ہم وطنوں کی مدد کرنا چاہتی ہوں اس لیے اپنا سب سے اچھا جوڑا دینے آئی ہوں۔''

یا پھر وہ تین بہن بھائی جن کے چہروں پر افلاس ڈیرہ ڈالے ہوئے تھا۔ وہ اپنے پاس موجود تمام سویٹرز سردی سے ٹھٹھرتے اپنے مصیبت زدہ بھائیوں کے لیے لے آئے تھے یہ سوچے بغیر کہ جب ان کے شہر میں سردی کا موسم آئے گا تو ان کی غریب ماں انہیں لنڈا بازار میں بکنے والے معمولی سویٹر دوبارہ دلا پائے گی یا نہیں ایسی کتنی چیزیں تھیں جو معیاری نہ ہونے کے باوجود امدادی کارکن قبول کر رہے تھے صرف اور صرف دینے والوں کے جذبے سے متاثر ہو کر۔ اس میں سے کافی سامان سارٹنگ کے پراسس سے گزرنے کے بعد ریلیف کیمپ میں ہی پڑا رہ جاتا تھا لیکن دینے والا تو مطمئن ہو گیا تھا کہ اس نے اپنی بساط کے مطابق اپنے بھائی بہنوں کی مدد کی اپنا اکلوتا جوتوں کا جوڑا قربان کرنے والا لڑکا اپنی دن بھر کی مزدوری کو دان کر دینے والا مزدور اپنے ہاتھ سے کنگن اتار کر دے جانے والی لڑکی دن رات کا آرام تج کر شہر بھر سے جمع ہونے والے سامان کی سارٹنگ کر کے بنڈلز بنانے والے نوجوان کون کون سا شخص ہو گا جس کو اس شخص کی باتیں سن کر اپنے ہی خلوص پر شک نہ محسوس ہوا ہو گا۔

یہاں کیا صحیح تھا اور کیا غلط سائب خان کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا شہروں سے آئے ہوئے رضا کار جو نہ اس علاقے کی سختیوں کو سہنے کی ہمت رکھتے تھے نہ ہی ان کے پاس اس ناگہانی آفت سے نمٹنے کی تربیت تھی میڈیا کے لوگوں کی یلغار نے مشکل کو اور بڑھا دیا تھا۔ وہ لوگ ہر دردناک منظر فلم بند کر کے اپنے چینلو کے لیے ناظرین کی تعداد کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی کوشش میں مصروف تھے مگر میڈیا کے اس



طرز عمل کا ایک مثبت پہلو یہ بھی تھا کہ لوگ اپنی آنکھوں سے درد سے تڑپتے لوگوں کو دیکھنے کے بعد زیادہ فیاضی سے امداد دے رہے تھے۔

☆☆☆

ملازمہ جاگی تو ایک اجنبی کو گھر میں پا کر حیران رہ گئی۔

''یہ کون ہے بی بی؟''

''مسافر، برف باری میں راستہ بھٹک کر پناہ کی تلاش میں یہاں تک آ پہنچا۔'' گل جاناں نے اطمینان سے جواب دیا۔

''مگر خان کو اس کی یہاں موجودگی پر اعتراض ہو سکتا ہے۔'' ملازمہ نے جرح کی۔

''اپنے گھر میں کسی غیر مرد کی موجودگی پر شریف مرد اعتراض کیا کرتے ہیں تمہارے خان جیسے دلال نہیں۔'' گل جاناں تلخی سے جواب دے کر نوجوان کی طرف بڑھی تھی جو ان کی باتوں سے انجان بے خبر سو رہا تھا۔ اس کے لہجے میں پیش نظر ملازمہ چاہنے کے باوجود مزید کچھ نہ کہہ سکی۔

''اسے بہت تیز بخار ہو رہا ہے۔ تم گرم دودھ کے ساتھ کھانے کے لیے کچھ لے آؤ اور ہاں وہ ڈبہ بھی لے آنا جس میں خان نے شہر سے دوائیں لا کر رکھی ہیں۔'' گل جاناں نے ملازمہ کو ہدایت دی اور خود نوجوان کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔

''اٹھو' کچھ کھا پی کر دوا کھا لو۔'' نوجوان نے بہ مشکل اپنی سرخ ہوتی آنکھیں کھولیں تو گل جاناں نے کہا۔ اس دوران ملازمہ ایک پلیٹ میں بسکٹ اور دودھ کا گلاس رکھ کر لے آئی اس کی مدد سے گل جاناں نے نوجوان کو ناشتہ کروا کر دوا کھلائی۔

''میرے خیال میں ہمیں اسے اندرونی کمرے میں منتقل کر دینا چاہیے۔ وہاں یہ زیادہ آرام سے رہ سکے گا۔'' گل جاناں نے تجویز پیش کی۔ لمبی تڑنگی ملازمہ اور نازک اندام گل جاناں اس نوجوان کو سہارا دے کر اندر لے جانے میں ہانپ گئی تھیں۔

''دیکھنے میں دبلا پتلا سا ہے لیکن ہے جاندار۔'' ملازمہ نے ہانپتے ہوئے تبصرہ

کیا تھا۔

''باہر برفباری ہو رہی ہے اور اس کی حالت بھی ٹھیک نہیں اس لیے فی الحال اس کا یہاں سے جانا ممکن نہ ہو گا۔تم کھانے میں کوئی نرم غذا تیار کر لینا۔دوپہر کے کھانے کے ساتھ میں اسے دوا کی ایک خوراک اور دے دوں گی۔'' گل جاناں نے ملازماہ کو ہدایت دی تھی اور اس کے جانے کے بعد خود ایک کرسی پر بیٹھ کر اس کی صورت تکنے لگی تھی۔کشادہ پیشانی پر پڑے سیاہ سلکی بال کھڑی ستواں ناک بھرے بھرے ہونٹوں سے اوپر سیاہ گھنی مونچھیں اور سب سے بڑھ کر چہرے پر پایا جانے والا معصوم سا تاثر گل جاناں کو اگر خواب دیکھنے کی اجازت ملتی تو یقیناً وہ ایسے ہی کسی شخص کو اپنے خوابوں میں جگہ دیتی آج اسے بہت شدت سے اپنی بدقسمتی کا احساس ہو رہا تھا۔اس جیسی نازک اندام اور دلکش لڑکی کے لیے تو اس نوجوان جیسا کوئی ساتھی ہونا چاہیے تھا لیکن ارباز خان اس کی ہر خواہش ہر تمنا کو نگل گیا تھا۔وہ محویت سے نوجوان کے چہرے کو تکتی رہی ارباز خان سے لے کر اس کے لائے ہوئے گاہکوں تک بے شمار مردوں میں سے کوئی ایک بھی اس کے دل کو اچھا نہیں لگا تھا لیکن اس اجنبی کے ایک ایک نقش کو چوم لینے کا دل چاہ رہا تھا۔

''پانی!'' اجنبی کے کسمسانے پر گل جاناں کی محویت ٹوٹی اور وہ تھرماس میں رکھے پانی کو گلاس میں انڈیل کر اس کے قریب جا بیٹھی۔

''پانی پی لو۔'' اس نے نوجوان کو مخاطب کیا تو وہ آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھنے لگا پھر اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی گل جاناں نے دیکھا کہ وہ بیٹھنے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تو گردن کے نیچے ہاتھ دے کر اس کا سر تھوڑا سا اونچا کیا اور دوسرے ہاتھ سے پانی کا گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا۔اس عمل کے دوران پیدا ہونے والی قربت نے گل جاناں کے جسم میں سنسناہٹ سی پیدا کر دی۔بخار سے تپتا یہ اجنبی سالمس اس کے لیے بہت انوکھا تھا اس نے ہمیشہ مرد کی وحشت اور ہوس دیکھی تھی مرد کی قربت میں پیدا ہونے والا نرم اور خوشگوار سا یہ احساس اس کے لیے بے حد اجنبی تھا۔





اجنبی نے پانی پی کر آنکھیں ایک بار پھر موند لی تھیں۔گل جاناں نے اس کا سر آہستگی سے تکیے پر رکھا۔اب اس کی انگلیاں اجنبی کے بالوں کو سہلا رہی تھیں۔بے خبری سے سوتے اس شخص کو خبر بھی نہیں تھی کہ وہ کسی کے دل کی دھڑکنوں کو نئی تال پر رقص کرنے پر اُکسا رہا ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر صاحب! پلیز اس شخص کو دیکھیں مجھے اس کا زخم کافی خراب لگ رہا ہے۔'' سائب خان جس نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے آنکھیں موند رکھی تھیں اس آواز کو سن کر چوکنا ہو گیا۔دو فوجی جوان اسٹریچر پر ایک ادھیڑ عمر مرد کو ڈالے اندر لا رہے تھے سائب خان سے مخاطب شخص فوج کے مخصوص یونیفارم میں تھا جس کی جیب پر لگی پٹی اس کیپٹن نوید کے طور پر متعارف کروا رہی تھی۔

''یہ شخص اب تک کہاں تھا؟'' سائب خان نے زخم کا جائزہ لیتے کیپٹن نوید سے پوچھا۔حادثے کو کافی دن گزر چکے تھے امدادی کیمپ میں زیر علاج مریضوں کے علاوہ اب چند ایک ہی لوگ ان کے پاس لائے جا رہے تھے۔

''آج ہم شمالی پہاڑوں کی طرف چکر کاٹ رہے تھے۔وہیں ایک گاؤں میں یہ شخص ملا ہے شدید زخمی ہونے کی وجہ سے یہ پہاڑ سے نیچے نہیں آسکا۔اس کی بیوی اپنے طور پر اس کا علاج کچھ ٹوٹکوں وغیرہ سے کر رہی تھی۔آج ہماری ٹیم وہاں پہنچی تو ہم ہیلی کاپٹر میں اسے یہاں لے آئے؟'' کیپٹن نوید نے جواب دیا۔

''زخم بہت بگڑ چکا ہے اس کی ٹانگ کاٹنی پڑے گی۔میں ڈاکٹر البرٹ کو بھی مشورے کے لیے بلا لیتا ہوں۔'' سائب خان کیپٹن سے گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ زخمی کا معائنہ بھی کر رہا تھا۔

''ایک اور معذور۔'' کیپٹن نوید نے تاسف سے آہ بھری۔

''ان گنت لاشیں ہم نے زمین کی نذر کی ہیں اور بے شمار زندہ لاشوں کو اس زمین پر بے کسی میں تڑپتے دیکھ رہے ہیں۔'' اس کی آواز بہت دھیمی لیکن گہرے غم میں

ڈوبی ہوئی تھی۔ سائب خان نے پلٹ کر دیکھا کیپٹن نوید کی آنکھوں میں چھایا دکھ بالکل ویسا ہی تھا جیسا وہ ہر پاکستانی کی آنکھوں میں دیکھنے کا متمنی تھا۔

"سائب! تمہارا خیال بالکل ٹھیک ہے ہمیں اس شخص کی زندگی بچانے کے لیے اس کی ٹانگ کاٹنی پڑے گی۔" اس کے بلاوے پر آنے والے ڈاکٹر البرٹ نے کہا۔ ان کے ساتھ موجود امدادی کارکن آپریشن کی تیاری کرنے لگے۔

"کیپٹن نوید! آپ چل کر کچھ کھالیں۔ آپ نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔" سائب خان نے وہاں سے نکلنے سے پہلے سیاہ آنکھوں والی اداس سی لڑکی کو کیپٹن نوید سے کہتے سنا وہ مسلسل کئی دنوں سے اس لڑکی کو امدادی کیمپ میں دیکھ رہا تھا۔ کسی کو دلاسا دیتی کسی کے سونے جاگنے کا خیال رکھتی کسی کو کھانے پینے کا دھیان دلاتی یہ لڑکی بار بار اسے اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔

☆☆☆

"شکریہ مادام! آپ نہایت مہربان خاتون ہیں" گل جاناں کے ہاتھ سے قہوے کی پیالی لیتے ہوئے سعد عباس احسان مندی سے بولا۔ اپنے چار دنوں کے قیام کے دوران میں وہ گل جاناں کے لیے اجنبی نہیں رہا تھا۔

"میں نے تم سے کتنی بار کہا ہے سعد کہ مجھے مادام کہہ کر مت پکارا کرو میں اتنے احترام سے پکارے جانے کے لائق نہیں" گل جاناں نے اسے ٹوکا۔

"جی درست فرمایا آپ نے۔ آپ تو اصل میں بے حد پیار سے پکارے جانے کے لائق ہیں پھر کیا خیال ہے آپ کو آپ کے نام کے آخری آدھے حصے سے مخاطب کیا جائے؟" ہونٹوں میں مسکراہٹ دباتے اس نے گل جاناں سے پوچھا۔

"مطلب؟" گل جاناں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"جاناں! میں اب آپ کو جاناں کہہ کر بلایا کروں گا۔" وہ شوخی سے بولا تو گل جاناں کے رخساروں پر سرخی دوڑ گئی۔

"ایک شرط پر تم یہ آپ جناب ختم کر کے مجھے "تم" کہو گے۔"



"ٹھیک ہے ڈن۔" اس نے گل جاناں کے سامنے ہتھیلی پھیلائی تو اس نے اپنا نازک سا ہاتھ سعد عباسی کے ہاتھ میں دے دیا۔ اچانک ہی سعد زور زور سے ہنسنے لگا۔

"کیا ہوا؟" گل جاناں نے حیرت سے پوچھا۔

"میں سوچ رہا تھا کہ ہم دونوں تو ایسے آپس میں معاملات طے کر رہے ہیں جیسے ہمیشہ ساتھ رہنا ہو۔ جبکہ میرا خیال ہے مجھے یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ میرے دوست میرے لیے پریشان ہوں گے۔" اپنے ہنسنے کی وجہ بتاتے ہوئے وہ آخر میں سنجیدگی سے بولا۔

"نہیں سعد! میں ابھی تمہیں یہاں سے نہیں جانے دوں گی۔" گل جاناں نے اس کا بازو مضبوطی سے جکڑ لیا تھا۔

"جاناں!" سعد عباسی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"تم نہیں جانتے سعد! تمہاری یہاں آمد نے کیا کیا ہے۔ تم نے میرے خزاں رسیدہ وجود میں زندگی کی لہر دوڑائی ہے۔ تمہیں دیکھ کر میرے اندر احساس جاگتا ہے کہ میں بھی ایک گوشت پوست سے بنی لڑکی ہوں جس کے سینے میں بھی ایک دل ہے۔ وہ دل جسے میں نے مردہ سمجھ لیا تھا۔ جس میں موجود ہر جذبہ روندا جا چکا تھا۔ لیکن اب میرے دل میں ایک نیا جذبہ سر اٹھا رہا ہے وہ جذبہ مجھے اپنی جان سے بھی بڑھ کر عزیز ہے۔ میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں سعد!" گل جاناں اس کے سینے سے سر لگائے دیوانگی سے کہہ رہی تھی۔

"یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو گل جاناں! تم ایک شادی شدہ عورت ہو۔ تمہارے ہر جذبے پر تمہارے شوہر کا حق ہے۔" سعد عباسی نے اس کے دونوں شانے پکڑ کے جھٹکے سے خود سے الگ کیا۔

"شوہر نہیں ہے وہ۔ میرے روح کا ناسور ہے۔ وہ میرے بدن کو نوچ نوچ کر ہوس پرست لوگوں کو کھلا رہا ہے۔ یہ گھر دیکھ رہے ہو کیا اس علاقے میں اس جتنا باسہولت طرح طرح کی چیزوں سے بھرا ہوا کوئی دوسرا گھر دیکھا ہے تم نے؟ یہ سب میرے بدن کو

بیچ بیچ کر جمع کیا ہے ارباز خان نے وہ شخص جس نے مجھے بکاؤ مال بنا دیا کیا کسی جذبے کا حقدار ہو سکتا ہے؟" گل جاناں پر ہذیانی کیفیت طاری تھی سعد بھی بت بنا کھڑا اس کی باتیں سن رہا تھا۔

"کیا ہوا بی بی؟" ملازمہ اس کے رونے کی آوازیں سن کر دروازے پر آ کھڑی ہوئی تھی۔

"تم جاؤ' میں سنبھال لوں گا انہیں۔" سعد عباسی نے فوری جھٹکے سے سنبھلتے ہوئے ملازمہ کو حکم دیا تو وہ اسے گھورتی ہوئی وہاں سے ہٹ گئی۔

"پانی پی لو جاناں!" وہ گلاس میں پانی بھر کر اس کے قریب آ بیٹھا۔

"پہلے تم وعدہ کرو کہ مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔"

"نہیں جاؤں گا۔" اس نے گلاس گل جاناں کے ہونٹوں سے لگایا پانی پی کر بھی اس کی سسکیاں نہیں رکی تھیں۔

"مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ۔" اسے خود سے لگے سعد عباسی دھیرے دھیرے اس کی پشت سہلا رہا تھا۔

"شادی۔زندگی کا سب سے بڑا جوا...... جو میں ہار گئی۔" گل جاناں اسے اپنی زندگی کے تلخ حقائق بتا رہی تھی جنہیں سن کر سعد عباسی کا دل شدید دکھ کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔

☆☆☆

"تم یہ سیب کھا لو۔اسے کھا کر تم جلدی سے بڑے ہو جاؤ گے۔پھر جب تمہاری امی آئیں گی تو تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گی۔" مختلف مریضوں کا چیک اپ کرتے سائب خان نے دیکھا کہ وہی سیاہ اداس آنکھوں والی لڑکی ایک پانچ چھ سالہ بچے کے پاس بیٹھی اسے بہلا رہی ہے۔حادثے میں اس بچے کا بایاں ہاتھ ضائع ہو گیا تھا اور وہ اکثر کھانے پینے میں بہت تنگ کرتا تھا وہ بچہ امدادی کارکنوں کو ایک مکان کے ملبے میں سے ملا تھا اس کے گھر کے باقی افراد ملبے تلے دب کر مر گئے تھے مگر وہ معصوم اس تلخ



حقیقت سے بے خبر اکثر اپنے امی ابو کو بلانے کی ضد کرتا رہتا تھا۔

"امی کے اوپر چھت گر گئی تھی امی زور سے چیخی تھیں۔انہیں بھی میری طرح چوٹ لگی ہو گی آپ انہیں وہاں سے نکال کر لائیں ناں پھر یہ ڈاکٹر انکل انہیں بھی دوا دے دیں گے۔" سائب اب اس بچے کے قریب آ چکا تھا اس کی طرف دیکھتے بچے نے لڑکی سے فرمائش کی تو اس نے شدت جذبات سے اپنی مٹھی بھینچ لی۔سائب خان نے دیکھا ایسا کرنے سے اس کے ہاتھ میں موجود پھل کاٹنے والے چھوٹے چاقو نے اس کی ہتھیلی کو زخمی کر دیا تھا اور خون کے قطرے نکل کر فرش پر ٹپکنے لگے۔

"یہ کیا حرکت ہے!" سائب نے اس کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دیا تو چاقو اس کی گرفت سے نکل کر نیچے گر گیا۔

"اچھا خاصا گہرا کٹ لگ گیا۔" اس کی ہتھیلی کا جائزہ لیتے ہوئے سائب نے کہا تو وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر کھڑی ہو گئی اور دوپٹے سے اپنے زخم کو دباتے ہوئے بولی۔

"معمولی چوٹ ہے ٹھیک ہو جائے گی۔"

"بالکل نہیں آپ بیٹھیے یہاں۔بینڈیج کر دیتا ہوں......" سائب نے اس کا ہاتھ پکڑ کر واپس بٹھایا اور مڑ کر ایک نرس سے بولا "شہناز! پلیز بینڈیج کا سامان یہاں لا دیں۔"

سائب خان کے بینڈیج کرنے تک وہ خاموشی سے بیٹھی رہی۔جیسے ہی وہ اپنے کام سے فارغ ہوا کھڑی ہو گئی اور بولی "تھینک یو!"

"اٹس مائی ڈیوٹی۔" اس کے سپاٹ چہرے کی طرف دیکھتے سائب خان مسکرایا۔

"کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں مس؟"

"سعدیہ۔" سائب خان کے پوچھنے پر وہ اسی سپاٹ انداز میں جواب دے کر وہاں سے چلی گئی۔

"ڈاکٹر انکل! آنٹی تو چلی گئیں۔اب میری امی کو کون ڈھونڈ کے لائے گا۔"

بچے نے ہاتھ ہلا کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا تو وہ سعدیہ کی طرف سے دھیان ہٹا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"آپ اور میں مل کر آپ کی امی کو ڈھونڈنے جائیں گے لیکن پہلے آپ یہ سیب کھالو۔ ابھی آپ کو آنٹی نے بتایا تھا ناں کہ جو بچے سیب کھاتے ہیں وہ جلدی سے بڑے اور اسٹرانگ ہو جاتے ہیں۔" وہ بچے کو بہلانے لگا اس کے بعد بھی اس کا بہت سارا وقت مریضوں کے درمیان گزرا لیکن سعدیہ نامی وہ لڑکی اس کے دھیان سے نہیں نکل سکی۔

اتفاقاً اسی شام وہ اسے تنہا ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھی دکھائی دے گئی تو وہ خود کو اس کی طرف بڑھنے سے نہ روک سکا۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟"

سعدیہ نے ایک طرف کھسکتے گویا اسے بیٹھنے کی اجازت دے دی۔

"آپ اسی علاقے کی رہنے والی ہیں؟"

"کہہ سکتے ہیں۔"

"مطلب؟" سائب خان کو اس کے جواب نے حیران کیا۔

"میں اسی علاقے میں پیدا ہوئی لیکن مجھے یہاں رہنا بہت کم نصیب ہوا میری ماں نے مجھے اچھی تعلیم کے لیے ہمیشہ اسلام آباد میں رکھا میں کبھی کبھار بس چھٹیوں میں ہی یہاں آتی تھی۔" اپنے گزشتہ رویے کے برعکس وہ بہت آرام سے بات کر رہی تھی۔

"آپ یہاں کیمپ میں ہمیشہ تنہا دکھائی دیتی ہیں۔ آپ کی والدہ......" سائب خان نے اپنے سوال کو ادھورا چھوڑ دیا۔

"وہ نہیں رہیں۔ اس حادثے میں میں نے انہیں کھو دیا۔ جب زلزلہ آیا تو میں اسلام آباد میں تھی۔ یہاں سے ملنے والی اطلاعات کے بعد جیسے تیسے یہاں پہنچی لیکن پھر بھی مجھے اپنی ماں کا آخری دیدار نصیب نہیں ہو سکا۔ میرے گھر کا صرف کچن اس حادثے میں تباہ ہوا ہے اور آپ قدرت کی ستم ظریفی دیکھیں کہ میری ماں اس وقت کچن میں



موجود تھیں۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"ویری سیڈ! اور آپ کے باقی گھر والے؟" سائب خان نے افسردگی سے پوچھا۔

"اور کوئی نہیں ہے۔ بس میرا باپ ہے جو اب بھی اس گھر میں رہ رہا ہے۔"

سعدیہ کا لہجہ ایک بار پھر سپاٹ ہو گیا تھا۔

"آپ واپس اسلام آباد چلی جاتیں آپ کی اسٹڈیز کا حرج ہو رہا ہو گا۔" سائب خان نے اسے مشورہ دیا۔

"لوگ باہر سے آکر ہمارے لوگوں کی مدد کر رہے ہیں اور میں اتنی خودغرض ہو جاؤں کہ صرف اپنے بارے میں سوچوں۔" اس نے تلخی سے جواب دیا۔

"آپ کو میری بات بری لگی اس کے لیے سوری۔" سائب خان نے فوراً ہی صلح جو انداز میں معافی مانگی تو وہ ریلیکس ہو گئی۔

"آپ کا قصور نہیں۔ بس زندگی اچانک اتنی تلخ ہو گئی ہے کہ میں اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ پاتی۔" اس نے نرم لہجے میں اعتراف کیا تو سائب خان کے ہونٹوں پر آسودہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆☆☆

"اب آپ کے مسافر کو رخصت کر دینا چاہیے بی بی! خان کسی بھی وقت واپس آسکتا ہے۔" خشک گوشت کے پارچے تلتی گل جاناں کی طرف دیکھتے ہوئے ملازمہ نے کہا۔

"مسافر تو اب دل کا مہمان ہو گیا ہے۔" گل جاناں مسکرائی۔

"مہمانوں کو واپس لوٹنا ہی ہوتا ہے بی بی!" ملازمہ گویا اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"صرف گھر سے دل کا مہمان ہمیشہ کے لیے بسنے کو آتا ہے۔" وہ گوشت کے پارچے پلیٹ میں نکال کر کچن سے باہر نکل گئی۔

"تمہاری میزبانی مجھے موٹا کر دے گی۔" سعد عباسی اسے پلیٹ لاتے دیکھ کر بولا۔

"پہلی بار ہی میری زندگی میں یہ وقت آیا ہے کہ میں دل سے کسی کے لیے کچھ پکاؤں اب سے پہلے کھانا صرف پیٹ کی آگ بجھانے کی چیز تھا لیکن اب جانا ہے کہ یہ عورت کے پیار کے اظہار کا ایک خوبصورت ذریعہ بھی ہے۔" اس نے گوشت کا ایک ٹکڑا اٹھا کر سعد عباسی کے منہ میں رکھا۔

"زبردست۔اٹس رئیلی ویری ڈیلیشیس!" اس نے داد دی۔

"میری ملازمہ کا خیال ہے تمہیں اب واپس لوٹ جانا چاہیے ارباز خان کسی بھی وقت واپس آسکتا ہے۔تمہاری یہاں موجودگی شاید اسے ناگوار گزرے۔" گل جاناں نے اداسی سے سعد عباسی کو بتایا۔

"اور تم ......تمہارا کیا ہوگا؟ کیا تم اسی جہنم میں پڑی رہوگی؟" سعد عباسی نے گل جاناں کی اداس آنکھوں میں جھانکا۔

"میں یہاں سے کہیں جا بھی تو نہیں سکتی۔یہ عورت ارباز خان کی خاص ملازمہ ہے جسے اس نے میری نگرانی پر مامور کر رکھا ہے اس گھر میں تمہاری موجودگی پر اس نے زیادہ اعتراض اس لیے نہیں کیا کہ مردوں سے تعلق میری زندگی کا ایک لازمی حصہ ہے لیکن وہ مجھے یہاں سے قدم باہر ہرگز نہیں نکالنے دے گی۔" گل جاناں نے اسے بتایا۔

"میں اس عورت پر قابو پا کر اسے کسی رسی سے باندھ دوں گا۔پھر ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔ایک بار شہر پہنچ گئے تو ارباز خان ہماری گرد کو بھی نہیں پا سکے گا۔"

"سچ سعد! پھر میں اور تم ہمیشہ کے لیے ساتھ رہیں گے۔" گل جاناں خوشی سے سعد کے سینے سے جا لگی۔سعد عباسی نے گرم جوشی سے اس کا خیر مقدم کیا۔گل جاناں کے لیے وحشت سے خود پر ٹوٹتے مردوں کے مقابلے میں سعد عباسی کا یہ نرم گرم سا رویہ بہت خوش کن تھا۔وہ سعد عباسی کی بانہوں کے حصار میں مکمل خود سپردگی کے ساتھ بکھرتی جا رہی تھی اور سعد اس کے خوشبو جیسے بدن کو نہایت نفاست سے برت رہا تھا۔وہ گل



جاناں کو اتنی نرمی سے چھو رہا تھا کہ اسے خود پر نازک شیشے کے جام کا گمان ہوا

☆☆☆

"ہیلو کیپٹن! ہاؤ آر یو؟" سعدیہ اور کیپٹن نوید کو دیکھ کر سائب خان بھی وہیں چلا آیا تھا۔

"فائن۔" کیپٹن نوید نے مختصر جواب دیتے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھام کر مصافحہ کیا۔

"مجھے آپ لوگ کچھ پریشان لگ رہے ہیں خیریت تو ہے؟" سائب خان نے ان دونوں کے چہروں پر چھائے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔"پریشانی تو یہاں ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔خوراک گرم لباس خیمے اور بیماروں کی دیکھ بھال ......ہر چیز ایک مسئلہ ہے۔" کیپٹن نوید کا انداز سراسر ٹالنے والا تھا۔

"یہ تو روزانہ کے مسائل ہیں لیکن مجھے لگتا ہے کہ آج کچھ خاص ہوا ہے۔سعدیہ تم بتاؤ کیا بات ہے ابھی دو گھنٹے پہلے جب تم ملی تھیں تو تمہارے چہرے پر یہ پریشانی نہیں تھی۔" سائب خان نے وجہ جاننے پر اصرار کیا۔

"پناہ گزین خواتین میں سے چار لڑکیاں غائب ہیں۔ان کی ساتھی عورتوں کے مطابق انہیں ان کے رشتے دار لینے آئے تھے اور وہ ان کے ساتھ چلی گئیں۔لیکن ذمے دار آفیسر اس بات سے لاعلمی کا اظہار کر رہا ہے سمجھ نہیں آتا کہ وہ لڑکیاں کہاں گئیں۔اس علاقے کے حالات راستے اور موسم ایسے نہیں کہ کوئی شخص اپنے طور پر ان لڑکیوں کو یہاں سے نکال کر لے جا سکے۔یقیناً اندر کے کسی بندے کی سرپرستی میں یہ کام ہوا ہے لیکن معاملے کی تہ تک پہنچنا ہمارے اختیار میں نہیں۔البتہ حکومت کو اس واقعے کے بارے میں آگاہ کر دیا گیا ہے اور اب نئے آرڈرز کے تحت پناہ گزین خواتین اور بچوں کی سخت حفاظت کی جا رہی ہے۔" سعدیہ نے اسے تفصیلات سے آگاہ کیا۔

"دراصل ناگہانی حالات اور افراتفری سے فائدہ اٹھانے والے جرائم پیشہ افراد بھی ان دنوں سرگرم ہو گئے ہیں موقع ملتے ہی وہ اپنا ہاتھ دکھا جاتے ہیں۔"

"میں یہاں کے حالات دیکھ کر حیران ہوں۔" سائب خان نے تاسف سے کہا۔

"یہاں کے لوگوں کے قصے میں اپنے پاپا کی زبان سے سن سن کر بڑا ہوا ہوں۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں میں نے بنا دیکھے ہی اپنا آئیڈیل مان رکھا تھا۔لیکن یہاں آکر اور ان سے ملکر مجھے سخت مایوسی ہوئی ہے۔میرے سامنے موجود لوگ عیاش۔آرام طلب اور نکمے ہیں ترکی روس اور امریکا سے آنے والی امدادی ٹیموں نے ان کے حصے کا کام کیا۔اس موت کی وادی میں بیٹھ کر جہاں خدا کے قہر سے دل کانپنے لگتے ہیں یہ لوگ شراب اور شباب میں ڈوبے ہوئے ہیں تف ہے ان سارے لوگوں پر۔" بہت دنوں کی فرسٹریشن غصے کی شکل میں ظاہر ہو رہی تھی۔اس کے الفاظ اور انداز پر کیپٹن نوید کا چہرہ سرخ پڑ گیا لیکن وہ بنا کوئی جواب دیئے تیزی سے پلٹ کر چلے گئے۔

"تم زیادتی کر رہے ہو سائب خان! تمہیں احساس نہیں کہ تمہارے الفاظ نے کس کس کی قربانیوں اور محنت پر پانی پھیرا ہے۔" سعدیہ نے اسے ٹوکا۔

"میں صحیح کہہ رہا ہوں، کیونکہ میں نے اپنے آنکھوں سے یہاں ہونے والے ظلم وستم کو دیکھا ہے۔ایک کمبل اور دودھ کے ڈبے کے لیے برسوں سے سنبھال کر رکھی گئی عصمت کی بولی لگتی دیکھی ہے اپنے ہی بھائیوں کو لوٹ کر اپنا گھر بھرنے والے بے حس انسانوں کو دیکھا ہے۔درد کی انتہا پر پہنچ کرموت کی دعا مانگنے والے زخمیوں کو دیکھا ہے۔ میں نے یہاں وہ کچھ دیکھا ہے۔جو اپنی زندگی میں میرے وہم وگمان سے بھی نہیں گزرا۔" وہ چیخ پڑا تھا۔

"لیکن تم نے دل کے اندر اپنا درد چھپا کر دوسروں کا درد محسوس کرنے والے جذبے کو نہیں دیکھا۔یہ کیپٹن نوید جن کے سامنے تم یہاں کے لوگوں کے بخیے ادھیڑ رہے تھے کیا جانتے ہو ان کے بارے میں؟ ان کے ماں باپ' بیوی اور دو سالہ بیٹا اسی شہر میں' اپنے ہی گھر کے ملبے تلے دب کر مر گئے لیکن آفرین ہے اس شخص پر جو اپنا دکھ چھپا کر دوسروں کے درد کی دوا کر رہا ہے۔کئی کئی گھنٹے گزر جاتے ہیں انہیں کام کرتے بنا کچھ



کھائے پیے اور آرام کیے اور کیپٹن نوید اکیلے نہیں ان جیسے بے شمار ہیں یہاں تمہیں عیش پرست لوگ اور افسران نظر آجاتے ہیں لیکن وہ جیالے نظر نہیں آتے جو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر بلند وبالا مقامات پر امداد پہنچا رہے ہیں۔تمہیں غیر ذمے دار نظر آگئے لیکن وہ ذمے دار نظر نہیں آئے جنہوں نے دوسروں کی مدد کرتے ہوئے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا تم اب تک تصویر کا منفی رخ دیکھتے رہے ہو شاید اس لیے کہ تمہارے پاپا نے تمہیں ہمیشہ صرف مثبت رخ سے متعارف کروایا تم صرف وہ قصے سنتے رہے ہو جو تمہارے پاپا کے من پسند تھے۔جن کے ذریعے وہ تمہارے دل میں اپنے وطن اور اپنے لوگوں کی محبت پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے تمہارے پاپا تمہیں پاکستان کے قصوں کی صورت ونڈر لینڈ کی سیر کراتے رہے اور تم نے کبھی یہ سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ زمینی حقائق ہمیشہ مختلف ہوتے ہیں اچھائی کے ساتھ برائی نیکی کے ساتھ بدی کا چولی دامن کا ساتھ ہے میں مانتی ہوں تم جو کچھ کہتے ہو وہ غلط نہیں ہمارے درمیان بہت سی کالی بھیڑیں موجود ہیں لیکن صرف یہی تو ہماری سچائی نہیں ٹھیک ہے ہماری پاس جدید ٹیکنالوجی نہیں ہمارے پاس تربیت یافتہ لوگ نہیں ہمارے پاس تم جیسے ڈاکٹرز نہیں ......لیکن ہمارے پاس ایک دوسرے کے لیے ہمدردی اور محبت کے جذبات ہیں اور یہی جذبے ہمارا ہتھیار ہیں بدامنی وسائل کی کمی ہیرا پھیری ہمیں پریشان تو کرتی ہیں لیکن ہمارا جذبہ ہمیں تھکنے نہیں دیتا اگر ایسا ہوتا تو میں اپنی ماں کی لاش کے پاس بیٹھی روتی رہتی ......کسی دوسرے کی تنہا رہ جانے والی ماں کا دکھ بانٹنے یہاں نہیں آتی کسی ماں سے بچھڑ جانے والے بچے کے آنسو پونچھ کر اسے دلاسا دینے کی کوشش نہیں کرتی۔" سعدیہ نے سائب خان کو تصویر کا جو رخ دکھایا تھا وہ اس کے لیے سراسر اجنبی ہونے کے باوجود حقیقت پر مبنی تھا وہ شرمندگی سے کھڑا آنسو پونچھتی خود سے دور جاتی سعدیہ کو دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

آج موسم کا رنگ بدلا ہوا تھا برف باری رک چکی تھی اتنے دنوں سے وادی میں چکراتی یخ بستہ ہواؤں کا زور تھم گیا تھا اور ہر طرف خوشگواری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔

"آج کا دن بہت مناسب ہے یہاں سے نکلنے کے لیے" سعد عباسی نے گل جاناں سے سرگوشی کی۔

"میں تیار ہوں اپنی ضروری چیزیں میں نے ایک بیگ میں رکھ لی ہیں بس تم کسی طرح اس ڈائن پر قابو پالو۔ پھر ہم آزاد ہوں گے۔" گل جاناں نے بھی جواباً آہستہ سے اس کے کان میں کہا پھر وہ دونوں اٹھ کر بیرونی کمرے میں آگئے جہاں ادھیڑ عمر ملازمہ بیٹھی اپنے لیے سویٹر بن رہی تھی۔

"آج موسم اچھا ہے تمہیں چاہیے کہ خان کے آنے سے پہلے یہاں سے روانہ ہو جاؤ" سعد عباسی کی طرف دیکھتے ہوئے وہ تحکمانہ انداز میں بولی۔

"میں خود بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ لیکن تم دونوں عورتوں کی تنہائی کا خیال آجاتا ہے۔ خدانخواستہ اگر کوئی مسئلہ ہو گیا تو تم دونوں کیسے نمٹو گی۔" گل جاناں نے ملازمہ کے سامنے والی نشست سنبھال لی تھی جبکہ سعد عباسی بیٹھنے کے بجائے کمرے میں آہستہ آہستہ ٹہل رہا تھا۔

"تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں اکیلی ہی ہر خطرے سے نمٹ سکتی ہوں۔ اپنی اور بی بی کی حفاظت کا سامان ہے میرے پاس" ملازمہ نے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ایک ننھا پسٹل نکال کر انہیں دکھایا۔

"یقیناً تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اب میں بے فکر ہوں" وہ ٹہلتا ہوا اب ملازمہ کی پشت پر پہنچ چکا تھا۔

"گل جاناں! تم میرا سامان لے آؤ۔ میں فوری طور پر یہاں سے روانہ ہونا چاہتا ہوں۔" اس نے گل جاناں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تو ملازمہ جو سعد عباسی کے اپنی پشت کی طرف کھڑے ہونے سے کچھ چوکنا سی ہو گئی تھی پل بھر کو گل جاناں کی طرف متوجہ ہو گئی اور یہی وہ پل تھا جس کا سعد عباسی کو انتظار تھا۔ اس نے نزدیک پڑا بھاری ایش ٹرے اٹھا کر ملازمہ کے سر پر دے مارا ضرب کافی کاری تھی طاقتور ملازمہ چکرا کر کرسی پر ایک طرف لڑھک گئی۔ پسٹل اس کے ہاتھ سے نکل کر ایک قریبی صوفے کے



نیچے چلا گیا۔ "یہ طاقتور عورت ہے۔ زیادہ دیر بے ہوش نہیں رہے گی۔ تم رسی لے آؤ میں اسے اس کرسی کے ساتھ باندھ دوں گا۔" سعد عباسی نے ہدایت دی تو گل جاناں اسٹور روم کی طرف بڑھ گئی۔ وہاں رسی تلاش کر کے لانے میں اسے زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔

سعد عباسی رسی کی مدد سے ملازمہ کے جسم کو کرسی سے باندھنے لگا اس دوران میں گل جاناں اندرونی کمرے سے اپنا اور اس کا بیگ نکال کر لے آئی اب اس کے جسم پر لباس کے علاوہ کوٹ اور اونی ٹوپی کا بھی اضافہ ہو چکا تھا۔

"تم بھی یہ کوٹ اور ٹوپی پہن لو۔ موسم کسی بھی وقت اپنے تیور بدل سکتا ہے۔" اس نے سعد عباسی کو بھی ہدایت دی جس پر وہ عمل کرنے لگا گل جاناں اس دوران میں کمرے میں ادھر ادھر نظر دوڑا رہی تھی۔

"کیا ڈھونڈ رہی ہو؟" سعد عباسی نے اس کی متلاشی نگاہوں کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"اس منحوس ملازمہ کا پستول پتا نہیں کہاں گیا۔ اگر ہمارے پاس پستول ہو تو ہمیں آسانی رہے گی۔"

"ڈونٹ وری۔ خطرہ صرف یہاں سے نکلنے تک ہے۔ ہم ریسٹ ہاؤس پہنچ گئے تو میں اور میرے دوست مل کر سب سنبھال لیں گے۔ وہاں ہمارے پاس گاڑی اور ہتھیار سب موجود ہیں۔" سعد عباسی نے اسے تسلی دی اور دونوں بیگ اٹھا کر اپنے کاندھے پر لٹکا لیے۔ گل جاناں نے آخری نفرت انگیز نگاہ اس گھر پر ڈالی اور سعد عباسی کی ہمراہی میں قدم باہر کی طرف اٹھائے سعد عباسی نے بیرونی دروازہ کھولا تو سامنے کھڑے شخص کا دستک کے لیے اٹھتا ہاتھ پل بھر کو ساکت رہ گیا لیکن پھر جیسے وہ ساری سچویشن سمجھ گیا۔ بہت پھرتی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے پستول نکالا اور سعد عباسی پر تان دیا۔

"واپس اندر چلو۔" ارباز کی آواز میں غراہٹ تھی۔ سعد عباسی کے پاس حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہ تھا ہتھیار کے سامنے بہادری دکھانا حماقت تھی خوف سے کانپتی

گل جاناں کو اپنے بازو کے حصار میں لے کر وہ واپس اندر کی طرف مڑا پیچھے پستول بردار ارباز خان بھی تھا۔

''حرافہ! مجھے دھوکا دے کر بھاگ رہی تھی۔'' بندھی ہوئی بے ہوش ملازمہ کو دیکھ کر ارباز خان کا غصہ سوا نیزے پر جا پہنچا اور اس نے بائیں ہاتھ کا ایک زوردار تھپڑ گل جاناں کے منہ پر مارا۔

''عورت پر ہاتھ مت اٹھاؤ خان! مجھ سے بات کرو۔'' تھپڑ کھا کے دور جا گرنے والی گل جاناں کی طرف دیکھتے ہوئے سعد عباسی چلایا۔

''اس بڑھیا کو ہوش میں لاؤ۔'' ارباز خان نے سعد عباسی کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے گل جاناں کو حکم دیا۔ وہ وہاں رکھے پانی کے جگ میں سے پانی کے چھینٹے ملازمہ کے منہ پر مارنے لگی اس کوشش میں کافی سارا پانی زمین پر بھی گر گیا تھا کیونکہ گل جاناں اپنے خوف سے لرزتے ہاتھوں پر قابو نہیں رکھ رہی تھی۔

''خان! گل جاناں اس لڑکے کے ساتھ بھاگ رہی تھی۔ ان دونوں نے مل کر مجھے زخمی کیا اور اس کرسی سے باندھ دیا۔'' ہوش میں آتے ہی ملازمہ کی نظر ارباز خان پر پڑی تو وہ چلانے لگی۔

''میں نے کہا تھا ناں تم سے کہ کبھی میری قید سے آزاد ہونے کی کوشش نہ کرنا ورنہ نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا۔'' ارباز خان گل جاناں پر جھپٹا۔

''مجھے نفرت ہے تم سے میں تھوکتی ہوں تم پر۔ تم چاہے مجھے جان سے مار دو لیکن اب میں تمہارے ساتھ نہیں رہوں گی۔'' ارباز خان نے اس کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ رکھے تھے جس کی وجہ سے وہ شدید تکلیف محسوس کر رہی تھی لیکن اس کی زبان ارباز خان سے نفرت کا بھرپور اظہار کر رہی تھی۔

''خان! سنبھلو'' ملازمہ نے چیخ کر ارباز خان کو ہوشیار کیا تو وہ جھٹکے سے پلٹا اور خود پر حملہ آور ہوتے سعد عباسی پر گولی داغ دی گولی سعد عباسی کے پیٹ میں لگی اور وہ تیورا کر گر پڑا گل جاناں کے حلق سے دل دوز چیخ نکلی ارباز خان کی گرفت اس کے بالوں



پر ڈھیلی ہوگئی۔ وہ خود بھی پھٹی پھٹی نگاہوں سے سعد عباسی کے پیٹ سے نکلتے خون کے فوارے کو دیکھ رہا تھا گل جاناں دوڑتی ہوئی سعد عباسی تک پہنچی اور اس کا سر اپنے زانوؤں پر رکھ لیا۔

سعد! تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گی۔'' وہ دیوانہ وار اس کے چہرے کو چوم رہی تھی سعد عباسی نے اس کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ اس کے لب کچھ کہنے کو پھڑ پھڑائے اور پھر اس کے جسم کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور اس کی کھلی آنکھیں ویران ہوگئیں گل جاناں کو جیسے ہی اس کے ساکت ہونے کا احساس ہوا وہ خود بھی ساکت ہوگئی ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ دیوانہ وار سعد کو آوازیں دے رہی تھی لیکن اب اس کے ہونٹ آپس میں یوں پیوست ہوئے تھے گویا کبھی نہیں کھلیں گے ارباز خان نے ملازمہ کو بندشوں سے آزاد کیا ملازمہ نے گل جاناں کو سعد عباسی کی لاش سے الگ کر کے دور بٹھا دیا پھر وہ اور ارباز خان مل کر لاش کو ٹھکانے لگانے کی تدبیریں سوچنے لگے آخر کار طے ہوا کہ جب رات کا اندھیرا چھانے لگے گا تو ارباز خان سعد عباسی کی لاش کسی گہری کھائی میں پھینک آئے گا اس علاقے میں بہت سی ہزاروں فٹ گہری کھائیاں تھیں جہاں اگر ایک بار کچھ پھینک دیا جاتا تو قیامت تک اس تلاش کرنا ممکن نہ ہوتا ارباز خان نے سعد عباسی کی لاش کو ایک بڑی سی چادر میں لپیٹ دیا جبکہ ملازمہ فرش اور اردگرد کی چیزوں پر لگنے والے خون کے دھبے صاف کرتی پھر رہی تھی اپنی مصروفیات کے دوران وہ دونوں کبھی کبھی گل جاناں پر بھی نگاہ ڈال لیتے تھے جو شدید صدمے کے زیر اثر کسی قسم کا احتجاج کرنے کے لائق بھی نہیں رہی تھی۔

☆☆☆

وہ اپنی ماں سے بات کرنا چاہتا تھا۔ سہراب خان نے فون پر اسے بتایا تھا کہ تمہاری ماں تمہیں بہت یاد کر رہی ہیں وقت نکال کر انہیں فون کر لینا لیکن دن بھر مصروفیت میں اسے خیال نہیں رہا تھا شام کو وہ اپنے لیے مخصوص ٹینٹ میں آ کر لیٹا تو اسے اپنے باپ کی ہدایت یاد آئی اس نے اپنا موبائل فون نکال کر ماں سے رابطہ کرنا چاہا لیکن

یہاں سگنلز صحیح طرح نہیں مل رہے تھے مجبوراً اسے اٹھ کر باہر آنا پڑا کھلے ایریا میں رابطہ آسانی سے ہو گیا تھا۔

''وہ اس کی آواز سن کر بہت خوش ہوئیں اپنے اکلوتے بیٹے سے اتنے دن جدا رہنے کا تجربہ انہیں پہلی بار ہوا تھا اس لیے وہ اس کے لیے بہت پریشان بھی تھیں انہوں نے سائب خان کو اپنا خیال رکھنے کی کئی بار تاکید کی تھی ساتھ ہی وہ زلزلہ زدگان کے لیے بھی متفکر تھیں اس لیے شدید خواہش کے باوجود انہوں نے سائب سے واپس لوٹنے کو نہیں کہا تھا سائب اپنی ماں کی ہدایتوں پر انہیں تسلیاں دیتا ہوا برابر مسکرا رہا تھا اتنے بہت سارے بوجھل دنوں کے بعد ان کی آواز سننا تازہ ہوا کے جھونکوں کی طرح محسوس ہوا تھا مزاج کی یہ خوشگواری فون بند کرنے کے بعد بھی اس پر طاری رہی وہ دھیمی سی وسلنگ کرتا اپنے ٹینٹ کی طرف پلٹ رہا تھا کہ اسے ایک ٹینٹ سے سعدیہ نکلتی ہوئی دکھا دی۔

''تم ابھی تک یہیں ہو گھر واپس نہیں گئیں۔'' وہ اس کے قریب چلا گیا۔

''یہاں ایک عورت کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ڈلیوری کیس ہے زلزلے میں اس کے سارے گھر والے ختم ہو گئے ہیں اسے کوئی دلاسا دینے والا بھی نہیں میں اسی کی پاس رکی ہوئی ہوں ویسے بھی گھر مین میرے لیے ایسا کچھ نہیں جس کی خاطر میں گھر واپس جانے کی فکر کروں۔'' سائب خان نے دیکھا سعدیہ کے چہرے پر اداس سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

''سردی کافی زیادہ ہے۔ کیا خیال ہے ایک کپ کافی ہو جائے۔'' دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے اس نے سعدیہ سے پوچھا اور اس کے اثبات میں جواب دینے پر اسے اپنے ٹینٹ میں لے آیا اس وقت اس ٹینٹ میں وہ تنہا تھا اس کے ساتھ ٹینٹ شیئر کرنے والا ساتھی ڈاکٹر مریضوں کے پاس رکا ہوا تھا۔

''خوش لگ رہے ہو۔'' کافی بنانے کے دوران سائب خان کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ کو دیکھ کر سعدیہ نے پوچھا۔

''ہاں۔ ابھی ممی سے فون پر بات ہوئی ہے اس لیے۔'' سائب خان وجہ بتائی۔



''ماں دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے اس کے نہ ہونے سے دنیا ویران ہو جاتی ہے۔'' سعدیہ نے تبصرہ کیا۔

''ٹھیک کہا تم نے۔ میرے لیے میرے ممی پاپا سے بڑھ کر دنیا میں کوئی نہیں۔ ان دونوں میں سے ایک بھی مجھ سے دور ہو تو میں اداس ہو جاتا ہوں۔'' سائب خان نے کافی کی پیالی اس کے ہاتھ میں تھمائی۔

''ویری ٹیسٹی! اگر تم میری ماں کے ہاتھ کا قہوہ پی لیتے تو تمہیں دنیا کا ہر مشروب اس سے کم محسوس ہوتا۔'' سعدیہ کو آج اپنی ماں کی یاد زیادہ ستا رہی تھی۔ سائب خان نے اس کے چہرے پر چھائے اداسی کے سائے دیکھتے ہوئے سوچا اور پھر بولا۔

''تمہاری ماں کی موت قدرت کا فیصلہ تھا لیکن تمہارے پاس ابھی ایک اور قیمتی رشتہ موجود ہے۔ تمہیں اپنی ماں کے غم کو بھول کر اپنے باپ کا خیال رکھنا ہے۔ کیونکہ ان کا بھی زندگی بھر کا ساتھی ان سے جدا ہوا ہے تم سارا سارا دن اور اکثر راتوں کو بھی انہیں چھوڑ کر یہاں وقت گزارتی ہو۔ تنہائی کے ان لمحات میں انہیں تمہاری دلجوئی کی ضرورت ہے۔''

''اس شخص پر کسی کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ شخص ایک عذاب ہے جو جانے کس گناہ کی سزا میں قدرت نے ہم پر نازل کیا تھا میں اس شخص کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ کیونکہ اسے دیکھ کر مجھے اپنی ماں کی حسرت بھری زندگی اور اذیتیں ستانے لگتی ہیں۔'' سعدیہ کے لہجے میں کھلی تلخی نے سائب خان کو حیران کر دیا تھا۔ آخر ایسا کیا کیا تھا اس کے باپ نے جو وہ اس سے شدید نفرت کرتی تھی۔

☆☆☆

گل جاناں پر طاری ہونے والا سکتہ کئی دن گزر جانے کے بعد بھی نہیں ٹوٹا تھا۔

ارباز خان اور اسکی ملازمہ کا خیال تھا کہ وہ سعد عباسی کی موت پر روئے گی چیخے چلائے گی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ گل جاناں مٹی کی مورت بن کر رہ گئی

تھی جسے جہاں بٹھایا جاتا بیٹھ جاتی ملازمہ منہ میں کھانے کو کچھ رکھتی تو چند لقمے نگل لیتی ۔ارباز خان کو اس کے انداز سے بے حد وحشت ہو رہی تھی وہ اس کے سامنے بہت چیخا چلایا تھا۔یہاں تک کے اپنے ہاتھوں سے اس کے وجود کو جھنجوڑ کر رکھ دیا لیکن گل جاناں کی خاموشی نہیں ٹوٹی تھی ۔

''خان !ابھی یہ صدمے میں ہے اسے سنبھلنے کا موقع دو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا ذہن خود ہی حقیقت کو قبول کر لے گا ملازمہ نے ارباز خان کو مشورہ دیا تھا اور وہ بکتا جھکتا گھر سے چلا گیا تھا برف باری کا یہ زمانہ عموماً وہ شہر میں ہی گزارا کرتا تھا ارباز خان کی غیر موجودگی میں ملازمہ نے گل جاناں کا مکمل خیال رکھا تھا نہایت سخت دل ہونے کے باوجود وہ بھی ایک عورت ہی تھی جسے گل جاناں کی دگرگوں حالت نے اسکے ساتھ نرمی مجبور کر دیا تھا گزرتے وقت کے ساتھ ملازمہ کو احساس ہوا کہ گل جاناں کے وجود میں تبدیلیاں رونما ہو رہی تھی ملازمہ اس صورت حال پر سخت پریشان تھی ۔ارباز خان کی غیر موجودگی میں وہ کوئی قدم بھی نہیں اٹھا سکتی تھی تین ماہ بعد جب ارباز خان واپس آیا تو گل جاناں کے حاملہ ہونے کا سن کر شدید طیش میں آ گیا۔

''میں شہر لے کر جا کر گل جاناں کی اس غلطی کو مٹا دوں گا۔''

''وقت کافی گزر چکا ہے خان !اب اس کام میں خطرہ ہے۔''ملازمہ نے اسے احساس دلایا۔اس پل گل جاناں کسی بپھری شیرنی کی طرح ارباز خان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

اگر تم نے سعد کی نشانی کو مجھ سے جدا کرنے کی کوشش کی تو میں تم سب کو تباہ کر کے رکھ دوں گی میرے بچے کی موت میری موت ہو گی اور میں جانتی ہوں تم میرا مرنا برداشت نہیں کر سکتے میں تمہاری جیبیں بھرنے کا ذریعہ ہوں۔اگر میں نہ رہی تو تمہاری سارے عیش بھی ختم ہو جائیں گے۔''گل جاناں کی باتوں پر شدید طیش میں آنے کے باوجود ارباز خان کو اس کی بات ماننی پڑی تھی بچے کی ولادت تک اس نے خاموشی سادھ لی تھی اور جب گل جاناں نے ایک نہایت حسین وجمیل بیٹی کو جنم دیا تو اس کے ساتھ ساتھ



ارباز خان کو بھی بے حد خوشی محسوس ہوئی بچی اپنی ماں کا عکس تھی البتہ اس کی سیاہ آنکھیں اور بال یقیناً باپ پر گئے تھے گل جاناں سعد عباسی کی نشانی کو اپنی گود میں پا کر خوش تھی تو ارباز خان کو بھی گل جاناں کی بیٹی کی شکل میں اپنا مستقبل روشن دکھائی دے رہا تھا گل جاناں نے سعد کے نام کی مناسبت سے بیٹی کا نام سعدیہ رکھا تھا سعدیہ اس کی آنکھ کا تارہ تھی جسے ہر سرد وگرم سے محفوظ رکھنے کے لیے گل جاناں ایک بار پھر ارباز خان کے اشاروں پر چلنے لگی تھی لیکن وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی کو اس کی حقیقت پتا چلے اس لیے سعدیہ کے اسکول جانے کے لائق ہوتے ہی اس نے اسے اسلام آباد کے ایک اسکول میں داخل کرا دیا تھا جہاں وہ بورڈنگ میں رہتی تھی چھٹیوں میں جب سعدیہ ماں کے پاس آتی تو گل جاناں اپنی مصروفیات محدود کر دیتی اب وہ لوگ پہاڑی رہائش گاہ کو چھوڑ کر بالاکوٹ شہر میں آ بسے تھے جہاں ارباز خان کو گاہک ڈھونڈنے میں زیادہ آسانی تھی ارباز خان کی ملازمہ سالوں بعد دل کے دورے سے مر گئی تھی لیکن اب گل جاناں کے دل میں فرار کا کوئی خیال نہ تھا اپنی بیٹی کی بہترین تعلیم اور پرورش کے لیے اسے رقم کی ضرورت تھی جس کا واحد ذریعہ ارباز کا دکھایا ہوا راستہ تھا۔سعدیہ کو تعلیمی اخراجات کے علاوہ بھی وہ اچھی خاصی رقم بھیجتی تھی ۔جوں جوں سعدیہ بڑی ہوتی جا رہی تھی گل جاناں اس کو گھر سے دور رکھنے کی کوشش کر رہی تھی اکثر چھٹیوں میں وہ سعدیہ کو دوستوں کے ساتھ ادھر ادھر گھومنے جانے کی ترغیب دیتی اس سلسلے میں اس کے پاس رقم کی کوئی کمی نہیں تھی کبھی وہ خود بھی سعدیہ کے پاس شہر میں جا کر رک جاتی سعدیہ کے بہت ضد کرنے پر اگر وہ اسے گھر آنے کی اجازت دیتی تھی تو اس کی پوری کوشش ہوتی کہ وہ ارباز خان کے ساتھ گھل مل نہ سکے سعدیہ کے گھر پر قیام کے دوران میں گل جاناں کی پوری کوشش ہوتی کہ وہ سر شام ہی سو جائے اور سعدیہ کو حیرت ہوتی تھی کہ وہ واقعی اپنی ماں کی خواہش کے مطابق اسے اسلام آباد کے معمول کے برعکس بہت جلدی سو جاتی تھی ۔

☆☆☆

''میں زلزلے میں اپنی ماں کے مرنے کی خبر سن کر یہاں آئی تھی اپنی ماں کی

موت اور اس کے آخری دیدار سے محرومی نے مجھے توڑ کر رکھ دیا میں پاگلوں کی طرح دن بھر ان کے کمرے میں ان کی چیزوں سے لپٹ لپٹ کر روتی رہتی اور انہی دنوں مجھے ان کی ڈائری ملی اس ڈائری نے مجھے اپنی ماں کی زندگی کے ان گوشوں کی جھلک دکھائی جو ہمیشہ مجھ سے پوشیدہ رہے تھے۔ مجھے ان سوالوں کے جواب ملے جو مجھے پریشان کرتے رہتے تھے مجھے پتا چلا کہ میری ماں نے مجھے ہمیشہ خود سے دور کیوں رکھا وہ کیوں مجھے ارباز خان کے نزدیک نہیں جانے دیتی تھیں وہ میرے یہاں قیام کے دنوں میں سرشام مجھے دودھ میں نشہ آور دوا گھول کر پلا دیتی تھیں تا کہ میں نیند کی آغوش میں کھو کر اپنی ماں پر گزرنے والے کرب سے غافل رہوں میرے باپ کے ساتھ گزارے وہی چند دن ان کی زندگی کا حاصل تھے انہوں نے میرے باپ کو بہت ٹوٹ کر چاہا تھا اور میں ان کی چاہت کی نشانی تھی جسے مٹنے سے بچانے اور ہر طرح کا آرام دینے کے لیے وہ خود اذیتوں میں جلتی رہیں دنیا کی نظر میں وہ خواہ کچھ بھی ہوں میرے لیے صرف ایک ماں ہیں......ایک عظیم ماں جنہوں نے اولاد کی خاطر سب کچھ تج دیا یہ خیال کہ میں کسی کی ناجائز اولاد ہوں تکلیف تو دیتا ہے لیکن ارباز خان جسے غلیظ آدمی کی جائز اولاد ہونے کے مقابلے میں یہ بہت بہتر ہے میری ماں نے کس کی ہوس کو مجبوری میں اپنی کوکھ میں نہیں پالا۔ انہوں نے نو ماہ بہت پیار سے اپنے محبوب کی نشانی کو اپنے خون سے سینچا تھا۔ چاہے لوگ مجھے ناجائز کہیں لیکن میں خوش ہوں کہ میں دو محبت کرنے والوں کے پیار کی نشانی ہوں۔ تم جس شخص کا خیال رکھنے کی مجھے تاکید کر رہے ہو وہ شخص میرا باپ نہیں بلکہ میرے باپ کا قاتل ہے۔"

سعدیہ نے اپنی زندگی کا ایک ایک ورق سائب خان کے سامنے کھول دیا تھا شاید خود پر ہونے والے انکشافات کا بوجھ وہ بہت دن سے تنہا اٹھاتے اٹھاتے تھک گئی تھی جو آج سائب خان کے سامنے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر بیٹھی۔

"تم میری تہی دامنی کا اندازہ نہیں لگا سکتے سائب خان! میرے پاس دنیا میں ایک ہی رشتہ تھا اور اب وہ بھی نہیں رہا۔ لیکن میں سوچتی ہوں شاید اچھا ہی ہوا میری ماں



اپنی تکلیفوں سے نجات پا گئیں۔ یہ زلزلہ چاہے لوگوں کے لیے آفت ہو لیکن میری ماں کے لیے نجات کا ذریعہ بنا۔ اگر مر جانا عذاب ہوتا تو یہ عذاب ارباز خان پر ٹوٹتا لیکن دیکھ لو وہ ساٹھ سال کی عمر میں بھی بالکل ٹھیک ٹھاک اس زمین پر اکڑ کر چل رہا ہے۔ اور میری ماں صرف اڑتیس سال کی عمر میں یہ دنیا چھوڑ کر جا چکی ہے اگر یہ زلزلہ کوئی قہر تھا تو میں کہتی ہوں یہ قہر ایک بار پھر دھرتی پر نازل ہونا چاہیے کیونکہ ارباز خان اور اس جیسے کئی ناسورا بھی تک اس دھرتی پر سانس لے رہے ہیں۔ تم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں نا ہوس زر میں عورتوں اور بچوں کا سودا کرنے والے شقی القلب۔ نفس کی آواز پر لبیک کہنے والے شیطان جو اتنے بڑے سانحے کے بعد بھی خدا کے عذاب سے نہیں ڈرے......" سائب خان کے سامنے بیٹھی لڑکی سراپا درد تھی جس کے زخموں پر سائب خان کے لفظ مرہم نہیں رکھ سکتے تھے اس کا درد اپنے دل میں محسوس کرتا وہ خاموش بیٹھا رہا۔

☆☆☆

سائب خان نے تاسف سے ایک تین سالہ بچے کی بین کرتی ماں کو دیکھا بڑھتی ہوئی سردی اور ناکافی سہولیات چھوٹے بچوں کو سب سے زیادہ متاثر کر رہی تھیں نمونیا کا شکار ہو کر مرنے والا یہ پہلا بچہ نہیں تھا لیکن ڈاکٹرز مجبور تھے کیونکہ یہ بچے اس حالت میں ان تک لائے جا رہے تھے جہاں آ کر دوائیں بھی کام کرنا چھوڑ دیتی ہیں۔ سائب خان تھکے تھکے قدموں سے باہر آ گیا۔ سامنے سے کیپٹن نوید آ رہا تھا۔

"میں نے سنا ہے کہ ایک اور بچہ......" اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

سائب خان صرف اثبات میں سر ہلا سکا۔

"اف میرے خدا! رحم فرما دے مالک یہ ایک بچہ نہیں تھا یہ ہمارا مستقبل تھا ان معصوم روحوں کو قبروں میں دفن کرتے میرے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ جب کل ہم مریں گے تو ہمارے جنازے کو کندھا دینے کے لیے کچھ ہاتھ موجود بھی ہوں گے یا نہیں!" کیپٹن نوید سخت اپ سیٹ ہو گیا تھا۔

"حوصلہ کریں کیپٹن صاحب......! اگر آپ جیسے لوگ ہی حوصلہ ہار دیں گے تو

کون ان لوگوں کو سہارا دے گا۔" سائب خان نے انہیں سمجھایا۔

"ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ لیکن بس یونہی کبھی کبھی اپنے جذبات پر قابو نہیں رہتا۔ خیر چلتا ہوں میرے ساتھی میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ آج ہمیں الائی کے قریب کچھ چھوٹی بستیوں میں امداد پہنچانی ہے۔"

"لیکن آج تو موسم کافی خراب ہے۔ ہیلی کاپٹر کا پرواز کرنا خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔" کیپٹن نوید کا مصافحے کے لیے بڑھا ہاتھ تھامتے ہوئے سائب خان نے تشویش کا اظہار کیا۔

"خطروں سے کھیلنا تو ہماری زندگی کا مشن ہے۔" کیپٹن نوید مسکرایا کچھ دیر پہلے طاری ہو جانے والی مایوسی کی جگہ اب اس کی آنکھوں میں عزم نے لے لی تھی۔

"آج سعدیہ بھی نہیں آئی۔ بچے اسے یاد کر رہے ہیں۔" کیپٹن نوید کے جاتے ہوئے قدموں پر نظر جمائے اس نے سوچا سعدیہ کچھ نہ کرنے کے باوجود ان لوگوں کے لیے بہت معاون تھی مریض عورتوں اور بچوں کو خصوصاً اس کا انتظار رہتا تھا۔ وہ ان کا دل بہلانے اور دلاسا دینے میں پیش پیش رہتی تھی۔ امدادی کارکنان کے ساتھ بھی اس کا رویہ بہت اچھا تھا وہ ان کے کھانے پینے اور آرام کا دھیان رکھتی تھی۔ سائب خان ہر گزرتے دن کے ساتھ اسے خود سے قریب محسوس کر رہا تھا۔ سعدیہ کے متعلق سوچتا ہوا وہ خیموں کی قطاروں میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

"ہیلو ڈاکٹر سائب!" ایک اخباری نمائندہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"ہیلو۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے آپ کا نام شاہد۔" سائب نے یادداشت پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"بالکل ٹھیک پہچانا آپ نے۔" شاہد نے اس کی تصدیق کی۔

"لگتا ہے کسی نئی خبر کی تلاش میں ہیں؟" سائب نے اس کے کندھے پر لٹکے کیمرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"خبر تو مل چکی ہے۔ اس چکر میں ہوں کہ تصدیق ہو جائے۔ معاملہ حساس



ہے اس لیے بغیر ثبوت کے آگے نہیں بڑھایا جا سکتا۔" اس نے آواز دھیمی کر کے سائب سے کہا۔

"خیریت! ایسا کیا ہو گیا؟" سائب نے پوچھا۔

"اس شرط پر بتاؤں گا کہ آپ کو جیسے ہی کوئی سن گن ملے ضرور خبر دیجئے گا۔" شاہد کا انداز مزید رازدارانہ ہو گیا۔

"آپ کہیے تو۔"

"اطلاع ملی ہے کہ لاوارث بچوں میں سے ایک گیارہ بارہ سال کا بچہ غائب ہے۔ لڑکا شاید کل شام یا رات کو غائب ہوا ہے لیکن خبر صبح کے وقت جا کر ہوئی اب یہ لوگ اسے خاموشی سے تلاش کر رہے ہیں۔ مجھے بھی اس لڑکے کے ساتھ رہنے والے ایک دوسرے لڑکے نے بتایا ہے ورنہ یہ خبر ابھی تک خاص خاص لوگوں تک ہی محدود ہے۔"

شاہد سے ملنے والی اطلاع بہت تشویشناک تھی۔

"کیا نام تھا بچے کا؟"

"جہانزیب۔" شاہد نے جواب دیا۔

☆☆☆

سعدیہ نے آنکھ کھلنے پر گھڑی کی طرف دیکھا۔ آج اسے اٹھنے میں دیر ہو گئی تھی۔ وہ جلدی سے بستر چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ ضروریات سے فارغ ہو کر تیار ہونے میں اسے صرف پندرہ منٹ لگے اور ناشتے کا ارادہ ترک کرتی وہ اپنا بیگ اٹھا کر کمرے سے باہر نکلی اس کے تیزی سے اٹھتے قدم ارباز خان کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے ٹھٹک گئے اسے کمرے سے کوئی عجیب سی آواز سنائی دی تھی۔ یہ آواز کیسی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پائی اس نے دروازے سے کان لگا کر غور کرنے کی کوشش کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں یوں لگتا تھا کہ کوئی شخص یا جانور خرخرا رہا ہو۔ خرخراہٹ کی یہ گھٹی گھٹی آواز ارباز خان کی نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ سعدیہ دیکھ رہی تھی کہ دروازے پر باہر سے تالا لگا ہے اور تالا لگانے والا ارباز خان کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔

"کیا سننے کی کوشش کر رہی ہو؟" اپنی پشت سے سنائی دینے والی آواز پر وہ چونک کر پلٹی ارباز خان آہنی چھری ہاتھ میں لیے اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

"اندر کوئی ہے۔ مجھے کسی کی آوز سنائی دے رہی ہے۔" وہ ارباز خان کو سامنے پا کر قدرے گھبرا گئی تھی۔

"آؤ تمہیں ملواتا ہوں۔" ارباز خان نے جیب سے چابی نکالی اس کا لہجہ سعدیہ کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ پیدا کر رہا تھا۔ لیکن وہ اپنے تجسس کو مٹائے بغیر وہاں سے نہیں جانا چاہتی تھی۔

"آؤ اندر آجاؤ۔" ارباز خان نے دروازے کھول کر اسے اندر آنے کی دعوت دی سعدیہ ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہوئی کمرے میں نیم تاریکی تھی اور اندر کا منظر ٹھیک سے دکھائی نہیں دے رہا تھا البتہ خرخراہٹ کی آوازیں کچھ اور واضح ہو گئی تھیں ارباز خان نے سوئچ بورڈ پر ہاتھ مارا اور کمرا روشن ہو گیا۔ روشن کمرے کے منظر نے سعدیہ کے وجود میں سرد لہر دوڑا دی۔

"جہانزیب۔" وہ دوڑتی ہوئی ایک کونے میں گٹھری بنے بچے تک پہنچی تھی۔ بچے کے منہ پر پٹی بندھی تھی لہٰذا وہ بولنے کی کوشش میں صرف خرخرا سکتا تھا۔ سعدیہ اس کے منہ پر بندھی پٹی کھولنے کی کوشش کرنے لگی وہ اس بچے کو اچھی طرح جانتی تھی۔ لاوارث بچوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے وہ اس سے کئی دفعہ ملی تھی وہ سرخ و سفید صحت مند بچہ اس کے سامنے پڑا خود پر گزرے ہوئے حادثے کی داستان سنا رہا تھا۔ سعدیہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"ظالم' درندے! اپنی مکروہ خواہش کو پورا کرنے کے لیے تم نے اس معصوم کو نشانہ بنا ڈالا خدا کا اتنا غضب دیکھ کر بھی تم نہیں سدھرے نہ جانے کتنے معصوموں کا خون ہو گا تمہاری گردن پر میری ماں تمہارے ظلم سہتے سہتے مرگئی لیکن تمہارے دل پر لگی مہر نہیں ٹوٹی۔ تم اتنے گھناؤنے کردار کے مالک ہو کہ تمہارے جسم کو بوٹی بوٹی کر کے چیل کووں کے سامنے ڈال دینا چاہیے۔" جہانزیب کو خود سے چمٹائے وہ بے تحاشا چیخ رہی



تھی۔

"لگتا ہے بہت کچھ جان گئی ہو میرے بارے میں خیر ایک طرح سے اچھا ہے۔ اب جب میں تمہیں تمہارے خریداروں کے حوالے کروں گا تو تمہیں زیادہ حیرت نہیں ہو گی تمہاری ماں کے بعد میری آمدنی کا ذریعہ بند ہو گیا تھا اب تمہیں بیچ کر میں اکٹھی رقم حاصل کرلوں گا۔ اس عمر میں گاہکوں کے پیچھے بھاگنے کی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔" وہ اتنے اطمینان سے اپنے مکروہ عزائم بتا رہا تھا جیسے ریڈیو پر موسم کا حال سنا رہا ہو۔

"میں تجھے قتل کر دوں گی۔ میں اپنی ماں کی طرح بزدل نہیں ہوں۔" سعدیہ بپھر کر کھڑی ہو گئی تھی۔ ارباز خان آرام سے کھڑا اسے اپنی طرف بڑھتے دیکھتا رہا۔ جیسے ہی سعدیہ اس کے قریب پہنچی اس کا جیب میں رکھا بایاں ہاتھ باہر آیا اس ہاتھ میں ایک چھوٹی سی بوتل دبی تھی جس کا بٹن پریس کرتے ہی محلول کی بوچھاڑ باہر نکلی اور سیدھی سعدیہ کے چہرے پر پڑی یہ محلول یقیناً بے ہوشی کی دوا پر مشتمل تھا جس کی مہک سانس کے ساتھ اندر پہنچتے ہی سعدیہ تیورا کر فرش پر گر گئی۔

"ارباز خان اپنے مخصوص شاطرانہ انداز میں مسکرایا اور ایک الماری سے رسی نکال کر سعدیہ کو باندھنے لگا۔ پرسوں تک اس کا گاہک یہاں پہنچ رہا تھا اس کے بعد ارباز خان کی ذمے داری ختم ہو جاتی تھی۔ کمسن جہانزیب اس دوران سراسیمگی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"فکر مت کرو شہزادے! تمہیں تو میں ہمیشہ اپنے پاس رکھوں گا۔ عیش کرو گے تم میرے پاس بتاؤ کیا کھاؤ گے۔ دودھ انڈے مکھن ......سب کچھ موجود ہے۔" وہ جہانزیب کی طرف بڑھا تو اس نے ڈر کر رخ موڑ لیا۔ یہ بڈھا کل ان ہی چیزوں کا لالچ دے کر بہلا پھسلا کر اسے اپنے گھر لایا تھا اپنے خیمے سے ذرا فاصلے پر کھیلتے جہانزیب کو جب کل ارباز خان ملا تھا وہ اسے بہت مہربان آدمی لگا تھا لیکن رات اس نے جس بربریت کا مظاہرہ کیا تھا اسے پوری طرح نہ سمجھنے کے باوجود کم سن جہانزیب اس سے سخت خوفزدہ

تھا۔

☆☆☆

آج دوسرا دن ہو گیا تھا سعدیہ نہیں آئی تھی ۔سائب خان اس کی طرف سے سخت تشویش میں مبتلا تھا۔ویسے تو یہ بھی ممکن تھا کہ وہ بیمار ہو لیکن ارباز خان کے کردار کو جاننے کے بعد وہ سعدیہ کی غیر حاضری سے خود کو مطمئن نہیں کر پا رہا تھا اس کی یہ پریشانی اسے کیپٹن نوید تک لے گئی۔

"کیسے ہو ڈاکٹر؟" کیپٹن نوید اسے سامنے پا کر مسکرایا۔

"میں ٹھیک ہوں لیکن مجھے سعدیہ کی فکر ہے وہ دو دن سے یہاں نہیں آئی میرے خیال میں ہمیں اس کی خیریت معلوم کرنی چاہیے۔" اس نے فوراً ہی اپنا مدعا بیان کیا۔

"اس میں پریشانی کی کیا بات ہے اتنے دنوں سے وہ ریگولر یہاں آ رہی ہے تھک گئی ہو گی ۔اس قسم کے حالات عموماً لوگ گھبرا جاتے ہیں ۔" کیپٹن نوید کے جواب نے اسے کچھ اور مضطرب کر دیا مگر وہ اسے سعدیہ کے حالات بھی نہیں بتانا چاہتا تھا۔

"سعدیہ بہت باہمت لڑکی ہے کیپٹن! مجھے یقین ہے کہ اس کی غیر موجودگی کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہے۔" اس نے زور دیا۔

"ہو سکتا ہے وہ بیمار ہو۔آپ آج کے دن مزید دیکھیں ۔اگر وہ کل بھی نہیں آئی تو میں اس کی خیریت معلوم کروانے کی کوشش کروں گا۔فی الحال مجھے ایک بہت اہم مہم پر جانا ہے۔" کیپٹن نوید کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ سعدیہ کی غیر حاضری کو زیادہ سیریس نہیں لے رہا۔ اس کی طرف سے مایوس ہو کر سائب خان واپس پلٹ گیا سارا دن مریضوں کے درمیان بھی اس کے ذہن پر سعدیہ کا خیال غالب رہا۔شام ہونے تک اس کی بے چینی اتنی بڑھی کہ وہ سعدیہ کے بتائے ہوئے مقام کی طرف بڑھنے لگا۔سعدیہ نے ایک دن باتوں باتوں میں اپنے گھر کی لوکیشن اسے بتائی تھی اور اب وہ اسی کے مطابق اونچے نیچے راستوں پر پیدل چلا جا رہا تھا۔راستے میں جگہ جگہ اس نے ملبے کا ڈھیر بنی عمارتیں دیکھیں ملبے کے نیچے بے بسی سے دم توڑ جانے والی زندگیوں کے بارے میں





سوچتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دھند اتر آئی اور وہ سامنے پڑا بڑا سا پتھر نہ دیکھ سکا۔ اسے لگنے والی ٹھوکر بہت شدید تھی نتیجتاً اس کا توازن بگڑا اور وہ ڈھلوان سطح پر دور تک لڑھکتا چلا گیا سخت اور کھردری زمین پر بکھرے پتھر اس کا مزاج اچھی طرح پوچھتے گئے سنبھل کر کھڑے ہونے کے بعد اس نے اپنے جسم کو ٹٹولا۔متعدد خراشوں کے باوجود اس کی تمام ہڈیاں سلامت تھیں البتہ پیشانی سے اٹھنے والی ٹیس شدید تھی۔اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنی پیشانی کو ٹٹولا۔اس کی انگلیوں نے خون کی چپچپاہٹ محسوس کی۔ اصولاً تو اسے واپس کیمپ کی طرف لوٹ جانا چاہیے تھا لیکن کوئی انجانا سا جذبہ تھا جو اسے سعدیہ کے گھر کی طرف کشاں کشاں لیے جا رہا تھا۔اجنبی راستوں پر لوگوں سے پوچھتے ہوئے وہ ارباز خان کے دروازے پر جا پہنچا۔اس علاقے میں صحیح سلامت رہ جانے والے چند گھروں میں سے ایک گھر ارباز خان کا بھی تھا سائب خان نے کچھ دیر وہاں کھڑے ہو کر سوچا اور پھر دروازے پر دستک دی۔

"کس سے ملنا ہے؟" تھوڑی دیر بعد ایک خرانٹ سا بوڑھا دروازے پر نمودار ہوا تھا۔

"میں ڈاکٹر سائب ہوں۔زلزلہ زدگان کے لیے لگائے گئے امدادی کیمپ میں کام کرتا ہوں۔سعدیہ بھی وہاں ہوتی ہیں دو دن سے وہ آئیں نہیں اس لیے میں ان کی خیریت معلوم کرنے آیا ہوں۔" بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی اور انگوٹھے کو آنکھ کے نیچے آنے والی خراش پر رکھتے اس نے اپنے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ پھیلاتے ہوئے اپنی آمد کی وجہ بتائی۔

"سعدیہ کی طبیعت خراب ہے اس لیے وہ نہیں آ سکی۔" بوڑھے نے بتایا۔

"کیا میں انہیں دیکھ سکتا ہوں؟" سائب خان نے بے تابی سے پوچھا۔

"نہیں وہ اس وقت سو رہی ہے ویسے بھی میں اسے دوا دے چکا ہوں اس لیے تمہاری مدد کی کوئی ضرورت نہیں۔" بوڑھے نے بداخلاقی سے جواب دے کر دروازہ بند کر لیا۔اگرچہ وہ سائب کی پیشانی پر چوٹ سے نکل کر جم جانے والا خون دیکھ چکا تھا لیکن

اس نے اس سلسلے میں کسی استفسار کی زحمت نہیں کی تھی سائب خان سے دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ ارباز خان ہے جو کسی وجہ سے اسے سعدیہ سے ملنے نہیں دینا چاہتا تھا اور ظاہر ہے سائب خان اسے مجبور نہیں کر سکتا تھا سو وہ مایوسی سے واپس آتے ہوئے مسلسل سعدیہ کے بارے میں سوچ رہا تھا سعدیہ کا عکس اس آنکھوں کی میں ہلکورے لے رہا تھا دو دن پہلے جب اس نے سعدیہ کو دیکھا تھا تو وہ سرمئی رنگ کی قمیض شلوار پہنے ہوئی تھی ۔اس نے اپنے ریشمی بالوں کو کھلا چھوڑ رکھا تھا ۔اس کے صبیح رخساروں کو چومتی بالوں کی لٹیں بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں ۔وہ ایک انتہائی خوبصورت لڑکی تھی جس کی بڑی بڑی آنکھوں میں چھائی اداسی نے اس کے حسن کو سوگوار سا تاثر دے رکھا تھا ۔سائب خان یقیناً اس سوگوار حسن کے عشق میں مبتلا ہو چکا تھا البتہ وہ نہیں جانتا تھا کہ اونچے اونچے سنگلاخ پہاڑوں کے درمیان بسنے والی سعدیہ کے دل تک اس کے خوبصورت جذبے رسائی حاصل بھی کر سکیں گے یا نہیں ۔

☆☆☆

کیپٹن نوید نے جھنجھلا کر اسٹیرنگ پر مکا مارا ۔منزل کے بالکل قریب پہنچ کر جیپ خراب ہو گئی تھی ۔پورا دن امدادی کارروائیوں میں گزارنے کے بعد اس وقت وہ لوگ واپس لوٹ رہے تھے ۔مقامی ہونے کی وجہ سے ڈرائیونگ کی ذمے داری کیپٹن نوید نے اٹھا رکھی تھی لیکن جیپ کے خراب ہونے کا مطلب تھا کہ واپسی کا باقی سفر پیدل طے کرنا ہوگا ۔ناچار وہ اور اس کے ساتھی جیپ سے نیچے اتر آئے ”کیپٹن !وہ دیکھیں کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آ رہی ہیں......لگتا ہے کوئی جیپ اس طرف آ رہی ہے ۔“چند قدم چل کر ہی اس کے ایک ساتھی نے اسے متوجہ کیا۔

”ٹھیک ہے اسے روکو ۔ہو سکتا ہے ہمیں لفٹ مل جائے ۔“

کیپٹن نوید کے کہنے پر اس کے ساتھی نے گاڑی کو رکنے کا اشارہ کیا۔

”کیا بات ہے سر جی !“

ڈرائیور سیٹ پر بیٹھے شخص نے ان کے فوجی یونیفارمز کو دیکھتے اپنے کھردرے لہجے کو



قدرے نرم بنانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

”خان !ہماری گاڑی خراب ہو گئی ہے ہمیں اپنے کیمپ تک لفٹ چاہیے ۔“

کیپٹن نوید نے اپنا مدعا بیان کیا۔

”لیکن ہم لوگ تو شہر کی طرف جا رہے ہیں ۔“

اس نے گویا انکار کیا۔

”اس وقت ؟“

کیپٹن نوید کو حیرت ہوئی ۔

”سر !پیچھے سیٹوں کے درمیان کوئی عورت پڑی ہے شاید بے ہوش ہے ۔“

کیپٹن نوید کے ساتھی نے اس کے کان میں سرگوشی کی ۔

”سر جی !ہمیں اجازت دیں ۔ہمیں شہر پہنچنے کی جلدی ہے ۔“

وہ لوگ کچھ بے چین سے ہو گئے تھے ۔

”ہمیں تمہاری گاڑی کی تلاشی لینی ہے تم نیچے اتر آؤ ۔“

کیپٹن نوید نے یک دم ہی اپنی گن اس پر تان دی ۔اس کے ساتھی بھی اسکے ساتھ چوکنے ہو گئے تھے ۔

”ہم شریف لوگ ہیں آپ ہماری گاڑی کی تلاشی لے کر کیا کریں گے ۔“

”جو کہا ہے اس پر عمل کرو ۔ہاتھ اٹھا کر جیپ سے باہر آ جاؤ ۔“

بالآخر جیپ کے ڈرائیور اور اس کے ساتھی کو حکم کی پیروی کرنی پڑی ۔

”ان کی تلاشی لے کر ان کے ہتھیار چھین لو ۔“

کیپٹن نوید نے آرڈر دیا چند ہی لمحوں میں جیپ میں آنے والے دونوں افراد نہتے ہو چکے تھے ۔اگر چہ وہ خود بھی کافی خطرناک لوگ لگ رہے تھے لیکن چار فوجی جوانوں سے اچانک سامنا ہو جانے سے انہیں مزاحمت کا موقع نہیں مل سکا تھا ۔

”سعدیہ !“

جیپ کے پچھلے حصے میں بے ہوش پڑی لڑکی پر ٹارچ کی مدد سے روشنی ڈالنے

پر کیپٹن نوید چونک اٹھا۔اسے اچانک ہی سائب خان کی سعدیہ کے لیے تشویش یاد آئی۔

''کہاں لے جارہے ہو اس لڑکی کو؟''

کیپٹن نوید نے گرج کر پوچھا۔

''یہ میری گھر والی ہے۔دو تین دن سے بیمار ہے۔شہر ڈاکٹر کو دکھانے لے جا رہے ہیں۔''

ڈرائیور جواب تک خاموش رہا تھا بولا۔

''جھوٹ بولتے ہو!''

کیپٹن نوید کا زوردار تھپڑ اس کے منہ پر پڑا۔

''رستم! انہیں گاڑی میں بٹھاؤ۔مجھے یہ معاملہ بہت گڑبڑ لگ رہا ہے۔''

کیپٹن نوید کے آرڈر پر اس کے ساتھی دونوں افراد کو جیپ میں بٹھانے لگے جبکہ ڈرائیونگ کی ذمے داری ایک بار پھر کیپٹن نوید نے سنبھال لی تھی۔

☆☆☆

سائب خان اپنے خیمے میں سو رہا تھا کہ اس کے ساتھی ڈاکٹر نے اسے جھنجوڑ کر جگایا۔

''باہر ایک آدمی آیا کھڑا ہے کہتا ہے تمہیں کیپٹن نوید بلا رہے ہیں۔''

''اس وقت!''

وہ حیرت سے آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

''ہوں۔شاید کوئی مریض ہے۔میں نے کہا بھی کہ اگر کوئی ایمرجنسی ہے تو میں دیکھ لیتا ہوں لیکن وہ آدمی کہتا ہے کیپٹن صاحب نے صرف تمہیں ساتھ لانے کو کہا ہے۔''

اپنے ساتھی کی بات سن کر سائب خان کی تشویش کچھ اور بھی بڑھ گئی جلدی میں ایک گرم چادر اوڑھ کر وہ اپنا میڈیکل باکس ساتھ لے کر باہر نکلا۔باہر تیز بستہ ہوائیں چل رہی تھیں۔

''خیر تو ہے؟'' وہ انتظار میں کھڑے شخص سے پوچھے بنا نہیں رہ سکا تھا۔



''اس بارے میں کیپٹن صاحب آپ کو زیادہ بہتر بتا سکتے ہیں۔''

اس شخص نے کوئی واضح جواب دینے سے گریز کیا سائب خان کی تشویش میں اضافہ ہوگیا۔تاہم کیپٹن نوید کے خیمے میں پہنچنے تک اس نے خاموشی سادھ لی تھی۔

''ڈاکٹر سائب! مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔پلیز اسے دیکھو مجھے اس کی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی۔''

آہٹ پاکر کیپٹن نوید اس کی طرف مڑا...... خیمے کے ماحول نے سائب کو مزید پریشان کر دیا تھا تین چار فوجی جانوں کے گھیرے میں موجود ہتھکڑی لگے دو افراد جن کی حالت ظاہر کر رہی تھی کہ ان ٹھیک ٹھاک تواضع ہوئی ہے سب سے بڑھ کر بستر پر موجود لڑکی کا وجود۔وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور انگلیوں سے اس کی نبض ٹٹولنے لگا۔

''اسے بڑی مقدار میں نشہ آور دوا دی گئی تھی اور شاید اس نے کئی وقت سے کھانا بھی نہیں کھایا۔نبض کی رفتار بہت دھیمی ہے۔''

وہ اسے ٹریٹمنٹ دینے لگا۔

''یہ اس حالت میں آپ کو کہاں سے ملی؟''

دواؤں کے اسٹاک میں سے گلوکوز کی بوتل لانے کے لیے اس نے ایک آدمی کو بھیجا اور کیپٹن نوید سے پوچھنے لگا جواباً انہوں نے اپنی گاڑی خراب ہونے سے لے کر سعدیہ کو بازیافت کرنے تک کے تمام حالات سنا ڈالے۔

''ان لوگوں سے تفتیش کرنے پر معلوم ہوا ہے کہ سعدیہ کے باپ نے خود اس کا سودا ان لوگوں کے ہاتھ کیا ہے۔یہ لوگ صبح سویرے اسے یہاں سے لے کر نکلتے لیکن شام کوئی شخص سعدیہ کو پوچھنے اس کے گھر تک آیا تو اس کے باپ کو خطرہ ہوا کہ کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے اور اس نے ان لوگوں کو مغرب کے بعد ہی علاقے سے نکل جانے کی تجویز دی اگر ہم لوگ اتفاقاً انہیں نہ مل جاتے تو یہ سعدیہ کو یہاں سے لے کر نکل جانے میں کامیاب ہو جاتے۔''

کیپٹن نوید کے بتانے پر سائب خان کو ارباز خان کا شام کا انداز یاد آیا۔یقیناً

وہ سائب خان کی اپنے گھر آمد کی وجہ سے گھبرا گیا تھا۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہاری تشویش کو سیریس نہیں لیا ورنہ معاملہ اس حد تک نہیں پہنچتا۔“

”اِٹس او کے کیپٹن! آپ سعدیہ کے نجی حالات سے بے خبر تھے اس لحاظ سے آپ کا رویہ اپنی جگہ ٹھیک تھا۔“

وہ سعدیہ کے ہاتھ میں ڈرپ لگانے لگا۔

”جا...... جہاں...... زیب“

سوئی کی چبھن نے شاید اس کے معطل حواس میں تحریک پیدا کی تھی اور چند ٹوٹے ہوئے لفظ اس کے ہونٹوں سے نکلے تھے۔

”کیپٹن نوید! اپنے لوگوں کو تیار کریں ہمیں ایک بہت اہم کام سے جانا ہوگا۔“

وہ فوراً ہی ان الفاظ سے ایک نتیجہ اخذ کر چکا تھا۔

☆☆☆